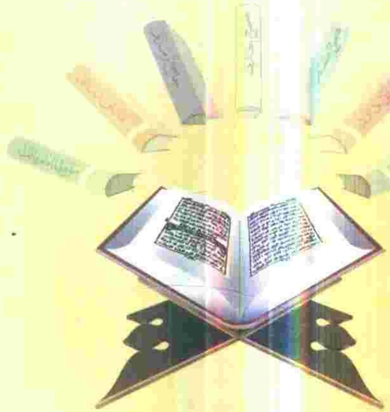
قل هذه سبيلي ادعوا الى الله
على بصيرة انا ومن اتبعني



مقالات

ارشاد الحق اثری

ادارة العلوم الاثریہ
منٹگمری بازار۔ فیصل آباد
فون: 041-2642724

قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني

مقالات

ارشاد الحق اثری

ادارۃ العلوم الاثریہ
منٹگمری بازار فیصل آباد
فون 041-2642724

بسم اللہ الرحمن الرحیم

2۹۰۰۹

اسریم

نام کتاب: مقالات

مؤلف: ارشاد الحق اثری

ناشر: ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد فون: 041-2642724

تعداد: 1000

تاریخ طباعت: دسمبر 2015ء

مطبع: انٹرنیشنل دار السلام پرنٹنگ پریس، لاہور
فون: 042-7232400

ملنے کا پتہ

(1) ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد

(2) مکتبہ اسلامیہ (A) غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
(B) کوتوالی روڈ فیصل آباد فون: 041-2631204

فہرس

2

کیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل دوزخی ہے؟

3

کتاب الآثار کیا پہلی صحیح کتاب ہے؟

4

مسند الإمام أبي حنيفة للحارثي

5

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا فتنہ اور اس کا رد

6

المصنف لابن ابی شیبہ میں تحریف شیخ محمد عوامہ کی جسارت

7

المصنف لعبدالرزاق کے الجزء المفقود کی ''دست یابی''

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

8

سانحۂ کربلا میں افراط وتفریط کا جائزہ

(بعض تسامحات کا تذکرہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

آج ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق ومہربانی سے مقالات کی تیسری جلد قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ والحمد لله على ذلك، حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه.

یہ جلد مختلف اوقات میں لکھے گئے ۸ مقالات پر مشتمل ہے۔ جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور اور دیگر مجلات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان پر از سر نو نظر ثانی کے ساتھ ساتھ مکانی حد تک حوالوں کی مراجعت بھی کر لی گئی ہے۔ پھر بھی اگر کہیں کوئی غلطی محسوس ہو تو قارئینِ کرام سے التماس ہے کہ اس کی اطلاع دیں تاکہ آئندہ اس کی تصحیح ہو سکے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں ادارہ کے تمام رفقاء بالخصوص محترم مولانا عبدالحی انصاری اور مولانا حافظ محمد خبیب احمد صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کے پروف پڑھنے کی ذمہ داری کو خوب نبھایا۔ اسی طرح محترم خالد شاہ محمد علوی حفظہ اللہ مدیر علوی ٹرسٹ جوہر آباد کا انتہائی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کی طباعت میں تعاون کیا جزاھم اللہ احسن الجزاء، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے التماس ہے کہ ادارہ کی تمام دینی وعلمی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور ادارہ کے دامے درمے قدمے سخنے، تمام معاونین ورفقاء اور موسسین کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

خادم العلم والعلماء

ارشاد الحق اثری

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۶ھ/ ۱۹ نومبر ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

کے بارے میں

تمنا عمادی کی تلبیسات

برصغیر پاک وہند میں انکارِ حدیث کو جن حضرات نے پروان چڑھایا اور کچھ گھسے پٹے دلائل سے اس کی آب یاری کی ان میں ایک معروف نام علامہ تمنا عمادی کا ہے جو بلاشبہ تاریخ وادب کے ماسٹر تھے۔ مگر «أضله الله علی علم» کے مصداق تھے۔ امام زہری رحمہ اللہ، امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ، صحیح بخاری، تفسیر طبری اور تاریخ طبری پر ان کے اعتراضات معروف ہیں۔ مگر علمائے حق نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی دسیسہ کاریوں کو تشت از بام کر دیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ المتوفی ۳۱۰ھ پر شیعیت کا الزام حتی کہ انھیں کذاب اور وضاع ثابت کرنے میں انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ عرصہ ہوا امام ابن جریر رحمہ اللہ پر شیعیت وغیرہ کے الزامات کا تفصیلی جواب شہید اسلام مولانا عبدالخالق قدوسی نور اللہ مرقدہٗ نے دیا، جو مسلک اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا۔ شائقین حضرات جولائی، اگست، اکتوبر اور نومبر ۱۹۶۷ء کے شماروں میں یہ مضمون ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس حوالے سے اور بہت سی باتیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور ان کے تفصیلی تراجم پر مشتمل کتابیں بھی شائع ہوگئی ہیں۔ حتی کہ ''صریح السنۃ'' کے نام سے ان کے عقیدے کی وضاحت خود ان کے قلم سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ مگر اس حوالے

سے تقریباً تمام بنیادی باتیں مولانا قدوسی رحمہ اللہ نے کہہ دی ہیں۔ مزید کچھ عرض کرنے کی ہم ضرورت اس لیے بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے حضرت قدوسی مرحوم نے جب یہ مضامین لکھے تب تمنا عمادی ہوں یا محمود عباسی وغیرہ، بقید حیات تھے۔ انھوں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ہماری معلومات کے مطابق نہ ہی آج تک انکارِ حدیث کے سرغنے ان کا کوئی معقول جواب لکھ پائے۔ اگر اس حوالے سے وہ کچھ لکھتے تو ہمارے لیے اس بارے میں مزید کچھ کہنے کی تقریب بن جاتی۔ إذ لیس فلیس

امام ابن جریر رحمہ اللہ پر یہی اعتراضات اور مزید امام زہری رحمہ اللہ پر تمنا عمادی کے الزامات کو کراچی کے ایک ادارہ نے ''امام زہری و امام طبری، تصویر کا دوسرا رخ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جس میں ایک مقام پر امام ابن جریر رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اتنا تو میں پہلے سے جانتا تھا کہ، ابن جریر شیعہ تھے اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے ہم عصر اور قریب العصر سارے محدثین ابن جریر کو شیعہ اور جھوٹی حدیثیں اور جھوٹی روایتیں گھڑنے والا سمجھتے تھے۔''[1]

تمنا عمادی کا یہ دعویٰ بڑا ہی عجیب ہے کہ ''ان کے ہم عصر اور قریب العصر سارے محدثین انھیں شیعہ اور جھوٹی روایتیں گھڑنے والا قرار دیتے تھے۔'' یہ بات اگر درست ہے، تو بھی محدثین کو ہی انھیں کذاب، وضاع اور ضعیف قرار دینا چاہیے۔ مگر امر واقع اس کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابن جریر کے شاگردوں میں ایک نام امام ابو احمد ابن عدی کا ہے۔[2]

امام ابن عدی جو ۳۶۵ھ میں فوت ہوئے۔ ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' ان کی معروف کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے ہر اس راوی کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے جس پر کسی بھی نوعیت کا کلام ہوا ہے۔ اگرچہ وہ کلام مقبول ہو یا نہ ہو۔ جیسا کہ خود انھوں نے الکامل کے مقدمہ[3] میں ذکر کیا ہے قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے بارے میں دعویٰ تو

---

[1] امام زہری و امام طبری: 351 [2] السیر: 269/14 [3] مقدمہ: 15

یہ ہو کہ "ان کے ہم عصر سارے محدثین" نے انھیں وضاع قرار دیا ہے۔ جب کہ ان کے تلمیذ امام ابن عدی رحمہ اللہ الکامل میں ان کا ذکر تک نہیں کرتے تو بتلائیے یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے؟

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے ایک اور معاصر "کتاب الضعفاء الکبیر" کے مصنف امام ابوجعفر العقیلی المتوفی ۳۲۲ھ بھی ہیں، جرح میں ان کا تشدد بھی علمائے کرام کے نزدیک معروف ہے۔ حتی کہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ کو انھوں نے الضعفاء [1] میں ذکر کر دیا ہے۔ مگر باعثِ تعجب ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ جو ان کے "ہم عصر سارے محدثین" کے نزدیک کذاب اور وضاع تھے کو نظر انداز کر دیا۔ آخر کیوں؟ تمنائی تحقیق شاید اسے بھی امام عقیلی رحمہ اللہ کی کذب وضع میں امام ابن جریر رحمہ اللہ کی ہمنوائی قرار دے۔

اسی طرح امام ابن جریر رحمہ اللہ کے معاصر اور معروف محدث امام محمد رحمہ اللہ بن حبان البستی المتوفی ۳۵۴ھ ہیں۔ ان کی کتاب «المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین» بھی معروف ہے۔ اور ان کا شمار بھی ان ائمہ جرح وتعدیل میں ہوتا ہے جو جرح میں متشدد ہیں۔ مگر وہ بھی امام ابن جریر رحمہ اللہ کو اس کتاب میں ذکر نہیں کرتے، آخر کیوں؟

امام احمد بن شعیب النسائی رحمہ اللہ المتوفی ۳۰۳ھ بھی ان کے معاصر ہیں اور کتاب الضعفاء والمتروکین ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں بھی انھوں نے امام ابن جریر رحمہ اللہ کو ذکر نہیں کیا۔ ان کے "قریب العصر" محدثین میں امام دارقطنی رحمہ اللہ المتوفی ۳۸۵ھ، امام ابواحمد الحاکم رحمہ اللہ المتوفی ۳۷۸ھ، امام ابن شاہین رحمہ اللہ المتوفی ۳۸۵ھ وغیرہ نے بھی الضعفاء پر لکھی ہوئی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ اب بتلائیے کہ یہ تمنائی دعویٰ کس حد تک درست اور مبنی بر حقیقت ہے؟

بلاشبہ "الضعفاء" پر لکھنے والے حضرات میں سے کسی کی کتاب کو کامل اور ضعیف راویوں

[1] الضعفاء: 735/3

کے استیعاب پر مشتمل نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن ان تمام معاصرین میں سے جب کسی ایک نے بھی امام طبری رحمہ اللہ کو ضعیف قرار نہیں دیا تو یہ ایک بین دلیل ہے کہ ان کے معاصرین کے نزدیک وہ ضعیف نہیں ہیں۔

اس کے برعکس امام ابن جریر رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ابو محمد عبداللہ بن احمد الفرغانی المتوفی ۳۶۲ھ، جنھوں نے اپنے شیخ کی تاریخ پر ذیل لکھا، فرماتے ہیں:

كان محمد بن جرير ممن لا تأخذه في الله لومة لائم، مع عظيم ما يلحقه من الأذى والشناعات من جاهل وحاسد وملحد، فأما أهل الدين والعلم فغير منكرين علمه وزهده في الدنيا ورفضه لها. الخ [1]

"کسی جاہل، حاسد اور ملحد کی طرف سے محمد بن جریر رحمہ اللہ کو جو بھی تکلیف و کراہت پہنچی اس کے باوجود وہ اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ رہے اہلِ دین وعلم تو ان میں سے کسی نے بھی ان کے علم وزہد کا انکار نہیں کیا۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے ایک اور معاصر امام ابن یونس مصری المتوفی ۳۴۷ھ بھی ان کی توصیف میں فرماتے ہیں:

محمد بن جرير من أهل آمل، كتب بمصر ورجع إلى بغداد وصنف تصانيف حسنة تدل على سعة علمه. [2]

"محمد بن جریر آمل کے رہنے والے تھے۔ مصر میں احادیث لکھیں اور بغداد چلے گئے، اور ایسی بہترین کتابیں لکھیں جو ان کی وسعت علمی پر دلالت کرتی ہیں۔"

اگر انھوں نے اپنی کتابوں میں جھوٹی روایات گھڑی ہیں تو ان کی یہ توصیف وتحسین کیوں؟

---

[1] السیر: 274/14، الطبقات الشافعیہ: 125/3 وغیرہ [2] السیر: 269/14 وغیرہ

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ جو ان کے معاصر، بلکہ طلب علم میں ہم سفر تھے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ ابو حازم عمر بن احمد العبدوی، جسے خود انھوں نے ثقہ قرار دیا ہے، (1) سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام حسین بن علی التمیمی، جو حسینک کے لقب سے معروف ہیں اور حفاظِ حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے، سے سنا کہ جب میں بغداد سے نیشاپور گیا تو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے مجھ سے پوچھا: بغداد میں تم نے کن حضرات سے سماع کیا ہے؟ تو میں نے ایک جماعت کا نام لیا کہ فلاں فلاں سے میں نے سماع کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: ابن جریر رحمہ اللہ سے بھی کچھ سماع کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا نہیں کیونکہ حنابلہ ان کی ملاقات سے روکتے تھے اس وجہ سے میں نے ان سے سماع نہیں کیا۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر تم ابن جریر رحمہ اللہ سے سماع کرتے تو ان کے علاوہ جن سے سماع کیا ہے ان سے یہ تمھارے لیے بہتر ہوتا۔ (2) اور امام حاکم رحمہ اللہ نے امام حسین بن علی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے فرمایا: کاش تم ابن جریر رحمہ اللہ سے سماع کرتے اور ان کے علاوہ جن سے سماع کیا ہے ان میں سے کسی کی روایات نہ لکھتے۔ (3)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنے استاد امام ابو بکر محمد رحمہ اللہ بن احمد بن بالویہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے فرمایا: پتا چلا ہے کہ تم نے محمد بن جریر رحمہ اللہ کی تفسیر نقل کی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! انھوں نے فرمایا مکمل تفسیر نقل کی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! انھوں نے پھر دریافت کیا کس سال میں نقل کی؟ میں نے کہا: ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ کے مابین نقل کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تفسیر ابن جریر مجھ سے مستعار لی، کچھ سال بعد واپس لوٹا دی اور فرمایا میں نے اسے از اول تا آخر دیکھا ہے۔ زمین پر میں نے ابن جریر رحمہ اللہ سے بڑا عالم کسی کو نہیں دیکھا حنابلہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔ (4)

تو یہ ہیں تاثرات امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے، ابن جریر کے متعلق جو ان کے معاصر ہیں

---

(1) بغدادی: 272/11 (2) بغدادی: 164/2 (3) السیر: 272/14 وغیرہ (4) بغدادی: 164/2، السیر: 273/14، 419/15

اور طلبِ علم میں ان کے ہم رکاب بھی رہے ہیں اور یہ ہے تفسیر ابن جریر کے بارے میں ان کی رائے، جس پر تمنا عمادی حرف زنی کرتے ہیں۔ ان کے معاصرین کی مزید آرا معجم الادباء میں ملاحظہ فرمائیں۔

تمنا عمادی کا دھوکا

یادش بخیر امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کا یہی قول تمنا عمادی نے بھی نقل کیا اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ سے اسے نقل کرنے والا راوی ابن خالویہ حسین بن احمد قرار دیا ہے، اور پھر لسان[1] سے ابن خالویہ کو شیعہ امامیہ قرار دے کر اسے مردود قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیل "امام زہری و امام طبری"[2] مضمون لکھ کر انھوں نے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ حالانکہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ سے اس قول کے ناقل ابن خالویہ قطعاً نہیں ہم اوپر تاریخ بغداد اور السیر کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں کہ وہ ابو بکر محمد بن احمد بالویہ ہیں، بلکہ السیر[3] میں انھی کے ترجمہ میں بھی حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہ قول ذکر کیا ہے۔ یہی قول انھوں نے تاریخ اسلام[4] میں، علامہ السبکی نے طبقات الشافعیہ[5] میں، یاقوت الحموی نے معجم الادباء[6] میں بھی ابو بکر بن بالویہ ہی سے نقل کیا ہے۔ تسلیم کیا کہ تمنا صاحب کے پاس السیر اور تاریخ اسلام نہ تھی، مگر جب معجم الادباء اور تاریخ بغداد ان کے پیشِ نظر تھی تو ان کی بجائے لسان المیزان[7] پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ابن خالویہ قرار دینا سراسر دھوکا اور اپنا الو سیدھا کرنے کا بہانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اس ضمنی وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کا یہ قول صحیح سند سے منقول ہے جس سے امام ابن جریر رحمہ اللہ اور ان کی تفسیر کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

① لسان: 267/2 ② امام زہری و امام طبری: 349,330,450 ③ السیر: 419/15 ④ تاریخ الإسلام: 282/21 ⑤ طبقات الشافعیہ: 124/3 ⑥ معجم الأدباء: 42/18 ⑦ لسان المیزان: 102/5

یہ ہیں وہ تاثرات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ کے معاصرین اور قریب العصر حضرات نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس تمنائی دعویٰ یہ ہے کہ ''ان کے ہم عصر اور قریب العصر سارے محدثین انھیں شیعہ اور جھوٹی روایتیں گھڑنے والا سمجھتے ہیں۔'' معاصرین کے ان تاثرات کے علاوہ خطیب بغدادی، امام ابن عساکر، علامہ ابن جوزی، حافظ ذہبی، علامہ السبکی، حافظ ابن کثیر، ابن خلکان، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی رحمہم اللہ وغیرہ نے جو توصیف وتحسین بیان کی ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ یہ مختصر مضمون اس تفصیل کا متحمل نہیں۔

تمنا صاحب نے اپنے دعویٰ پر امام احمد بن علی السلیمانی رحمہ اللہ المتوفی ۴۱۳ھ کا ایک قول ذکر کیا ہے، جسے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان [1] میں ذکر کیا کہ انھوں نے فرمایا: «کان یضع للروافض» کہ ابن جریر رحمہ اللہ رافضیوں کی موافقت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔

اولاً گزارش ہے کہ حافظ سلیمانی کی یہ رائے کس سند سے منقول ہے؟ اور اس کے راوی کیسے ہیں؟ جبکہ بقول تمنا صاحب حافظ سلیمانی ''ابن جریر رحمہ اللہ کی وفات سے صرف گیارہ برس بعد پیدا ہوئے۔'' جن کی وفات انھوں نے ۴۱۳ھ اور پیدائش ۳۲۱ھ لکھی ہے۔ [2]

حالانکہ یہ تاریخیں بھی غلط ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ وہ ۳۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ [3] سنین کی یہ غلطی کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

ثانیاً حافظ سلیمانی رحمہ اللہ بلا شبہ بڑے محدث تھے۔ مگر ان کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

رأیت للسلیمانی کتابا فیه حط علی کبار فلا یسمع منه ماشذ فیه. [4]

---

[1] میزان: 499/3 [2] امام زہری وابن جریر: 352,353 [3] السیر: 200/18، الأنساب للسمعاني: 287/3 وغیرہ [4] السیر: 202/17

"میں نے ان کی کتاب دیکھی ہے جس میں کبار علماء پر تنقید ہے۔ان کی ایسی تنقید جس میں وہ اکیلے ہوں اس قابل نہیں کہ اسے سنا جائے۔"

غالباً ان کی یہ کتاب اسماء الرجال ہی کے موضوع پر ہے۔ جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ[1] میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی سے انھوں نے میزان میں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ان کا قول نقل کیا ہو۔ اس کتاب میں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ پر ہی ایسی غیر مناسب جرح نہیں، بلکہ دیگر کبار محدثین کے بارے میں بھی ہے جو مقبول نہیں۔

چنانچہ ابوالقاسم عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز البغوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حافظ السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: «متهم بسرقة الحديث» حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وہ مطلقاً ثقہ ہیں۔ السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قابلِ اعتبار نہیں۔[2] زبیر بن بکار ثقہ ہیں، مگر حافظ السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے «منكر الحديث» حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ جرح مردود ہے۔[3] امام الفضل بن حباب کے بارے میں السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کہ وہ رافضی تھے، حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی یہاں بھی تردید کی ہے۔[4] عمار بن رزیق کے بارے میں بھی السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہہ دیا: کہ وہ رافضی تھے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھی ان کی تردید کی ہے۔[5] اس لیے تنہا حافظ السلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی جرح مردود ہے اور قابلِ قبول نہیں۔

ثالثاً: حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی میزان میں حافظ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی سخت تردید کی ہے اور اسے «رجم بالظن الكاذب» جھوٹے گمان سے اٹکل پچو لگانا قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے کبار اور قابلِ اعتماد ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔

رابعاً: حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حافظ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تردید کی اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید میں مزید یہ بھی فرمایا ہے: اگر میں اس بات پر حلف اٹھاؤں کہ حافظ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مصداق امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نہیں، بلکہ اس کے بعد دوسرا راوی محمد بن

---

[1] تذکرۃ الحفاظ: 1036/3 [2] میزان: 493/2، لسان: 339/3 [3] تھذیب: 313/3، تقریب: 106 [4] میزان: 350/3 [5] میزان: 164/3، نیز دیکھیے 318/3 ترجمہ عیسی بن عبید

جریر بن رستم ہے تو میں حانث نہیں ہوں گا۔

خامساً حافظ السلیمانی رحمہ اللہ کے اس قول کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے تلامذہ مثلاً امام ابن عدی رحمہ اللہ اور امام الفرغانی اور ان کے معاصرین جیسے امام ابن خزیمہ، امام نسائی، امام عقیلی اور امام ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ جو حافظ سلیمانی رحمہ اللہ سے بہر نوع اقدم اور افضل ہیں اس قسم کا کوئی تأثر امام ابن جریر رحمہ اللہ کے بارے میں نہیں دیتے، بلکہ وہ ان کی توصیف وتحسین فرماتے ہیں، جیسا کہ ابھی باحوالہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان تصریحات کے مقابلے میں تنہا حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کے قول، جس کی حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تردید کی ہے، کی بنا پر امام ابن جریر رحمہ اللہ کے تمام معاصرین کی یہی رائے قرار دینا تمنائی دیانت وامانت کا کمال ہے۔

تمنا صاحب اپنے اس دعویٰ کو سچا ثابت کرنے کے لیے کسی اور محدث کا قول تو نقل نہ کر سکے البتہ یہ بات حسب عادت بڑے ادعائی انداز میں کہی: ''امام سلیمانی رحمہ اللہ نے جو ابن جریر رحمہ اللہ پر شیعوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام عائد کیا اس کی شہادت ان کی ہر تصنیف دے رہی ہے، تفسیر کو دیکھیے سورۂ احزاب کی ① تفسیر امام سلیمانی رحمہ اللہ کی تصدیق کر رہی ہے۔ اور سورۂ مائدہ کی ② تفسیر کو دیکھیے تو ابن جریر کی دروغ بافیوں کی شہادت دے رہی ہے۔'' ③

ان آیات میں امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کون سی ''احادیث گھڑی'' ہیں اور کیا ''دروغ بافی'' کی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل اگر وہ بیان کرتے تو ہم بھی اپنی معروضات عرض کرتے۔ اجمالاً اتنی بات عرض ہے کہ ان میں تقریباً کوئی روایت ایسی نہیں جس میں ابن جریر منفرد ہوں اور دوسرے محدثین نے اسے ذکر نہ کیا ہو۔ تمنا صاحب آخر کس کس پر دروغ بافی کا الزام دھریں گے۔ دراصل خزاں کے اندھے کو ہر چیز ویراں نظر آتی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

اپنے اسی خود ساختہ دعویٰ پر انھوں نے یہ فرمایا کہ: ''میرا اصل دعویٰ یہ ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ

① الاحزاب: 33 ② المائدہ: 55 ③ امام زھری وامام طبری: 354

بعض ایسے لوگوں سے بھی روایت کرتے ہیں جو ان کی ولادت سے پہلے وفات پا چکے ہیں یا جب وہ شیر خوار تھے یا تین چار برس کے تھے۔'' اس دعویٰ کے ثبوت میں انھوں نے تفسیر اور تاریخ ابن جریر سے اکیس راویوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کی وضاحت ہم قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) سعید بن ربیع

چنانچہ اس حوالے سے پہلا راوی تمنا صاحب نے سعید بن ربیع ذکر کیا ہے۔ جس سے تفسیر میں امام ابن جریر روایت کرتے ہیں اور فرمایا گیا ہے کہ سعید بن ربیع ایک ہی راوی ہے جس کا سنِ وفات ۲۱۱ھ ہے اور ولادت ابن جریر رحمہ اللہ سے تیرہ برس پہلے۔ نیز انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس سعید بن ربیع کو رازی کہنا درست نہیں کیونکہ سعید بن الربیع الرازی کوئی شخص تھا ہی نہیں اور نہ سعید بن الربیع المرادی کوئی راوی تھا۔ [1]

یہی بات انھوں نے اس سے قبل [2] بھی کہی ہے اور کہا ہے کہ یہ سعید بن الربیع الحرشی العامری البصری ہے، مگر یہ بھی محض تمنائی دعویٰ ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ امام ابن جریر کی ولادت سے تیرہ برس پہلے سعید فوت ہوئے تھے یہ دیکھئے کہ امام ابن جریر نے جس سعید ابن الربیع سے روایت لی ہے وہ قطعاً سعید بن ربیع الحرشی العامری نہیں جس کی وفات ۲۱۱ھ میں ہوئی۔ کیونکہ امام ابن جریر جس سعید بن ربیع سے براہِ راست روایت کرتے ہیں وہ سعید، سفیان بن عیینہ کے شاگرد ہیں اور امام ابن جریر اس سے روایت کرتے ہوئے کبھی صرف سعید بن ربیع کہتے ہیں [3] اور کبھی سعید بن الربیع الرازی کہتے ہیں [4] اور کبھی سعید بن الربیع المرادی کہتے ہیں۔ [5] لیکن یہ الرازی سے تصحیف ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر [6] میں یہی اثر امام ابن جریر رحمہ اللہ کی سند سے ذکر کیا ہے اور اس میں سعید بن الربیع الرازی ہی ہے۔

---

[1] امام زہری وامام ابن جریر: 393 [2] امام زہری وامام ابن جریر: 315 [3] تفسیر: 28/1، 57/4، 178/4، 423/5، 64,65/7، طبعۂ ثانیہ: 1954، مطبعہ مصطفی البابی مصر [4] تفسیر: 285/4، 16/3، 90/6، 222/6 [5] تفسیر: 545/2 [6] تفسیر: 310/1

شیخ احمد شاکر کی تحقیق سے جو حصہ تفسیر کا طبع ہوا ہے اس میں بھی اسی سند میں سعید بن الربیع الرازی ہے۔[1] اس لیے تفسیر ابن جریر[2] میں جو المرادی ہے وہ غلط اور تصحیف ہے، صحیح الرازی ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ آخر تمنا عمادی صاحب کو یہ بھنک کہاں سے پڑی کہ "یہ سعید بن الربیع دوسرے نہیں یہ رازی ہیں" جس کی انھیں تردید کرنی پڑی کہ "سعید بن الربیع الرازی کوئی شخص تھا ہی نہیں۔" جب کسی کتاب میں "سعید بن ربیع الرازی" کا ذکر ہی نہیں تو وہ پہلے اس کا وجود کس بنیاد پر ثابت کرتے ہیں؟ اور پھر اس کی تردید کیسے کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا ثبوت یہی تفسیر ابن جریر میں مختلف مقامات پر اس نسبت کی صراحت ہے کہ یہ سعید ابن الربیع الرازی ہیں اس کے علاوہ کوئی اور ثبوت نہیں۔ اور اسی تفسیر میں ان تمام مقامات میں ہے وہ سفیان سے روایت کرتے ہیں۔ اور سفیان سے مراد سفیان بن عیینہ ہیں جیسا کہ تفسیر[3] میں ہے۔ تمنا صاحب کا کہنا کہ یہ سعید بن الربیع الحرشی العامری الہروی ابوزید ہیں جو امام بخاری کے استاد ہیں، بالکل غلط ہے کیونکہ وہ تو سفیان بن عیینہ سے قطعاً روایت نہیں کرتے ان کے ترجمہ میں علامہ المزی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے سفیان بن عیینہ کو ان کے شیوخ میں ذکر ہی نہیں کیا۔[4]

لہٰذا جب سعید بن الربیع الہروی، سفیان بن عیینہ سے راوی ہی نہیں تو ابن جریر رحمہ اللہ کے مشائخ میں سعید بن الربیع الرازی کو سعید بن الربیع ابوزید الہروی قرار دینا پرلے درجے کی جہالت اور بے خبری ہے۔ یہی نہیں، بلکہ سعید بن الربیع الہروی سے امام ابن جریر بواسطہ محمد ابن المثنی روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المائدہ[5] کی تفسیر[6] میں فرماتے ہیں:

حدثنا بن المثنى قال ثنا سعيد بن الربيع قال ثنا شعبة.الخ

---

[1] 150/5 بتحقیق الشیخ شاکر [2] تفسیر ابن جریر: 545/2 [3] تفسیر: 28/1

[4] التهذيب للمزی: 188/7، التهذيب للحافظ: 27/4 السير وغيره

[5] المائده: 4 [6] تفسیر: 95/2

ترجمہ میں امام ابن جریر کا نام ان کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تمنا صاحب السیر وغیرہ سے مطلع نہیں ہو سکے کہ یہ کتابیں ان کی وفات کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔ مگر کیا تقریب التہذیب سے بھی وہ بے خبر تھے۔ جس میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ «عمران من الحادية عشرة ومات سنة إحدى وسبعين» گیارہویں طبقہ سے ہیں جو ۲۷۱ھ میں فوت ہوئے۔ اب تقریب کا مقدمہ دیکھیے جس میں انھوں نے وضاحت فرمائی کہ تقریب میں طبقات کی تقسیم کے اعتبار سے جو رواۃ طبقہ ۹ سے آخر تک ہوں ان کی وفات دوسو کے بعد ہوگی ان کے الفاظ ہیں:

وإن كان من التاسعة إلى آخر الطبقات فهم بعد المائتين.[1]

تقریب التہذیب میں اتنی صراحت کے باوجود افسوس کہ تمنا صاحب نے صرف تہذیب پر اکتفا کیا۔ غالباً یہ ان کی مجبوری ہے کہ اس کے بغیر وہ امام ابن جریر رحمہ اللہ پر الزام نہیں دھر سکتے تھے۔ اس وضاحت سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ عمران بن بکار کے حوالے سے تمنائی الزام بھی سراسر دھوکا اور بے بنیاد ہے۔

(۳) امام موسیٰ بن ہارون

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تفسیر اور تاریخ میں موسیٰ بن ہارون سے کئی مقامات پر روایت لی ہے۔[2] بعض مقامات پر صراحت کی ہے کہ «حدثني موسى بن هارون الهمداني» اسی طرح تاریخ میں بھی ہے۔[3]

تمنا صاحب اسی موسیٰ بن ہارون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن ہارون دو ہیں: ایک موسیٰ بن ہارون بن عبداللہ الحمال متوفی ۲۹۴ھ، ابن جریر ان سے روایت کر سکتے ہیں، مگر عمرو بن حماد متوفی ۲۲۲ھ سے روایت نہیں کر سکتے۔ دوسرے موسیٰ بن ہارون البردی

---

[1] مقدمة التقريب: 4 [2] تفسير: 1/68,75,80,83,101,102,147,154، 2/83,312

[3] تاریخ: 1/20,41,43,50,53,225,242 وغیرہ

ترجمہ میں امام ابن جریر کا نام ان کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تمنا صاحب السیر وغیرہ سے مطلع نہیں ہو سکے کہ یہ کتابیں ان کی وفات کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔ مگر کیا تقریب التہذیب سے بھی وہ بے خبر تھے۔ جس میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ «عمران من الحادية عشرة ومات سنة إحدى وسبعين» گیارہویں طبقہ سے ہیں جو ۲۷۱ھ میں فوت ہوئے۔ اب تقریب کا مقدمہ دیکھیے جس میں انھوں نے وضاحت فرمائی کہ تقریب میں طبقات کی تقسیم کے اعتبار سے جو رواۃ طبقہ ۹ سے آخر تک ہوں ان کی وفات دوسو کے بعد ہوگی ان کے الفاظ ہیں:

وإن كان من التاسعة إلى آخر الطبقات فهم بعد المائتين.[1]

تقریب التہذیب میں اتنی صراحت کے باوجود افسوس کہ تمنا صاحب نے صرف تہذیب پر اکتفا کیا۔ غالباً یہ ان کی مجبوری ہے کہ اس کے بغیر وہ امام ابن جریر رحمہ اللہ پر الزام نہیں دھر سکتے تھے۔ اس وضاحت سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ عمران بن بکار کے حوالے سے تمنائی الزام بھی سراسر دھوکا اور بے بنیاد ہے۔

(۳) امام موسیٰ بن ہارون

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تفسیر اور تاریخ میں موسیٰ بن ہارون سے کئی مقامات پر روایت لی ہے۔[2] بعض مقامات پر صراحت کی ہے کہ «حدثني موسى بن هارون الهمداني» اسی طرح تاریخ میں بھی ہے۔[3]

تمنا صاحب اسی موسیٰ بن ہارون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن ہارون دو ہیں: ایک موسیٰ بن ہارون بن عبداللہ الحمال متوفی ۲۹۴ھ، ابن جریر ان سے روایت کر سکتے ہیں، مگر عمرو بن حماد متوفی ۲۲۲ھ سے روایت نہیں کر سکتے۔ دوسرے موسیٰ بن ہارون البردی

---

① مقدمۃ التقریب: 4 ② تفسیر: 1/68,75,80,83,101,102,147,154، 2/83,312

③ تاریخ: 1/20,41,43,50,53,225,242 وغیرہ

متوفی ۲۲۴ھ، یہ عمرو بن حماد البردی متوفی ۲۲۲ھ سے روایت کر سکتے ہیں، مگر ان کی وفات اسی سال ہے جس سال ابن جریر رحمہ اللہ پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ابن جریر رحمہ اللہ کا ان سے روایت کرنا ناممکن ہے۔①

ہم حیران ہیں کہ تمنا صاحب امام ابن جریر رحمہ اللہ کی تصریح سے بے نیاز ہو کر اپنے ظن باطل میں موسیٰ بن ہارون الهمدانی کو موسیٰ بن ہارون الحمال قرار دیتے ہیں یا موسیٰ بن ہارون البردی، اور کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ یہ دو ہی موسیٰ بن ہارون کیوں ہیں؟ ایک الحمال کی نسبت سے اور دوسرا البردی کی نسبت سے اور تیسرا کوئی اور کیوں نہیں۔ جب امام ابن جریر رحمہ اللہ نے خود اسے الهمدانی قرار دیا تو یہ الحمال اور البردی کیسے قرار پایا؟

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی الکبیر کی تفسیر اسی «موسىٰ بن هارون الهمداني حدثنا عمرو بن حماد القناد حدثنا أسباط بن نصر الهمداني عن إسماعيل السدي» کی سند سے جا بجا نقل کی ہے۔ کہیں وہ الهمدانی کی صراحت کرتے ہیں اور کہیں صرف موسیٰ بن ہارون فرماتے ہیں۔ اتنی معروف اور صاف بات کے باوجود اپنی مرضی سے اسے موسیٰ بن ہارون الحمال یا البردی قرار دیتے ہیں اور اسے اپنی تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عمرو بن حماد کے تلامذہ میں موسیٰ بن ہارون الطوسی کا بھی نام ہے۔② جو ۲۷۱ھ میں فوت ہوئے۔③ اور وہ ہیں بھی ثقہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ ان سے روایت کر سکتے ہیں۔ مگر تمنا صاحب نے انھیں اپنے مقصد کے لیے موسیٰ بن ہارون الحمال یا البردی بنا دیا۔ حالانکہ یہ نہ الحمال ہیں نہ ہی البردی اور نہ ہی الطوسی، بلکہ یہ تو الهمدانی ہیں جیسا کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ ہمارا قلم بھی اگر تمنا صاحب کا بے رحم قلم ہوتا تو لکھتے کہ یہ الطوسی الهمدانی ہے۔ لیکن بلا دلیل ایسا دعویٰ تمنا صاحب تو اپنی دھونس دھاندلی سے کر سکتے ہیں ہم اپنے اندر یہ جرأت نہیں پاتے۔

علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے تو لکھا ہے کہ موسیٰ بن ہارون الهمدانی کا ترجمہ مجھے نہیں

---

① امام زهری وامام طبری: 394 ② التهذيب للمزی: 203/14 ③ تاريخ بغداد: 48,49/13

ملا[1] لیکن یہ موسیٰ بن ہارون بن اسحاق الھمدانی ہیں اور دارقطنی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سوالات الحاکم للدارقطنی[2] میں ہے اور وہ اپنے باپ ہارون بن اسحاق سے بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ علامہ المزی نے تہذیب[3] میں ذکر کیا ہے۔ اس لیے تمنا صاحب کا اسے اپنے مفروضے کے مطابق الحمال یا البردی قرار دینا بہر نوع غلط اور رجماً بالغیب ہے۔

(۴) زکریا بن ابی زائدہ

تمنا صاحب نے تفسیر[4] اور تاریخ طبری[5] سے ایک سند ذکر کی ہے:

حدثنا زكريا بن أبي زائدة ومحمد بن عمرو قالا حدثنا أبو عاصم.

اور پھر فرمایا ہے:

زکریا بن ابی زائدہ کی تاریخِ وفات ۱۴۸ھ ہے۔ ولادتِ ابن جریر سے ۷۶ برس پہلے اور دوسرے محمد بن عمر الواقدی ہیں متوفی ۲۰۷ھ ولادتِ ابن جریر سے سترہ برس پہلے۔ عمر کے بعد و غلط ہے ورنہ محمد بن عمرو بن علقمہ اللیثی ہیں متوفی ۱۴۴ھ۔ زکریا بن ابی زائدہ اس کے ہم عصر۔[6]

ہم حیران ہیں کہ منکرینِ حدیث کا حلقہ تمنا صاحب کو محدث العصر، جامع العلوم اور علامہ کے القاب سے یاد کرتا ہے، مگر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس سے ان کے "علم و فضل" کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ تفسیر میں یہ سند دیکھی اور بلا تامل اس پر اپنی ہوس کے مطابق تبصرہ کر ڈالا۔ حالانکہ زکریا بن ابی زائدہ، دراصل زکریا بن یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدۃ ابو زائدۃ ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ کے تحت یہ سند انھوں نے اسی طرح لکھی ہے:

---

(1) تفسیر بتحقیق الشیخ: 156/1 (2) سؤالات الحاکم للدارقطنی: 156، رقم: 230
(3) تہذیب: 187,188/19 (4) تفسیر: 137/1 (5) تاریخ طبری: 256/2 (6) امام زہری وامام طبری: 394

حدثني زكريا بن يحيى بن أبي زائدة ومحمد بن عمرو قالا: ثنا أبو عاصم، الخ اسی طرح ایک اور مقام پر ہے (1) حدثني أبو زائدة زكريا بن يحيى بن أبي زائدة.

اسی طرح دوسری جلد (2) میں بھی زکریا بن یحییٰ بن ابی زائدہ ہے۔ اور زکریا کا ترجمہ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل (3) میں ذکر کیا ہے اور اسے صدوق قرار دیا ہے۔ تہذیب (4) وغیرہ میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ زکریا، ابن ادریس کا بھی شاگرد ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے زکریا ثنا ابن ادریس سے بھی روایت لی ہے۔ (5) اس لیے تمنا صاحب کا اسے زکریا بن ابی زائدہ المتوفی 148ھ قرار دینا سراسر دھوکا اور بے خبری کی دلیل ہے۔

(۵) محمد بن عمرو

اسی طرح اس سند میں محمد بن عمرو کو محمد بن عمر الواقدی سمجھنا اور کہنا کہ واؤ غلط ہے، ایک عجوبہ ہے۔ حالانکہ متعدد مقامات پر محمد بن عمرو سے تفسیر میں روایات موجود ہیں اور اس سے مراد محمد بن عمرو بن العباس الباہلی متوفی 249ھ ہیں جو ابو عاصم الضحاک بن المخلد سے بکثرت روایت کرتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے الباہلی نسبت سے اور مکمل نام سے بھی روایات لی ہیں (6) خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد (7) اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے الثقات (8) میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر دیکھا آپ نے کہ کتنی چابک دستی سے تمنا صاحب اسے محمد بن عمر الواقدی قرار دیتے ہیں اور بتکرار تفسیر میں جو محمد بن عمرو لکھا ہوا ہے، اس کے بارے کہتے ہیں کہ عمرو میں واؤ غلط ہے۔ ورنہ یہ محمد بن عمرو بن علقمہ اللیثی ہیں۔ غلط بیانی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کسی ایک دو مقام پر محمد بن عمر ہوتا تو ہم سمجھتے کہ باقی مقامات پر "عمرو" غلط ہے۔ جب بتکرار "محمد بن عمرو" لکھا ہوا ہے تو پھر اسے محمد بن عمر الواقدی قرار دینا ستم ظریفی

---

(1) تفسیر: 311/1، 345/1 (2) تفسیر: 469,561/2 (3) الجرح والتعدیل: 601 602/1/2
(4) تہذیب: 335/3، الثقات لابن حبان: 255/8 (5) تفسیر: 429/2 (6) ملاحظہ ہو: 103,116,130,136,137,171/1 (7) تاریخ بغداد: 127/3 (8) الثقات: 107/9

تحقیق کا شاہکار ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے عموماً محمد بن عمرو بن العباس الباهلي حدثنا أبو عاصم الضحاك بن مخلد حدثنا عيسى ابن ميمون المكي حدثنا عبد الله بن أبي نجيح عن مجاهد کی سند سے امام مجاہد رحمہ اللہ کے تفسیری اقوال ذکر کیے ہیں۔

(۶) وکیع عن ابیہ

تمنا صاحب نے تفسیر [1] کے حوالے سے ایک سند یوں لکھی ہے:

حدثنا وكيع عن أبيه عن سفيان عن خصيف عن مجاهد

اور فرمایا ہے کہ وکیع بن الجراح متوفی ۱۹۶ھ یعنی ولادت ابن جریر سے ۲۸ برس پہلے اور جلد پنجم میں حدثنا وكيع ثنا جرير عن محمد بن إسحاق ہے۔ ملخصاً [2]

معلوم نہیں تمنا صاحب کے پیش نظر تفسیر ابن جریر کا کون سا مطبوعہ نسخہ ہے۔ یہ سند جو جلد اول [3] کے حوالے سے نقل کی ہمارے نسخہ میں «حدثنا ابن وكيع قال حدثنا أبي عن سفيان عن خصيف عن مجاهد» ہے۔ [4] بلکہ اس سے ایک روایت بعد مزید «حدثنا ابن وكيع قال حدثنا أبي» کی سند سے دو مزید اقوال ہیں۔ ابن وکیع، سفیان بن وکیع ہیں۔ اس لیے اگر تمنا صاحب کا حوالہ درست ہے تو یہ کتابت کی غلطی ہے۔ امام وکیع جو ۱۹۶ھ میں فوت ہوئے ان سے براہِ راست امام ابن جریر قطعاً روایت نہیں کرتے۔

تفسیر [5] میں سورۃ البقرہ کی ایک آیت [6] کے تحت «حدثنا مسروق بن أبان الحطاب قال ثنا وكيع» کی سند میں امام وکیع سے ایک واسطہ ہی سے روایت ہے۔

رہی یہ بات کہ جلد پنجم [7] میں بھی «حدثنا وكيع ثنا جرير عن محمد بن إسحاق»

---

[1] تفسیر: 166/1، 141/4، 130/5 [2] امام زہری اور امام طبری: 394,395 [3] 166/1
[4] تفسیر: 215/1، سورۃ البقرۃ: 31 [5] تفسیر: 530/1 [6] البقرہ: 124 [7] 130/5

ہے اور جریر بن حازم کے شیوخ میں محمد بن اسحاق اور ان کے تلامذہ میں وکیع کا نام موجود نہیں اور سفیان بن وکیع کا نام جریر کے تلامذہ میں بھی نہیں۔ تو یہ بھی تمنا صاحب کی اپنی اپج ہے اور جس نسخہ سے انھوں نے نقل کیا اس میں غالباً غلطی سے یوں ہی «حدثنا وکیع» ہے۔ ورنہ سورۃ الاعراف[1] کی تفسیر میں «حدثنا ابن وکیع قال ثنا جریر»[2] ہے یعنی جریر سے سفیان بن وکیع روایت کرتے ہیں، وکیع نہیں۔ سند میں جریر کو جریر بن حازم قرار دینا بھی غلط اور ان کا حسب خواہش اپنا مفروضہ ہے۔ ورنہ صحیح یہ ہے کہ یہاں جریر بن عبدالحمید مراد ہیں۔ مگر تمنا صاحب فرماتے ہیں جریر بن عبدالحمید کے شیوخ کی فہرست میں نہ ابن اسحاق کا نام ہے نہ ان کے تلامذہ میں وکیع کا نہ سفیان بن وکیع کا۔[3]

تمنا صاحب کا مبلغِ علم یا ان کی دسترس صرف تہذیب تک ہے۔ حالانکہ علامہ المزی نے جریر بن عبدالحمید کے شیوخ میں محمد بن اسحاق کا ذکر کیا ہے اور تلامذہ میں سفیان بن وکیع کا۔[4] بلکہ سفیان بن وکیع کے ترجمہ میں بھی ان کے شیوخ میں جریر بن عبدالحمید کا ذکر کیا ہے۔[5] اسی طرح سیر اعلام النبلاء[6] میں جریر بن عبدالحمید کے تلامذہ میں سفیان بن وکیع کا ذکر ہے۔ مزید تتبع کے بعد تفسیر[7] سورۃ النساء[8] اور تفسیر[9] سورۃ الانشقاق[10] میں حدثنا ابن وکیع قال ثنا جریر عن محمد بن إسحاق کی سند بھی نظر آئی۔ جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تمنا صاحب کے پیشِ نظر تفسیر ابن جریر کے نسخہ میں «حدثنا وکیع» قطعاً درست نہیں۔ اور اسی حوالے سے ان کی سخن سازی سراسر بے خبری پر مبنی ہے۔

(۷) ابن مبارک

تمنا صاحب نے تفسیر[11] کے حوالے سے ایک سند یوں ذکر کی ہے۔

---

[1] سورۃ الاعراف:31، [2] تفسیر طبری 161/8 [3] امام زہری اور امام طبری 395
[4] التہذیب: 357,368/3 [5] التہذیب: 385/7 [6] سیر اعلام النبلاء: 9,10/9 [7] تفسیر: 222/5 [8] سورۃ النساء: 94، [9] تفسیر: 115/20 [10] الانشقاق: 7 [11] تفسیر: 164/4

حدثنا ابن المبارك قال ثنا عبد الأعلى قال ثنا داود عن سعيد

ابن المسيب.

اور فرمایا ہے کہ ابن المبارک سے مراد امام عبد اللہ بن المبارک الحنظلی المروزی متوفی ۱۸۱ھ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ عبد الاعلی بن محمد متوفی ۱۹۸ھ سے روایت نہیں کرتے۔ اگر ابن جریر کی مراد ابن مبارک سے عبد اللہ بن مبارک ہیں تو ان کی وفات ابن جریر کی پیدائش سے ۴۳ برس قبل ہو چکی تھی۔ اور اگر کوئی اور ہے تو وہ مجہول ہے اور یہ ابن جریر کی بدترین تدلیس ہے۔[1]

تمنا صاحب نے تفسیر سے جو سند ذکر کی ہے یہ سورۃ النساء کی ایک آیت[2] کی تفسیر کے تحت ہے۔ جو ہمارے پیش نظر تفسیر مطبوعہ مصطفیٰ البابی میں بھی[3] ہے۔ اسی صفحہ پر اس سے صرف سات سطریں قبل امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک سند یوں ذکر کی ہے۔ «حدثنا یحییٰ بن سعید الأموی قال ثنا ابن المبارک عن ابن جریج» غور فرمایئے یہاں امام عبد اللہ بن مبارک سے امام ابن جریر رحمہ اللہ ایک واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد «حدثنا ابن المبارک» سے تمنا صاحب کا یہ سمجھنا کہ یہاں بھی معروف امام عبد اللہ بن مبارک ہی مراد ہیں۔ پرلے درجے کی جہالت ہے، بلکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ سورۃ الاعراف کی ایک آیت[4] کے تحت فرماتے ہیں:

حدثني المثنى قال ثنا سويد قال أخبرنا ابن المبارك.

لیجیے یہاں امام ابن جریر رحمہ اللہ اور امام عبد اللہ بن مبارک کے مابین دو واسطے ہیں۔

اس لیے جب وہ امام ابن مبارک رحمہ اللہ سے ایک یا دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں تو ایک جگہ «حدثنا ابن المبارک» سے امام عبد اللہ بن مبارک ہی مراد لینا خود فریبی ہے۔

---

[1] امام زہری وطبری: 395,396 [2] النساء: 7 [3] تفسیر مطبوعہ مصطفی البابی: 265/4

[4] الأعراف: 37 تفسیر 169/8، مزید دیکھیے 75/3

یہی نہیں ان کی تعلی اور جسارت مزید دیکھئے، لکھتے ہیں: ''اگر کوئی اور ہے لا معدوم مجہول الحال شخص، تو یہ ابن جریر کی بدترین اور خبیث ترتلبیس ہے۔'' حالانکہ وہ خود اس بحث میں تلبیس ابلیس کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس قدر لن ترانی کے باوجود یہ بھی معلوم نہیں کہ ''ابن المبارک'' کوئی اور ثقہ محدث ہے، امام عبداللہ بن مبارک کے علاوہ سب کو مجہول اور لا معلوم قرار دینا سراسر جہالت ہے۔

اس مقام پر کتاب کے حاشیہ ہی میں لکھا ہے کہ ''ایک محمد بن مبارک الحنظلی امام عبداللہ ابن المبارک کے بھائی اور دوسرے عبدالرحمن بن المبارک ہیں، مگر تاریخی اعتبار سے یہ دونوں بھی امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے استاد نہیں ہو سکتے۔'' ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دونوں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے نہیں ہو سکتے، مگر یہ لکھ کر کیا تمنا صاحب نے اپنے آپ پر مہر جہالت ثبت نہیں کر دی۔ کہ عبداللہ بن المبارک کے علاوہ کوئی اور ہے تو ''وہ لا معلوم مجہول الحال ہے تو یہ ابن جریر کی بدترین تدلیس ہے۔''

ہم عرض کرتے ہیں امام ابن جریر کے یہ استاد محمد بن عبداللہ بن المبارک البغدادی قاضی حلوان ہیں جو علی حسب الاختلاف ۲۵۴ھ یا ۲۶۰ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ جن کا تذکرہ تاریخ بغداد ①، التھذیب ②، السیر ③، التذکرہ ④ اور التھذیب ⑤ وغیرہ کتب میں موجود ہے، اور حفاظِ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ امام بخاری، امام ابوداود، امام نسائی رحمہم اللہ وغیرہ کے بھی وہ استاد ہیں۔ اس لیے امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں کوئی تدلیس و تلبیس نہیں کی۔ اس قسم کی سند پر دھوکا تمنا صاحب اور ان کے ہمنواؤں کو تو ہو سکتا ہے حدیث کے کسی طالب علم کو نہیں۔ تلبیس تو خود تمنا صاحب نے کی، محولہ صفحہ ہی میں اوپر کی آٹھویں سطر پر غور کر لیتے تو شاید وہ اس غلط فہمی سے بچ جاتے۔ مگر ان کے ہاں تو ایسا کوئی داعیہ ہی نہیں۔ ان پر یہی ایک بھوت سوار ہے کہ ثابت کر دیا جائے کہ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ ان شیوخ سے روایت لیتے ہیں جو ان کی

① بغدادی: 423/5 ② التھذیب: 272/9 ③ السیر: 265/12 ④ التذکرہ: 519/2

⑤ التھذیب للمزی: 449/16

پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے اس تمنائی دعویٰ میں کس حد تک صادق ہیں۔

مزید تھوڑی سی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ مسند امام احمد میں «حدثنا سفیان» دیکھ کر تمنا صاحب جیسے "محدث العصر" تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفیان بن سعید الثوری ہیں، مگر کوئی حدیث کا طالب علم یہ جسارت نہیں کرسکتا وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ سفیان بن عیینہ ہیں، سفیان بن سعید نہیں۔ اسی طرح امام ابن جریر کے طبقہ شیوخ میں 'حدثنا ابن المبارک' دیکھ کر تمنا صاحب تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ امام عبداللہ بن المبارک ہیں، مگر کوئی حدیث کا طالب علم یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا۔

الغرض ابن المبارک یہاں امام عبداللہ بن مبارک قطعاً نہیں بلکہ وہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے استاد ہیں وہ محمد بن عبداللہ بن مبارک ہوں یا کوئی ان کا اور استاد۔

(۸) اسحاق بن یحییٰ

تمنا صاحب تفسیر[1] کے حوالے سے ایک سند یوں نقل کرتے ہیں:

حدثنا إسحاق بن يحيى قال أخبرنا عبد الرزاق قال أخبرنا معمر عن قتادة ومجاهد.

اس سند میں اسحاق بن یحییٰ کے بارے میں فرماتے ہیں وہ اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ ہیں جو ۱۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ ولادتِ ابن جریر سے ساٹھ برس پہلے۔ اس کے علاوہ اور بھی اسحاق بن یحییٰ ذکر کیے اور فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی تاریخی اعتبار سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کا استاد نہیں ہوسکتا۔[2]

تمنا صاحب نے تفسیر کے جس مقام کا حوالہ دیا یہ سورۂ آل عمران[3] کے تحت ہے اور ہمارے پیشِ نظر تفسیر کے نسخہ[4] میں بھی «حدثنا إسحاق بن يحيىٰ» ہی لکھا ہوا ہے۔

---

① تفسیر 8/4 ② امام زہری و امام طبری: 396,397 ③ آل عمران: 97 ④ تفسیر: ص 10

لیکن تفسیر کے ان دونوں نسخوں میں ''اسحاق بن یحییٰ'' ہونے کی بنا پر جو سخن سازی تمنا صاحب نے کی اس کے بارے میں ہم انھیں یک گونا مجبور سمجھتے ہیں۔لیکن اگران میں طلب صادق ہوتی تو اس کو خود تفسیر ہی سے حل کر سکتے تھے۔

دور نہ جایے اس آیت کی تفسیر میں ایک صفحہ کے بعد ① یہی سند یوں ہے:

حدثنا الحسن بن يحيىٰ قال أخبرنا عبد الرزاق قال أخبرنا معمر عن قتادة.

تمنا صاحب خواہ مخواہ دور نکل گئے اگر وہ سنجیدگی سے غور کرتے تو حسب ذیل مقامات ② پر بتکرار یہی لکھا ہوا پاتے۔«حدثنا الحسن بن يحيىٰ قال أخبرنا عبد الرزاق» یہ حسن بن یحییٰ بن الجعد البغدادی ہیں جو ۲۶۳ھ میں فوت ہوئے،امام عبدالرزاق کے وہ شاگرد ہیں جیسا کہ ''التھذیب للمزی ③ وغیرہ میں صراحت ہے۔بلکہ تفسیر ④ کا وہ نسخہ جو شیخ شاکر کی تحقیق سے طبع ہوا ہے اس میں اسی محولہ آیت کے تحت «حدثنا حسن بن يحيى» ہی ہے۔اس لیے تمنا صاحب نے ایک غلط نسخے کی بنیاد پر جو مفروضے گھڑے ہیں وہ سب غلط اور بے بنیاد ہیں۔

(۹) علی بن ابی طلحہ

تمنا صاحب نے تفسیر ⑤ کے حوالے سے ایک سند یوں لکھی ہے:

«حدثني علي بن أبي طلحة عن يزيد عن جويبر»

اور فرمایا ہے کہ یہ علی بن ابی طلحہ،ابوالحسن علی بن سالم بن المخارق الحمصی ہیں جو ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے ابن جریر کی ولادت سے اکاسی برس قبل۔ ⑥

تمنا صاحب نے تفسیر سے سورۃ البقرہ کی ایک آیت کا ⑦ حوالہ دیا ہے، جو ہمارے پیش

① تفسیر: 12/4 ② 67,80,87,97/1 ، 45,46,68,69,79,72/3

③ التھذیب للمزی: 441/4 ④ تفسیر: 27/7 ⑤ تفسیر: 66/3

⑥ امام زہری وامام طبری: 398 ⑦ البقرہ: 267

نظر نسخہ کے حسبِ ذیل صفحہ [1] پر ہے۔ مگر اس میں علی بن ابی طلحہ نہیں، بلکہ «حدثني يحيى ابن ابی طالب» ہے۔ اسی طرح شیخ احمد شاکر کی تحقیق سے تفسیر کا جو نسخہ شائع ہوا اس میں بھی «حدثني يحيى بن ابی طالب» ہے۔ [2] یہی نہیں، بلکہ اس سے قبل البقرہ کی ایک آیت [3] کے تحت اسی سند سے تفسیری اقوال دو مرتبہ منقول ہیں اور دونوں میں سند یوں ہے:

حدثني يحيى بن أبي طالب قال حدثنا يزيد قال حدثنا جويبر. الخ

ہم حیران ہیں کہ تمنا صاحب تو بڑی دور کی کوڑی لانے کی عادی ہیں۔ مگر یہاں اتنی بات پر غور کر لیتے کہ امام ابن جریر جو اسی سند سے «جويبر عن الضحاك» سے تفسیری اقوال نقل کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر اس کی سند کیسی اور کیوں کر ہے؟ اگر سنجیدگی سے اس پر غور کر لیتے تو اس سند میں امام ابن جریر رحمہ اللہ کا استاد علی بن ابی طلحہ قرار نہ دیتے، بلکہ شیخ شاکر کا نسخہ بھی ان کے پیش نظر ہے جیسا کہ ان کی تصنیف امام زہری و امام طبری [4] سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ اگر اس کی مراجعت ہی کر لیتے تو یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا۔ مگر وہ یہ زحمت کیوں کرتے؟ انھیں تو امام طبری رحمہ اللہ کو موردِ الزام ٹھہرانا ہے اگرچہ غلطی کی بنیاد پر ہی سہی۔ افسوس ہے ایسے علم پر اور تأسف ہے ایسی تحقیق پر۔

(۱۰) یزید

تمنا صاحب نے تفسیر [5] سے ایک سند یوں نقل کی ہے:

حدثنا يزيد ثنا سعيد عن قتادة

اور فرمایا ہے کہ اگر یہ یزید بن زریع ہیں تو ان کی وفات ولادتِ ابن جریر رحمہ اللہ سے ۴۲ برس پہلے ہوئی تھی۔ اور اگر یزید بن ابی حبیب العمری المتوفی 128ھ ہیں تو وہ ولادت

---

[1] 5/3 [2] تفسیر: 567/5 رقم: 6152 [3] 104/1 نیز دیکھیے 7,85,107,112,114/3 وغیرہ

[4] امام زہری و امام طبری: 402,403 [5] تفسیر: 60/3

ابن جریر رحمہ اللہ سے ۹۶ برس پہلے فوت ہو چکے تھے۔ (1)

یہاں بھی معاملہ ''علی بن ابی طلحہ'' کی نوعیت کا ہے۔ تمنا صاحب اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کیونکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ اس سند سے امام قتادہ رحمہ اللہ کے تفسیری اقوال متعدد مقامات پر نقل کرتے ہیں، یہی ایک مقام نہیں جس میں انھوں نے یہ سند نقل کی بلکہ اسی تیسری جلد میں متعدد مقامات (2) پر آپ کو یہ سند نظر آئے گی، نیز یہی سند جلد اول (3) میں بھی ہے اور ان تمام مقامات پر یہ سند یوں ہے:

حدثنا بشر بن معاذ العقدی قال حدثنا یزید بن زریع عن سعید بن أبی عروبة عن قتادة.

اور زیادہ تر «حدثنا بشر حدثنا یزید» مختصر طور پر ہے، بلکہ تاریخ (4) میں بھی یہ سند اسی طرح ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی تھوڑی سی مراجعت سے حقیقت تک پہنچ جاتا ہے، مگر افسوس ہے تمنا صاحب جیسے ''محدث العصر'' اس حقیقت کو معلوم نہیں کر سکے کہ ایک نسخہ میں ایک جگہ اگر ''بشر بن معاذ'' کا واسطہ چھوٹا ہوا ہے تو یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی غلطی نہیں۔ ناسخ یا طابع کی غلطی ہے۔ مگر تمنا صاحب کو اس سے کیا غرض، انھوں نے تو بہر نوع اپنا الو سیدھا کرنا اور سادہ لوح قارئین کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔

(۱۱) عمرو بن عثمان العثمانی

تمنا صاحب نے تفسیر (5) کے حوالے سے ایک سند نقل کی ہے: «حدثنا عمرو بن عثمان العثمانی قال حدثنا ابن أبی أویس»

اور فرمایا کہ عمرو بن عثمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے ان کی وفات ۵۰ھ سے پہلے ہے ابن جریر سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنی ولادت سے ۴۷ برس پہلے وفات

---

(1) امام زهری وامام طبری: 398,399 (2) 16,24,25,28,30,36,38,44,47,50,56,57,63 (3) 66,68,70,72,73,76,79 (4) تاریخ: 63,101 (5) تفسیر: 14,40,42,49,51,146/1 45/1

پانے والے سے روایت کریں۔[1]

اسی حوالے سے تمنا صاحب کی سخن سازی طویل ہے اور احتمالات کے دائرے بڑے وسیع ہیں۔ مگر یہاں تو ان کے علم و فضل کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ رہا ہے۔ تفسیر کے نسخہ میں ''عمرو بن عثمان العثمانی'' دیکھا تو فرمایا کہ یہ تو حضرت عثمان کا بڑا بیٹا تھا جو ۱۵۰ھ میں فوت ہوا۔ حالانکہ عمرو بن عثمان کی وفات ۱۵۰ھ میں ذکر کرنا محلِ نظر ہے وہ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔[2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی وفات ۸۰ سے ۹۰ کے مابین ذکر کی ہے۔[3] اور وہ روایت کرتے ہیں: ''ابن ابی اویس'' سے، اور خود تمنا صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اسماعیل بن عبداللہ ابن عبداللہ ہیں جو ۲۲۶ یا ۲۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب[4] میں اسے دسویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔ بتلایئے عمرو بن عثمان العثمانی تابعی جو ۸۰ھ، ۹۰ھ میں فوت ہو چکے وہ اسماعیل بن ابی اویس سے کیوں کر روایت کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی الٹی گنگا تمنا صاحب کے ہاں ہی بہ سکتی ہے۔ حدیث کے سچے طالب علم سے اس کی توقع بالکل ناممکن ہے۔ اس ضمن میں ان کی باقی سخن سازی اور فرضی احتمالات سے قطع نظر حقیقتِ حال یہ ہے کہ عمرو بن عثمان العثمانی دراصل ابوعثمان عمرو بن محمد بن یحییٰ بن عمرو بن خالد بن عبداللہ ابن عمرو بن عثمان بن عفان ہیں جو قاضیِ مکہ تھے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے الجرح والتعدیل[5] میں ان کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اسماعیل بن ابی اویس وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، اور صدوق ہیں۔ حافظ ابن حزم نے الجمہرۃ[6] اور ان کے حوالے سے علامہ الفاسی نے العقد الثمین[7] میں اس کا تفصیلی نسب نامہ ذکر کیا ہے۔ اور امام ابن جریر سورۃ الفتح کی ایک آیت[8] کے تحت[9] «حدثني عمرو بن محمد العثماني قال

---

[1] امام زہری وامام طبری: 399 [2] تہذیب: 78,79/8 [3] تاریخ اسلام: 496/3، 167/4
[4] تقریب 43 [5] الجرح والتعدیل: 263/3/1 [6] الجمہرۃ: 84 [7] العقد الثمین: 408/5
[8] الفتح: 26 [9] 103/26

ثنا إسماعيل بن أبی أویس» کی اسی سند سے روایت ذکر کی ہے۔جس سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عمرو بن عثمان العثمانی یہ عمرو کے جد اعلیٰ کی طرف نسبت ہے اور اس سے مراد عمرو بن محمد ہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے نہیں جیسا کہ تمنا صاحب کہہ رہے ہیں۔

(۱۲)ابو عبید الوصابی

تمنا صاحب نے شیخ شاکر کی تحقیق سے شائع ہونے والے نسخہ [1] کے حوالے سے ایک سند یوں نقل کی ہے:

حدثنا أبو عبيد الوصابي قال حدثنا محمد بن حفص قال أنبأنا أبو حميد حدثنا الفزاري عن ليث بن أبي سليم عن أبي بردة.

اور کہا ہے کہ ابن جریر کی خود ساختہ گھڑی ہوئی یہ سند ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی کذابیت کی واضح دلیل ہے۔ابو عبید الوصابی محمد بن حفص ہی ہے جس کا ترجمہ میزان [2] اور لسان میں ہے۔ابو حمید اور الفزاری کو مبہم رکھا تاکہ پتا نہ چلے یہ کون ہیں وغیرہ۔[3]

تمنا صاحب کا الزام آپ کے سامنے ہے۔شیخ شاکر نے بھی حاشیہ میں فرمایا۔ہے کہ محمد ابن حفص ہی کی کنیت ابو عبید ہے اور ابو حمید کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔لیکن شیخ شاکر نے اس کے بعد سورۂ آل عمران کی آیت نمبر (۲۱) حدیث نمبر (۶۷۸۰) کے تحت جو حقیقت بیان کی ہے تمنا صاحب نے کبوتر کی طرح اس سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔چنانچہ وہاں سند یوں ہے:

---

① تفسیر: 101/1 ② میزان: 48/3 ③ امام زہری و امام طبری: 400,401

حدثني أبو عبيد الوصابي محمد بن حفص قال حدثنا ابن حمير.

اور حاشیہ میں شیخ شاکر نے وضاحت کی ہے کہ پہلے «حدثني أبو عبيد الوصابي قال حدثنا محمد بن حفص» تھا، مگر درست یہ ہے۔ الوصابی کے بعد «قال حدثنا» "حدثنا" غلط ہے، اور اس جگہ پر "ابوعبیدالرصافی محمد بن جعفر" تھا۔ (تفسیر مطبوعہ البابی مصر ① میں بھی اسی طرح ابوعبیدالرصافی محمد بن جعفر ہے۔) لیکن یہ درست نہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر سے معلوم ہوتا ہے، اور ایک نسخہ میں جو اسی کا استاد "ابن حمید" ہے وہ بھی غلط ہے صحیح ابن حمیر ہے۔ جیسا کہ تفسیر ابن کثیر ② مع البغوی میں ہے۔

عرض ہے کہ شیخ شاکر رحمہ اللہ نے تفسیر ابن کثیر کا جو حوالہ دیا اس کی وضاحت سورۂ آل عمران کی آیت ③ کے تحت دیکھی جا سکتی ہے، بلکہ یہی نام صحیح طور پر سورۃ المزمل ④ کے تحت موجود ہے: «حدثني أبو عبيد الوصابي محمد بن حفص قال ثنا ابن حمير» جس سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ ناسخ کی غلطی کو تمنا صاحب امام ابن جریر رحمہ اللہ کی غلطی قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اور "ابوحمید" بھی ابن حمیر ہے اور وہ محمد بن حمیر بن انیس القضاعی ہے جیسا کہ شیخ شاکر نے بھی وضاحت فرما دی ہے۔ ⑤ تمنا صاحب کی بے خبری کا اندازہ لگائیے کہ وہ اسی سند کے ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں: "لیث بن ابی سلیم کے تلامذہ میں کسی فزاری کا ذکر نہیں۔" حالانکہ علامہ المزی رحمہ اللہ نے اول وہلہ میں لیث کے جس شاگرد کا ذکر کیا ہے وہ یہی امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد الفزاری رحمہ اللہ مشہور محدث ہیں۔ ⑥ اس سے ان کی لن ترانیوں اور غلط بیانیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۳) ابوالعالیۃ العبدی اسماعیل بن الہیثم

تمنا صاحب نے تفسیر ⑦ سے ایک سند یوں نقل کی ہے: «حدثني أبو العالية العبدي

---

① مطبوعہ البابی مصر: 216/3 ② ابن کثیر: 118/2 ③ سورۃ آل عمران: 12، 381/1
④ سورۃ المزمل: 12، 135/29 ⑤ 286/6 ⑥ التہذیب: 450/15 ⑦ تفسیر: 79/3

إسماعيل بن الهيثم حدثنا أبو قتيبة» اوراس کے بعد ہی دوسری روایت «حدثني أبو العالية عن أبي قتيبة» الخ ہے۔تمنا صاحب کی سخن طرازی سے قطع نظران کا بنیادی سوال یہ ہے کہ ابو العالیہ کا نام اسماعیل بن الہیثم کہیں نہیں ملتا، بلکہ اسماعیل ابن الہیثم کوئی راوی کہیں نظر نہیں آتا۔①

عرض ہے کہ تمنا صاحب کی کیا بات، شیخ شاکر نے بھی لکھا ہے کہ اسماعیل بن الہیثم کا ترجمہ ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔② مگر یہ درست نہیں۔علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

أبو العالية إسماعيل بن الهيثم العبدي عن طائفة وعنه أبوعروبة وابن خزيمة.③

اس لیے یہ کہنا کہ ان کا کہیں ذکر ہی نہیں قطعاً غلط ہے۔امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی السنن④ میں اس سے ایک واسطہ کے ساتھ روایت بیان کی ہے۔ابن ناصر الدین رحمہ اللہ نے بھی توضیح المشتبہ⑤ میں اس کا ذکر کیا ہے اس لیے تمنا صاحب کے سب مفروضے یہاں بھی بے بنیاد اور غلط ہیں۔

(۱۴) اسماعیل بن الفضل

تمنا صاحب نے اپنے پیشِ نظر تفسیر کے نسخہ⑥ کے حوالے سے ایک سند یوں نقل کی ہے:

أما الخبر الذى حدثنا به إسماعيل بن عياش عن إسماعيل ابن يحيى.

اور فرمایا ہے کہ اسماعیل بن عیاش کی وفات ۱۸۱ یا ۱۸۲ھ میں ہوئی، ولادتِ ابن جریر سے

---

① امام زهری وطبری: 402,403 ② تفسير بتحقيقه: 73/4، رقم: 6395، البقرة: 282، رقم: 9713، 444/8 ③ المقتنى في سرد الكنى: 336/1، رقم: 3396 ④ السنن: 157/2 ⑤ توضيح المشتبه: 48/4 ⑥ تفسير: 40/1

۴۲،۴۳،سال پہلے، مگر اس کے بعد اسی مضمون کی دو روایتیں ایک دو صفحہ کے بعد آتی ہیں ان میں اسناد یوں ہے:

حدثنا إسماعيل بن الفضل قال: حدثنا إبراهيم بن العلاء قال: حدثنا إسماعيل بن عياش.

اس لیے گمان ہوسکتا ہے کہ یہاں کتابت میں دو نام چھوٹ گئے ہوں اسی لیے طبع جدید میں محشی نے یہاں پر وہ دو نام جوڑ کر اسناد پوری کر دی ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حدیث نمبر ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۴۷ میں ہر جگہ ابن جریر، اسماعیل بن الفضل سے روایت کرتے ہیں۔ محشی راویوں کا ہر جگہ تعارف کراتے ہیں، مگر اسماعیل کے بارے میں کچھ نہیں بتلاتے، اس اسماعیل بن الفضل کا ترجمہ لسان المیزان ① میں موجود ہے اور یہ رجال شیعہ سے ہے جو حضرت جعفر صادق سے روایت کرتے تھے اس کی ولادت تقریباً ۱۱۵،۱۲۰ھ میں بنتی ہے۔ اس لیے یقیناً ابن جریر کی پیدائش سے پہلے یہ وفات پا چکے ہوں گے اور کوئی دوسرا راوی اسماعیل بن الفضل نام کا کوئی نہیں دکھا سکتا۔ ②

تمنا صاحب کی طویل تو تکار کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے اور ان کا تمنائی دعویٰ بھی، ان کی الزام تراشیوں کا اندازہ لگایئے کہ وہ محشی جدید یعنی شیخ احمد شاکر کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ "طبع جدید میں محشی نے یہاں پر دو نام جوڑ کر اسناد پوری کر دی ہو۔" حالانکہ "اسناد پوری" نہیں کی، بلکہ مکمل سند انھوں نے ذکر کی اور تفسیر طبع مصطفیٰ البابی ③ میں بھی اسی طرح مکمل سند ہے۔ آخر وہ سند پوری کر دینے کا الزام کس کس پر لگائیں گے؟ یہ بات اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ تمنا صاحب کے پیشِ نظر تفسیر طبری کا جو نسخہ ہے وہ صحیح طور پر طبع نہیں ہوا۔ جس کی بنیاد پر اس قسم کے بیشتر اعتراضات امام طبری رحمہ اللہ پر کرتے ہیں۔ جن کی طرف اشارہ ہم پہلے متعدد بار کر چکے ہیں۔

① لسان المیزان: 426/1 ② امام زهری وطبری: 407-405 ملخصاً ③ تفسیر طبع مصطفی البابی: 53/1

رہے اسماعیل بن الفضل تو وہ اسے لسان المیزان کے حوالے سے شیعہ راوی باور کراتے ہیں اور اپنے روایتی کردار اور التزام کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے وثوق سے فرماتے ہیں: ''اور کوئی دوسرا راوی اسماعیل بن الفضل نام کا کوئی نہیں دکھا سکتا'' آگے بڑھنے سے پہلے قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر اسماعیل بن الفضل یہی لسان کا راوی ہے جو بقول تمنا صاحب ۱۱۵ھ تا ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا ہوگا تو اس کی اپنے سے ۳۷ یا ۳۲ سال بعد پیدا ہونے والے ابراہیم بن العلاء سے روایت بظاہر محلِ نظر ہے۔ کیونکہ ابراہیم ۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۵ھ میں فوت ہوئے۔ ①

اگر اسماعیل سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت کا ثبوت درکار ہے تو اسماعیل کا ابراہیم سے سماع کا ثبوت بھی ضروری ہے۔ کاش تمنا صاحب نے اس گتھی کو بھی سلجھایا ہوتا۔

اس کے برعکس دیکھئے کہ ابراہیم بن العلاء ہی کے ترجمہ میں علامہ المزی نے التھذیب ② میں ان کے شیوخ میں اسماعیل بن عیاش اور تلامذہ میں اسماعیل بن الفضل البلخی کا ذکر کیا ہے، اور اسماعیل بن الفضل البلخی کا ترجمہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ③ میں لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ ثقہ تھے اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے لا بأس بہ کہا ہے۔ ④ ۲۸۶ھ میں وہ فوت ہوئے ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی سنن ⑤ میں ایک واسطہ سے اس سے روایت بیان کی ہے۔ اس سے اس تمنائی دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ ''کوئی دوسرا راوی اسماعیل بن الفضل نام کا کوئی نہیں دکھا سکتا۔''

تمنا صاحب کی ایک اور کارستانی

تفسیر ابن جریر میں اسی سند کے ساتھ «ومسعر بن کدام عن عطیة العوفی عن أبی سعید» اور ایک روایت ۱۴۷ میں ''ابوسعید یعنی الخدری'' ہے۔ ⑥ تفسیر طبع مصطفیٰ البابی ⑦

---

① تھذیب: 149/1 ② التھذیب: 399,400/1 ③ تاریخ بغداد: 290/6

④ سؤالات الحاکم للدارقطنی: 53 ⑤ سنن دارقطنی: 47/1

⑥ تفسیر ابن جریر: ص56 ⑦ تفسیر طبع مصطفیٰ البابی: 53,54/1

میں بھی اسی طرح ہے۔ تمنا صاحب نے شیخ احمد شاکر کے بارے میں جو تاثرات بیان کیے ہیں ان کے بارے میں تو اہلِ علم ہی رائے دے سکتے ہیں کہ یہ کہاں تک حقیقت پر مبنی ہیں؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ان کے تمام تمنائی دعووں کے باوجود ان کی بے خبری پر دلالت کرتے ہیں۔

مثلاً: انھوں نے فرمایا: مسعر بن کدام کا عطف کس پر ہے؟ ''محشی (شیخ شاکر) نے اسماعیل بن یحییٰ کو دھر لیا اس پر مسعر کا عطف کر دیا۔'' تمنا صاحب کی تصوراتی احتمال آفرینی، بلکہ خود فریبی سے قطع نظر یہ دیکھیے کہ شیخ شاکر نے یہ عطف اسماعیل بن یحییٰ پر دھرا ہے تو کیا یہ بے ثبوت ہے؟ انھوں نے تو امام ابن حبان کی المجروحین کے حوالے سے صاف طور پر لکھا ہے کہ اسماعیل موضوع روایات بیان کرتا ہے اور اس کی موضوع روایات میں ایک یہی مسعر کے واسطہ سے ابوسعید الخدری کی روایت ہے، ان کے الفاظ ہیں:

ثم ضرب مثلًا من أكاذيبه، فروى الحديث بطوله عن محمد ابن يحيىٰ بن رزين العطار عن إبراهيم بن العلاء بن الضحاك بالإسناد الثاني الذي هنا من حديث أبي سعيد الخدري.[1]

شیخ شاکر نے جو المجروحین کا حوالہ دیا اس میں اس کی سند بھی دیکھ لیجیے:

أخبرناه محمد بن يحيى بن رزين العطار بحمص ثنا إبراهيم ابن العلاء بن الضحاك الزبيدي ثنا إسماعيل بن عياش ثنا إسماعيل بن يحيى عن مسعر بن كدام عن عطية عن أبي سعيد.[2]

شیخ شاکر کی اتنی وضاحت کے باوجود اگر تمنا صاحب کو یہ مداہنت نظر آتی ہے اور ''محشی'' کا بلا وجہ مسعر کو اسماعیل بن یحییٰ کے ساتھ نتھی کرنا محسوس ہوتا ہے تو ہم اس کے بغیر اور کیا کہہ

---

[1] تفسیر: 1/122، رقم: 130 [2] المجروحین: 1/126،127

سکتے ہیں کہ موسم خزاں کے اندھے کو ہر طرف ویرانی ہی نظر آتی ہے کوئی صحیح و صاف بات دکھائی نہیں دیتی۔

اسی طرح تمنا صاحب نے یہ بھی فرمایا: دوسری مداہنت شارح صاحب (شیخ شاکر) نے یہ فرمائی: عطیہ کوفی کے ذکر میں، وہ خوب جانتے ہیں کہ عطیہ، کلبی سے تفسیری روایتیں لیتا اور اس کا نام لینے کی بجائے اپنی طرف سے ابوسعید سے کنیت رکھتا ہے۔ حالانکہ کلبی کی کنیت ابوالنضر تھی۔ شارح نے تہذیب میں دیکھنے کے باوجود ابن جریر رحمہ اللہ کے یعنی الخدری لکھنے پر کوئی نوٹ نہ لکھا۔

اولاً: عرض ہے کہ استاذ شاکر رحمہ اللہ نے تو عطیہ کے بارے میں صاف لکھا ہے:

عطية بن سعد بن جنادة العوفي وهو ضعيف ضعفه أحمد وأبو حاتم وغيرهما. [1]

''کہ عطیہ بن سعد عوفی ضعیف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ وغیرہما نے اسے ضعیف کہا ہے۔''

لہٰذا عطیہ کو تو شیخ شاکر خوب جانتے تھے۔

ثانیاً: امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تو اپنے علم و فضل سے ''یعنی الخدری'' فرمایا اور ان کو شیخ شاکر نے صحیح سمجھا کہ یہ روایت حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے ہے۔ انھوں نے یہ بجا سمجھا ہے کوئی مداہنت نہیں کی۔ تفسیر ابن جریر کی یہی روایت امام ابن عدی رحمہ اللہ نے الکامل [2] میں ذکر کی اور «عن أبي سعيد الخدري» ہی فرمایا ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی «إسماعيل بن يحيیٰ عن مسعر عن عطية عن أبي سعيد الخدري» کی سند سے روایات بیان کی ہیں۔ اس لیے یہ روایت بھی حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے ہی ہے کلبی سے نہیں جس کی کنیت عطیہ، ابوسعید ظاہر کرتے تھے۔ اس لیے علامہ شاکر رحمہ اللہ

---

[1] تفسیر: 122/1 [2] الکامل: 299/1

نے یہاں کوئی مداہنت نہیں کی یہ محض تمنائی وساوس ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱۵) موسیٰ بن سہل الرازی

تمنا صاحب نے شیخ شاکر کی تحقیق سے شائع شدہ تفسیر ابن جریر[1] کے حوالے سے ایک سند یوں نقل کی ہے:

حدثنا موسی بن سهل الرازی قال حدثنا يحيى بن عوف عن الفرات بن السائب.

اور فرمایا ہے کہ موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی کا مختصر ترجمہ میزان الاعتدال[2] میں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کی بیان کردہ روایت میزان ہی سے نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خلقت أنا وأبو بكر وعمر من تربة واحدة وفيها ندفن.

کہ میں، ابوبکر اور عمر ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں ہم دفن ہوں گے۔ اور مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی کے رسالہ فضائل شیخین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو غریب وحسن قرار دیا ہے، موسیٰ بن سہل الرازی کو ثقہ ثابت کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ موسیٰ بن سہل سے اس کی روایت سہل بن بکار بن بشر الدارمی نے کی ہے جو ثقہ راوی تھے۔ اور موسیٰ بن سہل الرازی کے بارے میں مزید لکھا ہے امام بخاری نے ان کی وفات ۲۰۰ھ سے قبل لکھی ہے اور ابن جریر ان کی وفات کے کم از کم پچیس برس بعد پیدا ہوئے، بلکہ ان کے تلمیذ سہل بن بکار کی وفات بھی ولادتِ ابن جریر سے تین چار برس بعد ہوئی تھی۔ نیز ابن جریر کی خودساختہ اس سند میں یحییٰ بن عوف ایک فرضی نام ہے۔[3]

تمنا صاحب کی روایتی تطویل سے قطع نظر ان کے بیان کا خلاصہ قارئین کرام کے سامنے

---

(1) تفسیر ابن جرير: 174/1، 180 (2) ميزان الاعتدال: 206/4 (3) امام زهری وطبری: 403,405

ہے۔اس کے بارے میں ہماری معروضات حسب ذیل ہیں:

۱۔ موسیٰ بن سہل الرازی کو موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی قرار دینا ہی محلِ نظر ہے۔شیخ البانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس طبقہ میں موسیٰ بن سہل چار ہیں۔

(۱) موسیٰ بن سہل بن قادم الرملی النسائی: ثقہ

(۲) موسیٰ بن سہل بن کثیر الوشاء البغدادی: ضعیف

(۳) موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی: ضعیف جداً

(۴) موسیٰ بن سہل الرازی: لا یعرف [1]

ظاہر ہے کہ شیخ البانی نے موسیٰ بن سہل الرازی اور موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی کے مابین فرق کیا ہے۔ایک کو "ضعیف جدا" اور دوسرے کو "لا یعرف" قرار دیا ہے۔اس لیے بلا دلیل تمنا صاحب کا اسے موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی قرار دینا ان کے دیگر وساوس و دعاوی میں سے ایک وسوسہ و دعوی ہے۔

۲۔ موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی کا ترجمہ میزان الاعتدال [2] میں اور اس کی مذکورہ روایت "مجھے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو ایک ہی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔" کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ موسیٰ نے اسحاق الازرق سے باطل حدیث روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی خاموش تائید کی، بلکہ فرمایا کہ یہ موسیٰ درحقیقت موسیٰ بن سہل الراسبی ہے۔راسبی نسبت قبیلے کی طرف ہے اور رازی شہر کی طرف۔ [3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس فیصلے سے کہ یہ دونوں ایک ہیں، اختلاف کی گنجائش ہے۔لیکن اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ حافظ ذہبی نے جو اسے "خبر باطل" قرار دیا ہے وہ اس سے متفق ہیں۔

---

① الصحیحۃ: 165/5 ② میزان الاعتدال: 206/4 ③ لسان المیزان: 120/6

تمنا عمادی اور وسوسۂ شیطانی

مگر تمنا صاحب کا وسوسۂ شیطانی دیکھیے، لکھتے ہیں:

''میرا گمان یہ ہے کہ جس مطبع میں کتاب میزان الاعتدال چھپی تھی اس کے کارکنوں میں سے کسی نے تحریف کر دی ''بخبر'' کے بعد ''باطل'' کا اضافہ کر دیا۔ اس کی مثال اس کتاب میں اور بھی ملتی ہے۔ موسیٰ بن إسماعيل أبو سلمة النقرى التبوذكي کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ نے ابن خراش کا قول لکھا ہے کہ صدوق وتكلم الناس فيه، اس کے بعد محرف نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے کہ «قلت نعم تكلموا فيه بأنه ثقة ثبت يا رافضي» یہ ''یا رافضی'' کا فقرہ استفہامیہ جس بے ساختگی سے محرف کے قلم سے نکل گیا ہے اس کی عجمیت اور غصہ دونوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ کلمہ ''یا'' حرفِ تردید فارسی زبان کا لفظ ہے امام ذہبی سے کیا ممکن ہے کہ وہ فارسی حرف تردید عربی عبارت میں لے آئیں۔''[1]

ہم عرض کر آئے ہیں کہ ''خبر باطل'' کا جملہ میزان کی طباعت سے عرصہ دراز پہلے حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں نقل کیا ہے۔ بتلایئے اس کے بعد تمنا صاحب کے ''گمان'' کو ہم وسوسہ شیطانی نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ شیخ علی بن محمد البجاوی کی تحقیق سے طبع ہونے والا نسخہ، جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ میزان کے نسخہ مطبوعہ، جس کا تمنا صاحب نے حوالہ دیا ہے، کے علاوہ دو قدیمی خطی نسخوں کے تقابل اور لسان المیزان کے تقابل سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ شیخ البجاوی جا بجا نسخوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں، مگر یہاں موسیٰ بن سہل کے ترجمہ میں کوئی اختلاف ذکر نہیں کرتے۔ یہ بھی اس بات کی برہان ہے کہ تمنائی دعویٰ محض شیطانی وسوسہ ہے۔ میزان الاعتدال کیا المغنی[2] میں بھی حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ''خبر کذب'' جھوٹی خبر قرار دیا ہے اور موسیٰ کو مجہول کہا ہے۔ کیا یہاں بھی کوئی تحریف

---

[1] امام زہری وطبری: 404,405 [2] المغنی: 683/2

ہوئی ہے؟

رہی بات موسیٰ بن اسماعیل ابوسلمہ التبوذکی کے حوالے کی، تو اس نے ہمیں چونکا دیا اور تمنا صاحب کے بارے میں ان کی عربی ادب اور رجال کی معرفت کے بارے میں جو بھرم تھا وہ بھی تار تار ہوگیا۔ اور منکرین حدیث جو انھیں ''محدث العصر اور جامع العلوم'' کے القاب سے متعارف کراتے ہیں یقیناً اس کو بھی دھچکا لگا۔ آپ علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا مکمل کلام دیکھیے، پھر فیصلہ کیجیے کہ تمنا صاحب اپنے دعویٰ میں کس قدر سچے ہیں:

قلت: لم أذكر أباسلمة للين فيه لكن لقول ابن خراش فيه، صدوق وتكلم الناس فيه، قلت: نعم تكلموا فيه بأنه ثقة ثبت يا رافضي.①

''میں (علامہ ذہبی رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ میں نے ابوسلمہ کو کسی کمزوری کی بنا پر ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف ابن خراش کے اس قول کی بنا پر ذکر کیا ہے: وہ صدوق ہے لوگوں نے اس میں کلام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے کہ وہ ثقہ ثبت ہے اے رافضی''

''یا رافضی'' اے رافضی، سے مراد خود ابن خراش ہیں۔ ''یا'' حرف تردید فارسی کا نہیں، بلکہ عربی کا حرف ندا ہے۔ ابن خراش جن کا نام عبدالرحمٰن بن یوسف ہے وہ گو بڑے حافظ تھے، مگر رافضی تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر کے مثالب پر اسی نے کتاب لکھی اور رقم سرائی، اسی کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے۔ «كان علمه وبالا وسعيه ضلالا نعوذ بالله من الشقاء» اس کا علم وبال اور کوشش گمراہی ہے اس بدبختی سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔②

میزان③ میں بھی انھوں نے فرمایا کہ «هذا والله الشيخ المعثر الذي ضل

① میزان: 200/4 ② السیر: 510/13 ③ میزان: 600/2

ســیئــہ" اللہ کی قسم یہ وہ الٹا گرا ہوا شیخ ہے جس کی سعی گمراہی ہے۔ اسی ابن خراش رافضی نے امام ابوسلمہ موسیٰ بن اسماعیل التبوذکی کے بارے میں کہا کہ لوگوں نے اس میں کلام کیا ہے تو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا: اے رافضی لوگوں نے کلام کیا ہے: کہ وہ ثقہ ثبت ہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ تمنا صاحب اسے فارسی کا "یا" حرفِ تردید سمجھتے ہیں۔ سوچیے کہ اتنی سیدھی اور صاف بات کو بگاڑنے میں تمنا صاحب کو کتنا کمال حاصل ہے جناب من۔

سخن شناسی عالم بالا معلوم شد

اس لیے نہ میزان میں موسیٰ بن اسماعیل التبوذکی کے ترجمہ میں کوئی تحریف ہے نہ ہی موسیٰ بن سہل کے ترجمہ میں۔ تمنا صاحب کا اپنا ذہن مسموم اور جادۂ مستقیم سے دور ہے۔ اس لیے انھیں سیدھی بات بھی غلط اور محرف نظر آتی ہے۔

۳۔ موسیٰ بن سہل الرازی کو موسیٰ بن سہل بن ہارون الرازی قرار دینے میں تمنا صاحب کا انحصار میزان پر تھا، مگر میزان میں اس کے بارے میں جو تأثر تھا اسے غلط ثابت کرنے کے لیے بلا دلیل میزان میں تحریف کا دعویٰ کر دیا۔ اور اس کے برعکس موسیٰ بن سہل کو ثقہ بنانے کے لیے محدث ڈیانوی کے کسی "فضائل شیخین" رسالہ کا سہارا لیا۔ غالب گمان یہی ہے کہ محدث ڈیانوی کا یہ سہارا بھی تمنائی دعویٰ ہے۔ مولانا عزیر شمس حفظہ اللہ نے "حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ" میں حضرت ڈیانوی کی مطبوعہ اور قلمی تصانیف کی تفصیل بیان کی ہے، جن میں اس نام کے کسی رسالہ کا انھوں نے ذکر نہیں کیا، بلکہ حضرت ڈیانوی کے فتاویٰ کو بھی انھوں نے جمع کیا جو ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فتاویٰ و رسائل پر مشتمل ہے اس میں بھی اس موضوع کا کوئی رسالہ انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے محدث ڈیانوی کی طرف منسوب کرنا محض تمنائی دعویٰ ہے۔ پھر اس کے مندرجات بھی ہمارے اس موقف کے مؤید ہیں۔

۴۔ تمنا صاحب کا فرمانا کہ مولانا ڈیانوی نے موسیٰ بن سہل الرازی کو ثقہ ثابت کیا ہے

اور لکھا ہے کہ موسیٰ بن سہل یہ حدیث سفیان ثوری اور اسحاق الازرق دونوں سے روایت کرتے ہیں۔ موسیٰ بن سہل جن کی وفات امام بخاری نے ۲۰۰ھ سے قبل لکھی ہے سے سہل ابن بکار بن بشر الدارمی نے یہ روایت بیان کی ہے جو ثقہ تھے۔

اولاً: عرض ہے کہ تمنا صاحب نے یہ ذکر قطعاً نہیں کیا کہ مولانا ڈیانوی رحمہ اللہ نے موسیٰ بن سہل الرازی کو جو ثقہ ثابت کیا ہے اس بارے میں انھوں نے کن ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال نقل کیے ہیں۔ جب کسی سے اس کی توثیق منقول ہی نہیں تو اسے ''ثقہ ثابت'' کرنے کے کیا معنی؟ تمنا صاحب تو اس دنیا سے چل بسے اب یہ فریضہ ان کے حواریوں کا ہے کہ مولانا ڈیانوی کے حوالے سے یا براہِ راست موسیٰ بن سہل الرازی کی کسی امامِ جرح و تعدیل سے توثیق ثابت کریں۔

ثانیاً: یہ کہنا کہ موسیٰ بن سہل الرازی یہ حدیث سفیان ثوری اور اسحاق الازرق دونوں سے روایت کرتے ہیں قطعاً غلط ہے۔ پہلے میزان ہی کو دیکھیے جس کے حوالے سے تمنا صاحب نے خود یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں اس کی سند یوں ہے:

موسى بن سهل بن هارون الرازي عن إسحاق الأزرق بخبر باطل عن الثوري عن أبي إسحاق» [1]

ہر دیدۂ و بینا دیکھ سکتا ہے کہ موسیٰ بن سہل نے یہ روایت اسحاق سے اور اسحاق نے سفیان ثوری سے اور انھوں نے ابو اسحاق سے بیان کی ہے۔ یہ سند اسی طرح تاریخ بغداد [2] العلل المتناھیہ [3] اللآلی المصنوعہ [4] میں ہے۔ البتہ وہاں موسیٰ بن سہل ابو ہارون الرازی ہے اور ایک مقام پر الرازی کی بجائے الفزاری ہے اور ابو ہارون کی بجائے ''بن ہارون'' ہے جیسا کہ میزان اور لسان میں ہے۔ مگر تاریخ بغداد میں ابو ہارون ہی ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے الضعیفہ [5] میں اسے ذکر کیا اور اسے باطل قرار دیا ہے۔ موسیٰ بن سہل اسے صرف اسحاق

---

[1] میزان: 206/4 [2] تاریخ بغداد: 313/2، 41/13 [3] العلل: 193/1 [4] اللآلی المصنوعة: 309/1 [5] الضعیفه: 389/11، رقم: 5240

الازرق سے روایت کرتے ہیں، سفیان سے قطعاً نہیں۔

ثالثاً: یہ کہنا کہ موسیٰ بن سہل سے یہ روایت سہل بن بکار بن بشر الدارمی نے کی ہے جو ثقہ تھے، یہ بات بھی قطعاً غلط ہے۔ موسیٰ بن سہل سے محولہ بالا کتب میں محمد بن عبدالرحمٰن البغدادی روایت کرتے ہیں سہل بن بکار نہیں۔ تمنائی فکر کے حاملین پر یہ بھی قرض ہے کہ وہ دکھائیں کہ موسیٰ بن سہل سے یہ روایت سہل بن بکار روایت کرتے ہیں؟

رابعاً: اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کرنا کہ موسیٰ بن سہل کی وفات ۲۰۰ھ سے قبل ہوئی ہے، محض دعویٰ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی التاریخ الکبیر ہو یا الاوسط جسے بعض حضرات التاریخ الصغیر بھی کہتے ہیں ان میں موسیٰ بن سہل کا سرے سے ترجمہ ہی نہیں اور امام بخاری کے بعد بھی کسی نے موسی بن سہل کا ترجمہ ذکر نہیں کیا اگر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ اور تاریخ وفات ذکر کی ہو اور ان کے بعد کے حضرات اس حوالے سے کوئی بات نقل نہ کریں تو یہ بڑے اچنبھے کی بات ہوئی۔

الغرض محدث ڈیانوی کے حوالے سے تمنا صاحب نے جو کچھ نقل کیا، ظلمات بعضها فوق بعض کا مصداق ہے۔ اور موسیٰ بن سہل الرازی کے حوالے سے ان کے دعاوی بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک تو ابن جریر رحمہ اللہ کے رجال کے تتبع کا انحصار تہذیب، میزان اور لسان المیزان پر کرنا نہایت بچگانہ حرکت ہے اور علمی ثقاہت کے منافی ہے۔ ان کتب میں اگر کسی کا ترجمہ نہیں ملتا تو محض اسی بنیاد پر صاحب کتاب پر وضع اسناد کا الزام بدترین جسارت ہے۔ اس لیے موسیٰ بن سہل الرازی ہوں یا کوئی اور راوی، اگر ان میں سے کسی کا ترجمہ نہیں ملتا تو انھیں زیادہ سے زیادہ مستور یا مجہول کہا جا سکتا ہے۔ طبرانی، دارقطنی اور بیہقی کے کتنے رجال ہیں جن کے تراجم نہیں ملتے، تو کیا بس اسی بنا پر کہا جائے گا کہ ان حضرات نے یہ سند خود بنالی ہے؟ قطعاً نہیں...... امام ابن جریر رحمہ اللہ کی تفسیر ہو یا تاریخ، اس کے رجال کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح ہے۔

مزید ضروری وضاحت

تمنا صاحب نے شیخ شاکر رحمہ اللہ کی تحقیق سے طبع شدہ تفسیر ① سے امام ابن جریر کے استاد موسیٰ بن سہل الرازی کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کی حقیقت قارئین کرام کے سامنے ہے۔ شیخ شاکر رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے تحت لکھا ہے کہ مخطوطہ میں ''موسیٰ بن سہل'' کی بجائے ''سہل بن موسیٰ'' ہے لیکن سہل بن موسیٰ کا ترجمہ بھی ہمیں نہیں ملا۔ مگر البقرہ کی آیت (۲۲۳) کے تحت ② اسی سہل بن موسیٰ الرازی سے روایت ہے۔ اور اس کے تحت انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ پہلے رقم ③ میں جو موسیٰ بن سہل الرازی ہے وہ غلط ہے درست یہی ہے کہ وہاں بھی سہل بن موسیٰ الرازی ہو جیسا کہ نسخہ مخطوطہ میں ہے۔ اور سہل بن موسیٰ دراصل سہل بن ابی سہل الرازی ہیں جن کا ترجمہ تاریخ بغداد ④ میں ہے جو ۲۳۱ھ میں بغداد وارد ہوئے۔ اسی سہل سے تاریخ میں بھی کئی مقامات پر روایات ہیں۔ مزید عرض ہے کہ اسی سہل بن موسیٰ الرازی سے سورۃ النساء کی ایک آیت ⑤ کی تفسیر کے تحت ⑥ بھی روایت ہے، بلکہ شیخ عبداللہ الترکی کی تحقیق سے تفسیر کا جو نسخہ مختلف نسخوں کی مراجعت سے طبع ہوا ہے اس میں پہلی زیرِ بحث حدیث ⑦ کی روایت میں بھی ''سہل بن موسیٰ الرازی'' ہی ہے۔ جس سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ امام ابن جریر کے استاد سہل بن موسیٰ ہیں موسیٰ بن سہل نہیں۔ جس سے تمنا صاحب کی سب داستان محض خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ والحمد للہ علی ذلک

قارئین کرام! تفسیر ابن جریر کے حوالے سے جو اعتراضات تمنا صاحب نے امام ابن جریر رحمہ اللہ پر کیے ان کی حقیقت معلوم کر لینے کے بعد اب آیئے ان رجال واسانید کا جائزہ بھی لے لیجیے جو انھوں نے امام ابن جریر رحمہ اللہ کو معاذ اللہ وضاع ثابت کرنے کے لیے تاریخ طبری سے پیش کیے ہیں۔

① تفسیر، رقم: 180 ② 401/4، رقم: 4319 ③ رقم: 180 ④ تاریخ بغداد: 118/9 ...
⑤ النساء: 36 ⑥ رقم: 9482، 344/8 ⑦ رقم: 180

(۱۶) ابوالاحوص

تمنا صاحب نے تاریخ طبری [1] سے ایک سند یوں ذکر کی ہے:

حدثنا أبو الأحوص عن أبي إسحاق عن عامر بن سعد.

اور فرمایا ہے کہ ابو اسحاق کے تلامذہ میں ایک ہی نام ابوالاحوص سلام بن سلیم متوفی ۱۷۹ھ ہے۔ ولادتِ ابن جریر سے ۴۵ برس پہلے۔ [2]

بلا شبہ ابو الاحوص سلام بن سلیم المتوفی 179ھ سے امام ابن جریر رحمہ اللہ روایت نہیں کر سکتے، بلکہ وہ ان سے ایک یا دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر ابن جریر [3] میں وہ محمد بن عبید المحاربی کے واسطے سے ابوالاحوص سے روایت کرتے ہیں۔ اور محمد بن عبید کے ترجمہ میں صراحت ہے کہ وہ ابوالاحوص سلام بن سلیم سے اور ان سے محمد بن جریر طبری روایت کرتے ہیں۔ [4]

اسی طرح تفسیر [5] میں امام طبری ابوالاحوص سے دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

حدثنا القاسم قال حدثنا الحسين قال ثنا أبو الأحوص

یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ امام ابن جریر، ابوالاحوص سے براہِ راست نہیں، بلکہ ایک یا دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں۔ اور تاریخ طبری میں یہاں واسطہ ساقط ہے۔ اسانید میں سقوط و خطا تو متداول کتب میں بھی پائی جاتی ہے۔ تاریخ طبری کی طباعت میں اگر ایسا تساہل پایا جاتا ہے تو اس پر کوئی مبتدی ہی تعجب کر سکتا ہے۔

(۱۷) ہشام بن محمد

تمنا صاحب نے تاریخ [6] کے حوالے سے نقل کیا ہے:

---

[1] طبری: 47/4 [2] امام زہری وطبری: 393 [3] تفسیر ابن جریر: 266/2، 89/10، 73/15، 100/16 [4] التہذیب للمزی: 36,37/17 [5] تفسیر: 100/16 [6] تاریخ: 207/3

حدثني هشام بن محمد عن أبي مخنف

اور فرمایا ہے کہ ابو مخنف سے روایت کرنے والا ہشام بن محمد بن السائب الکلبی التوفی 204ھ ہے۔ ولادتِ ابن جریر سے بیس برس پہلے۔[1]

ہمیں اعتراف ہے کہ محولہ صفحہ میں اسی طرح «حدثني هشام» ہے، مگر تمنا صاحب پلٹ کر اس سے چند صفحات پہلے دیکھ لیتے تو شاید یہ اعتراض نہ کرتے۔ چنانچہ جلد[2] میں مسلسل فرماتے ہیں: «حدثت عن هشام بن محمد» یعنی صیغۂ تمریض سے کہ مجھے اس سے روایت بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح تاریخ جلد ۲[3] وغیرہ میں بھی حدثت عن هشام ہے۔ اس لیے حدثنی بھی طباعتی غلطی ہے جیسا کہ ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔

(۱۸) زکریا بن عدی

اسی طرح تاریخ طبری[4] کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حدثني زكريا بن عدي قال حدثني عبيد الله بن عمرو عن ابن عقيل.

اور فرماتے ہیں زکریا بن عدی کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی۔ ولادتِ ابن جریر سے بارہ یا تیرہ برس پہلے۔[5]

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تمنا صاحب نے صحیح ہی نقل کیا ہوگا، مگر ہمارے سامنے جو نسخہ دار القاموس الحدیث سے طبع ہوا ہے اس میں اسی صفحہ[6] پر حدثني زكريا نہیں حدثت عن زكريا ہے۔ بتلایئے اب کیا اشکال ہے؟ اس سے تو ہمارے سابقہ موقف کی تائید ہوتی ہے کہ تاریخ طبری میں طباعتی اغلاط موجود ہیں۔

---

[1] امام زہری وطبری: 393 [2] 190,195,197/3 [3] تاریخ: 86,87,176/2 [4] تاریخ طبری: 145/5 [5] امام زہری وامام طبری: 396 [6] 145/5

(۱۹) الہیثم بن عدی

تمنا صاحب لکھتے ہیں تاریخ طبری[1] میں ہے: حدثنی هیثم بن عدی ہیثم کا ترجمہ میزان میں ہے ان کی وفات ۲۰۷ھ میں ہے۔ یعنی ابن جریر رحمہ اللہ کی پیدائش سے سترہ برس پہلے۔[2]

حسبِ سابق حقیقتِ حال یہاں بھی یہی ہے کہ اسی صفحہ کی آخری سطر[3] میں حدثت عن الهیثم بن عدی ہے حدثنی نہیں۔ اس لیے تمنا صاحب کا اعتراض بے بنیاد اور غلط نسخہ کی بنیاد پر ہے بشرطیکہ انھوں نے صحیح نقل کیا ہو۔

(۲۰) زکریا بن یحییٰ الضریر

تمنا صاحب تاریخ[4] کے حوالے سے حدثنا زکریا بن یحیی الضریر کی روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: زکریا بن یحییٰ الضریر تہذیب، تذکرہ، تاریخ صغیر میں کوئی نہیں، میزان[5] میں زکریا بن یحییٰ الکندی ہے جو عامر الشعبی سے روایت کرتا ہے، علامہ ذہبی نے کہا ہے کہ یہ ضریر یعنی نابینا تھے۔ بس یہی ایک زکریا بن یحییٰ الضریر ملتا ہے ان کی پیدائش ۹۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ اس کی ولادت اور ابن جریر کی ولادت کے درمیان ۱۳۴ برس کا فاصلہ ہے۔ سو برس کی عمر بھی پائی ہوگی تو ابن جریر کی پیدائش سے ۳۴ برس قبل وفات پائی ہوگی۔[6]

مگر یہ سب تمنا صاحب کی تمام ترلن ترانیوں کے باوجود بے خبری کا نتیجہ ہے۔ یہ زکریا بن یحییٰ الضریر اس کے علاوہ ہے جو امام ابن جریر رحمہ اللہ کے مشائخ کے طبقہ سے ہے۔ اور وہ ہیں زکریا بن یحییٰ بن ایوب ابو علی الضریر المدائنی البغدادی۔ خطیب بغدادی نے اس کا تذکرہ

---

① تاریخ طبری: 171/2 کی آخری سطر ② امام زہری وامام طبری: 397

③ 182/2 ④ تاریخ: 211،217/2 ⑤ میزان: 350/1

⑥ امام زہری وامام طبری: 397،398

تاریخ بغداد[1] میں کیا ہے جو محمد بن غالب التمتام، عبداللہ بن اسحاق المدائنی، یحییٰ بن صاعد، قاضی المحاملی اور امام بزار کے استاد ہیں۔ شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے الصحیحہ میں مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ پانچ ثقہ حضرات کا اس سے روایت لینا اس کے مقبول اور قابلِ اعتبار ہونے کے لیے کافی ہے۔[2] ان پانچ کے ساتھ چھٹے امام ابن جریر رحمہ اللہ بھی ملا لیجیے۔ لہٰذا تمنا صاحب کا اسے زکریا بن یحییٰ الکندی قرار دینا بھی غلط اور یہ کہنا کہ ''بس یہی ایک زکریا بن یحییٰ الضریر ملتے ہیں'' بنائے فاسد علی الفاسد کا مصداق ہے۔

(۲۱) محمد بن عمارۃ

تمنا صاحب نے تاریخ[3] سے ایک سند یوں ذکر کی ہے:

حدثني محمد بن عمارة قال حدثني عبيد الله بن موسى.

اور فرمایا ہے کہ تہذیب اور میزان میں دو، دو محمد بن عمارہ ہیں۔ اور ان میں سے کسی سے محمد بن جریر کا سماع ممکن نہیں۔[4]

بلاشبہ تہذیب میں جو دو راوی محمد بن عمارۃ ہیں اور میزان میں جو دو اسی نام کے راوی ہیں وہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے استاد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تہذیب میں محمد بن عمارۃ بن عمرو بن حزم الانصاری المدنی ہیں اور میزان میں بھی ایک تہذیب کا راوی ہے اور دوسرا محمد بن عمارہ اللیثی ہے۔ لیکن امام ابن جریر کے جو استاد محمد بن عمارۃ ہیں۔ خود امام ابن جریر نے کئی مقامات پر صراحت کی ہے کہ وہ ''الاسدی'' ہے۔ مثلاً تاریخ[5] ہی میں ہے: حدثني محمد بن عمارة الاسدی. اسی طرح تفسیر میں البقرہ کی آیت ۱۳۱ کی تفسیر روایت نمبر ۶۴۵ میں بھی محمد بن عمارۃ الاسدی ہے۔ اور البقرہ کی آیت: ۸۸ روایت نمبر ۱۵۱۱ میں بھی محمد ابن عمارۃ الاسدی ہے۔ اب یہ علم کی کون سی خدمت ہے کہ جو محمد بن عمارۃ ''الاسدی'' نہیں۔

---

[1] تاریخ بغداد: 457,458/8 [2] معجم أسامي الرواة الذين ترجم لهم العلامة الألباني: 50,51/2 [3] تاریخ: 205/5 [4] امام زہری و امام طبری: 401,402 [5] تاریخ: 1/ 44

ان کے بارے میں کہا جائے کہ ان سے تاریخی طور پر امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ روایت نہیں کر سکتے۔ شیخ شاکر رحمۃ اللہ علیہ کا تو خیال ہے کہ صحیح محمد بن عبادۃ الاسدی ہے۔ جو امام بخاری، ابوداود، بن خزیمہ وغیرہ کے استاذ ہیں۔ اس کی تفصیل شیخ نے تفسیر [1] البقرہ کی آیت نمبر ۱۳۵ کے تحت بیان کی ہے۔ اس لیے تمنا صاحب نے اپنی ہوسات باطلہ کے تحت جو کچھ فرمایا ہے، وہ بہر نوع غلط اور بے بنیاد ہے۔

قارئین کرام! یہ ہیں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اور تاریخ کے وہ اکیس راوی جن کے متعلق تمنائی دعویٰ یہ ہے کہ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اپنا شیخ ظاہر کیا اور حدثنی یا حدثنا سے ان کی روایات نقل کی ہیں۔ حالانکہ وہ سب امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اور اسے انھوں نے امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے وضاع اور کذاب ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ مگر ان کے اس دعویٰ کی حقیقت آپ بحمد اللہ معلوم کر چکے، ہماری وضاحت سے تو الٹا تمنا صاحب کی کذب بیانی، دھوکہ دہی، فریب کاری اور جہالت و بے خبری قدم قدم پر ظاہر ہو رہی ہے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اس الزام سے بری ہیں۔

چند اور راوی

اسی طرح تمنا صاحب نے سری بن یحییٰ، عمر بن شبہ، محمد اور طلحہ وغیرہ چند راویوں پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان کے بارے میں اپنے روایتی کردار کا مظاہر کیا ہے۔ جس کا جواب حضرت مولانا عبدالخالق قدوسی مرحوم نے الاعتصام ۱۴، ۲۱ جولائی ۱۹۶۷ء کے دو شماروں میں دیا۔ جس کا عنوان تھا۔ ''تاریخ ابن جریر طبری اور تلبیسات تمنا عمادی'' جس میں انھوں نے احقاقِ حق کا حق ادا کر دیا اور کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا۔ جزاہ اللہ أحسن الجزاء عنا وعن جمیع المسلمین.

تمنا صاحب کے اعتراضات منکرینِ حدیث کے ماہوار ترجمان ''طلوع اسلام'' میں

---

[1] 105 رقم: 2092

شائع ہوئے تھے۔ یہ اعتراضات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ مولانا قدوسی مرحوم کے تعاقب کے جواب میں کوئی بات اس میں نہیں۔ البتہ سری بن یحییٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ایک معترض صاحب نے سری بن یحییٰ الکوفی کا سالِ وفات تقریباً ۲۸۰ بلا دلیل لکھا ہے۔'' بلکہ ان کے بارے میں تمنا صاحب کی تحقیق انیق یہ ہے: ابو عبیدہ سری بن یحییٰ کو خطیب سے پہلے کسی نے رعایتاً صرف ثقہ، بلکہ لا بأس بہ بھی نہیں کہا، کسی نے ان کو منہ نہیں لگایا، اس قابل نہیں سمجھا کہ محدثین کے زمرہ میں ان کا ذکر کیا جائے۔ کسی نے ابن ابی حاتم کے سوا کبھی ان کا نام تک نہ لیا، وہ ایک مجہول الحال ہے۔ ①

سری بن یحییٰ الکوفی کے بارے میں اسی قسم کی باتیں انھوں نے جا بجا کیں۔ ان کی یہ باتیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے تمنا صاحب ناول نگاری کر رہے ہیں یا کوئی ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔ بس خیالی قصے اور فرضی نتیجے ہیں، ساری داستان کا خلاصہ یہی ہے، بلکہ ان کے دیگر تمنائی دعووں کی طرح یہاں بھی دعویٰ یہ ہے کہ ''یہ سری بن یحییٰ بصری ہے جس کی وفات ۱۶۷ھ میں ہوئی تھی، یعنی ابن جریر کی پیدائش کے ۶۷ برس پہلے، اور سری بن یحییٰ البصری کے سوا کوئی دوسرا سری بن یحییٰ دنیائے رجال میں نہیں ہے۔'' ②

اتنے وثوق کے بعد انھیں ابو عبیدہ سری بن یحییٰ تمیمی کوفی راوی بھی نظر آ گیا، مگر ان کے بارے میں ان دعاوی کا خلاصہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ ہمارے مولانا قدوسی مرحوم نے قرائن سے سری بن یحییٰ تمیمی کی وفات تقریباً ۲۸۰ھ لکھی تھی۔ تمنا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ''بلا دلیل'' ہے، بلکہ ۲۷۰ھ کے بعد ۲۷۵ھ سے پہلے سری بن یحییٰ کی وفات ہوئی۔'' ③

عرض ہے کہ اتنا تو تسلیم کر لیا کہ سری بن یحییٰ کی وفات ۲۷۰ اور ۲۷۵ھ کے مابین ہوئی ہے۔ جب وہ یہ حقیقت تسلیم کر چکے ہیں تو امام ابن جریر جو ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے ان کے اور سری کے مابین مکاتبت کیوں ناممکن ہے؟

تمنا صاحب کی اس بحث میں تضاد بیانی اور پریشان خیالی کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف

---

① امام زہری و امام طبری: 373،374،376 ② ایضاً: 342 ③ ایضاً: 374

لکھتے ہیں کہ ’’سری کی وفات ۲۷۰ کے بعد ۲۷۵ھ سے پہلے ہوئی۔‘‘ (1) مگر چند صفحات بعد (2) لکھتے ہیں ’’یقیناً ابن ابی حاتم کی وفات سے تقریباً بیالیس برس پہلے سری بن یحییٰ تمیمی کی وفات ہو چکی ہوگی۔‘‘ امام ابن ابی حاتم کی وفات ۳۲۷ھ میں ہوئی۔ بیالیس سال اس سے نفی کریں تو سری بن یحییٰ کی وفات گویا ۲۹۵ھ میں ہوگی۔ بتلایئے ان تخمینی پینتروں کی بھی کوئی حد ہے؟ حالانکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے صاف طور پر ان کی وفات ۲۷۴ھ میں لکھی ہے ان کے الفاظ ہیں:

توفي في المحرم لسبع بقين من سنة أربع وسبعين ومائتين. (3)

’’محرم کے سات دن باقی تھے کہ ۲۷۴ھ میں وہ فوت ہوئے۔‘‘

یہ ہے دلیل ان کے سنِ وفات کی۔ غور فرمایئے سن ہی نہیں مہینہ، دن بھی اس سے معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک دلیل ہے سری بن یحییٰ کی عظمت کی، وفات کی تعیین میں اتنا اہتمام کبار علمائے محدثین کے لیے تو نظر آتا ہے صغار یا مجہولین کے ساتھ یہ اعتنا نہایت عنقا ہے۔ بہرحال سری بن یحییٰ تمیمی ۲۷۴ھ میں فوت ہوئے اور ان سے امام ابن جریر رحمہ اللہ کی مکاتبت قطعاً محال اور ناممکن نہیں۔

سری بن یحییٰ کا تذکرہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے الجرح والتعدیل (4) میں کیا اور اسے صدوق قرار دیا ہے۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد (5) میں انھیں ’’شیخ جلیل‘‘ اور ’’ثقہ‘‘ قرار دیا۔ جس کا اعتراف تمنا صاحب کو بھی ہے گو وہ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ امام ابن ابی حاتم کے علاوہ ابن حبان نے بھی الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں۔

السري بن يحيى بن السري أبو عبيدة الكوفي ابن أخي هناد

---

(1) 374 (2) 380 (3) تاریخ اسلام: 253/18 (4) الجرح والتعدیل: 285/2 (5) تاریخ بغداد: 264/4

ابن السری یروي عن عبید اللہ بن موسیٰ وأبی نعیم حدثنی عنہ محمد بن سعید بن المنذر وغیرہ۔ [1]

اس لیے تمنا صاحب کا یہ کہنا کہ "ان کے بعد سو برس تک کسی نے ابن ابی حاتم کے سوا کبھی ان کا نام تک نہ لیا۔" قطعاً غلط اور حقیقت سے بے خبری کی واضح برہان ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے تاریخ اسلام میں ان کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

روی عن أبی نعیم وقبیصۃ وأبی غسان وأحمد بن یونس وطبقتھم، وروی عنہ أبوذر محمد بن محمد بن یوسف وعبداللہ ابن جامع الحلوانی بن عقدۃ وأبو نعیم بن عدی وخیثمۃ الأطرابلسی وطائفۃ، قال ابن أبی حاتم: کان صدوقا۔ [2]

بلکہ امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق المتوفی 316ھ بھی سری بن یحییٰ کے شاگرد ہیں۔ اور انھوں نے اپنی المسند المستخرج علی مسلم [3] میں ان سے روایت لی ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ امام ابوعوانہ کے نزدیک بھی سری بن یحییٰ ثقہ وصدوق ہیں۔ امام خیثمہ بن سلیمان الاطرابلسی کی حدیثِ خیثمہ میں متعدد روایات سری سے منقول ہیں۔ نیز دیکھیے السیر۔ [4] امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی السنن [5] میں ابو العباس محمد بن یعقوب ثنا السری بن یحییٰ عن ابی نعیم کی سند سے روایت بیان کی ہے۔ امام ابونعیم نے بھی دلائل النبوہ [6] میں اس کی روایت ذکر کی ہے۔ اس وضاحت سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ سری بن یحییٰ التمیمی ابوعبیدہ قطعاً مجہول نہیں، جیسا کہ تمنا صاحب نے اپنی جہالت میں کہا ہے، بلکہ وہ معروف محدث ہیں اور ان کے جن شیوخ اور تلامذہ کا ذکر حافظ ابن حبان رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کیا ہے ان کے علاوہ بھی ان کے شیوخ وتلامذہ کی

---

[1] الثقات: 302/8 [2] تاریخ اسلام: 353/18 [3] المسند المستخرج علی مسلم: 250,300/2 [4] السیر: 414/15 [5] السنن: 104/5 [6] دلائل النبوہ: 574/2

فہرست موجود ہے۔ضرورت محسوس ہوئی تو ان شاءاللہ ان کی نشان دہی بھی کردی جائے گی۔ کسی بھی راوی کے تمام شیوخ واساتذہ کا متداول کتب میں استیعاب نہیں اور نہ ہی ان کے مؤلفین نے اس کی صراحت کی ہے۔اس لیے تمنا صاحب کا اس نوعیت کا مطالبہ کہ فلاں راوی کے شاگردوں میں فلاں کا ذکر نہیں یا فلاں کے اساتذہ میں فلاں کا ذکر نہیں محض مجادلانہ دھوکا ہے۔ جب ان کے مؤلفین نے اس نوعیت کی کوئی شرط نہیں لگائی تو ان پر قناعت اور اسی بنیاد پر اعتراض نہایت سطحیت پر مبنی ہے۔

تک بندی اور غلط بیانی

تمنا صاحب سیف بن عمر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''سیف کے بارے میں اسی قدر لکھا ہے کہ بہ زمانہ خلافت ہارون الرشید اس نے وفات پائی، ہارون کی خلافت ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک رہی۔ انھی ۲۳ برس کے اندر کسی سال سیف بن عمر نے وفات پائی۔ تقریب میں جو ان کو گیارھویں طبقے میں شمار کیا ہے معلوم نہیں کس حساب سے؟ اس لیے کہ گیارھویں طبقہ کے محدثین کی وفات عموماً چوتھی صدی کے نصف اول میں ہوتی ہے۔ اس لیے ہارون کی خلافت میں ان کی وفات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

مختصر یہ کہ ۱۰۰ھ سے ۱۰۶ھ تک کے اندر سیف بن عمر کی ولادت اور ۱۸۰ھ سے لے کر ۱۹۲ھ تک کے اندر ان کی وفات تسلیم کی جائے تو کسی قسم کا اعتراض واقع نہیں ہوتا۔[1]

قارئین کرام! سیف بن عمر کے حوالے سے جو کچھ تمنا صاحب نے لکھا اس کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے۔ حافظ ابن حجر کا قول تقریب سے نقل کیا کہ سیف گیارھویں طبقے کا راوی ہے۔ اسے بنیاد بنا کر، دوسرے قول کہ سیف، ہارون الرشید کی خلافت کے زمانے میں فوت ہوا کے ساتھ تعارض ثابت کیا اور پھر حسبِ روایت اس کے شیوخ کے حوالے سے سخن سازی شروع کر دی۔ حالانکہ تقریب کے حوالے سے گیارھویں طبقے کے رواۃ میں شمار کرنا اور پھر

[1] امام زہری و امام طبری: 381,382

یہ کہنا کہ ''گیارھویں طبقے کے محدثین کی وفات عموماً چوتھی صدی کے نصف اول میں ہوتی ہے۔'' دونوں غلط اور تمنا صاحب کی لن ترانیوں کا منہ چڑانے کے مترادف ہیں۔ تقریب التہذیب کے سات نسخے اس عاجز کے سامنے ہیں:

۱۔ طبع الفاروقی دہلی

۲۔ طبع نولکشور لکھنؤ

۳۔ طبع دارالمعرفہ بیروت

۴۔ دارنشر الکتب الاسلامیہ لاہور

۵۔ بیت الافکار الدولیہ

۶۔ مکتبہ شان اسلام، پشاور

۷۔ دارالعاصمہ الریاض

جو سات نسخوں کے تقابل سے طبع ہوا۔ جن میں ایک نسخہ خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے محقق ہیں شیخ ابوالاشبال احمد شاغف حفظہ اللہ۔ ان ساتوں میں ایک ہی عبارت ہے:

من الثامنة مات في زمن الرشيد

''کہ سیف بن عمر آٹھویں طبقے کا ہے زمانہ ہارون رشید میں فوت ہوا۔''

یہ گیارھویں طبقہ کا ذکر معلوم نہیں کہاں سے آگیا۔ ممکن ہے کہ تقریب کا جو نسخہ تمنا صاحب کے پیش نظر ہو اس میں گیارھواں طبقہ لکھا ہوا ہو۔ لیکن مغز ماری سے پہلے اتنا تو انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ گیارھویں طبقے کا راوی ہارون رشید کے دور میں وفات کیوں کر پا سکتا ہے؟ کسی اور نسخہ یا کتاب کی مراجعت فرما لیتے تو اتنی زحمت انھیں نہ اٹھانی پڑتی۔ پھر یہ بات بڑی ہی عجیب کہی کہ ''گیارھویں طبقے کے محدثین کی وفات عموماً چوتھی صدی کے نصف اول میں ہوتی ہے'' کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ تقریب کے طبقات کی تقسیم تو اس کے مصنف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بنائی۔ ان طبقات کی تعیین بھی انھی سے معلوم کرنی

چاہیے۔ یہ خودساختہ تعیین چہ معنی دارد؟

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ «وإن كان من التاسعة إلى آخر الطبقات فهو بعد المائتين» اگر نو سے بعد کے (بارہ تک) طبقات ہیں تو ان کے راویوں کی وفات دوسو (سال) کے بعد ہوگی۔ مزید یہ کہ تقریب میں صرف اصحاب صحاح ستہ کے رجال ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ۲۵۶ھ میں، امام مسلم رحمہ اللہ ۲۶۱ھ میں، امام ترمذی رحمہ اللہ ۲۷۹ھ میں، امام ابوداود رحمہ اللہ ۲۷۵ھ میں، امام نسائی رحمہ اللہ ۳۰۳ھ میں اور امام ابن ماجہ رحمہ اللہ ۲۷۳ھ میں فوت ہوئے۔ ان شیوخ اور ان کی تصانیف کے راویوں میں کسی کے بارے میں کہنا کہ وہ چوتھی صدی کے نصف اول میں فوت ہوئے ہیں رجال واسانید کے علم سے بے خبری کی انتہا ہے۔

تمنا صاحب کو تو منکرینِ حدیث کے طبقہ میں ''محدث العصر اور جامع العلوم'' سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہاں ان کے علم وفضل کے غبارے سے ہوا نکلی جا رہی ہے۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سیف بن عمر کو گیارھویں نہیں، بلکہ آٹھویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔ جن کے بارے میں خود انھوں نے فرمایا ہے کہ «إن كان من الثالثة إلى آخر الثامنة فهم بعد المائة» اگر راوی طبقہ ثالثہ سے ثامنہ تک کا ہوگا تو ان کی وفات ایک سو کے بعد ہے۔ اس لیے سیف بن عمر کی وفات ایک سو سال کے بعد عہدِ ہارون رشید میں ہوئی ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے السیر میں ۱۷۱ھ سے ۱۸۰ھ کے مابین انتقال کرنے والے حضرات میں سیف بن عمر کو ذکر کیا ہے۔[1]

علامہ صلاح الدین الصفدی نے بھی لکھا ہے «توفي في حدود الثمانين ومائة» کہ وہ ۱۸۰ھ کی حدود میں فوت ہوئے۔[2] جس سے تمنا صاحب کے فرضی نتائج تار تار ہو جاتے ہیں۔ ہماری اس مختصر وضاحت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ

[1] تاریخ الإسلام: 161,162/9 [2] الوافي بالوفيات: 66/16

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے حوالے سے ان کی یہ "تحقیق انیق" مفروضات پر مبنی ہے، بلکہ دجل وفریب کا مجموعہ اور تدلیس وتلبیس کا پلندہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر گامزن فرمائے اور سبیلِ مومنین میں نقب زنی کرنے والوں سے محفوظ رکھے، آمین۔

ضروری وضاحت

علامہ تمنا عمادی کا نام "حیات الحق" تھا اور ان کا تعلق ہندوستان کے مشہور خانوادۂ علم یعنی خاندان پھلواری سے تھا۔ پھلواری کے خانقاہی ماحول میں تشیع کے اثرات تھے مگر اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود تمنا صاحب علم وتحقیق کے بعد تشیع کی تردید میں کمربستہ ہو گئے۔ حتی کہ اس کی تردید میں حد اعتدال سے باہر ہو گئے۔ امام زہری رحمہ اللہ اور امام ابن جریر رحمہ اللہ کے علاوہ جن راویوں میں تشیع کا لاحقہ دیکھا تو آگ بگولہ ہو گئے۔ انکارِ حدیث کے جذبہ نے انھیں دوآتشہ کر دیا مگر پھر ایک دور وہ بھی آیا جس میں انھوں نے حدیث کو غیر متلو قرار دیا اور اس سے انکار کو قرآنِ مجید کا انکار قرار دیا۔ "وحی متلو اور غیر متلو قرآنی تقسیم ہے" کے عنوان پر ایک طویل مضمون ماہنامہ فاران کراچی جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع کروایا۔ یوں ان کی کچھ راہیں منکرینِ حدیث سے جدا ہو گئیں۔ ہمارے علم دوست مولانا محمد تنزیل الصدیقی صاحب نے مجلہ الواقعہ کراچی اپریل مئی ۲۰۱۲ء میں ایک مضمون "کیا تمنا عمادی منکر حدیث تھے" کے عنوان سے لکھا جس میں ان کا رجحان یہی ہے کہ آخری دور میں وہ منکر حدیث نہ تھے۔ لیکن منکرین حدیث ان کی تحریروں کو بدستور شائع کر کے گمراہی کی راہیں پھیلا رہے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے بارے میں بھی اعتراضات اسی کی صدائے بازگشت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل دوزخی ہے؟

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قاتل عمار وسالبه في النار.

"عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل اور ان کا سامان چھیننے والا آگ میں ہے۔"

اور یہ بات بھی منقول ہے کہ جنگِ صفین میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ نے شہید کیا تھا۔[1]

حضرت ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ صحابی ہی نہیں، بلکہ ان کا شمار ان صحابہ میں کیا گیا ہے۔ جو صلح حدیبیہ میں شامل تھے۔ جیسا کہ محمد بن حبیب البغدادی نے المحبر[2] میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ «يقال شهد الحديبية» "کہا گیا ہے کہ وہ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔"[3]

اور بدر و حدیبیہ میں شریک ہونے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ آگ میں نہیں جائیں گے۔ چنانچہ ام مبشر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يدخل النار۔ إن شاء الله۔ من أصحاب الشجرة أحد الذين

---

[1] مسند الإمام احمد والإصابة: 4/14 وغیرہ [2] المحبر: 295,296 [3] السير: 2/44

بايعوا تحتها.①

''کہ ان شاء اللہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لن يدخل النار رجل شهد بدراً والحديبية.②

''جو بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوا وہ ہرگز آگ میں نہیں جائے گا۔''

علامہ البانی نے السلسلۃ الصحیحۃ③ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ روایات اس روایت کے معارض ہیں جس میں ہے کہ «قاتل عمار وسالبه فى النار» عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل اور ان کا سامان چھیننے والا آگ میں جائے گا۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو بھی الصحیحۃ④ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے: کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والی لڑائیاں تاویل کی بنا پر تھیں اور مجتہد اگر مخطی بھی ہو تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔ جب یہ عام لوگوں کے لیے ہے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کے بالاولی مستحق ہیں۔⑤

مگر شیخ البانی نے فرمایا ہے کہ یہ قاعدہ تو صحیح ہے، مگر جہاں دلیلِ قاطع اس کے خلاف ہو تو وہ اس عمومی قاعدہ سے مستثنیٰ ہوگی جیسا کہ یہاں ہے۔⑥

لیکن جس دلیل کی بنا پر انھوں نے یہ فرمایا وہ دوسری ''دلیل قاطع'' کے خلاف ہے۔ جسے خود انھوں نے اسی جلد⑦ میں درج کیا ہے کہ اصحاب بدر اور اصحاب شجرہ آگ میں نہیں جائیں گے۔ اور یہی روایت راجح اور صحیح ہے جب کہ اس کے معارض روایت کی تصحیح محلِ نظر ہے۔ جس کی ضروری تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

ا۔ یہ روایت کہ ''قاتلِ عمار آگ میں جائے گا۔'' کی شیخ البانی رحمہ اللہ نے تین اسانید ذکر کی

① مسلم: 2/303، احمد: 3/250 ② مسند احمد: 3/362،396 ③ السلسلة الصحيحة: 5/191، رقم: 2160 ④ الصحيحة: 5/18، رقم: 2008 ⑤ الإصابة: 4/148 ⑥ الصحيحة: 5/19 ⑦ 5/191

ہیں۔ پہلی امام ابو محمد المخلدی کی «ثلاثة مجالس من الأمالی» کے حوالے سے جو «لیث عن مجاھد عن عبد اللہ بن عمرو» کی سند سے ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے خود ہی فرمایا ہے: لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔ لیث بن ابی سلیم کے واسطہ سے یہی روایت امام ابن ابی عاصم نے الآحاد والمثانی[1] میں بھی نقل کی ہے۔

۲۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے یہ روایت امام حاکم رحمہ اللہ سے «عبد الرحمن بن المبارک ثنا المعتمر بن سلیمان عن أبیه عن مجاھد» کی سند سے نقل کی ہے۔[2] اور امام حاکم رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

تفرد به عبد الرحمن بن المبارک وھو ثقة مأمون عن معتمر عن أبیه، فإن کان محفوظا فإنه صحیح علی شرط الشیخین.

”اس سند سے بیان کرنے میں عبد الرحمن بن المبارک منفرد ہیں اور وہ ثقہ مامون ہیں۔ اگر یہ سند محفوظ ہے تو یہ شرط الشیخین کے مطابق صحیح ہے۔“

عبد الرحمن بن المبارک سے صرف امام بخاری نے روایت کی ہے، امام مسلم نے نہیں۔ اس لیے اسے صرف علی شرط البخاری کہنا چاہیے۔ وہ بلاشبہ ثقہ ہیں، لیکن انھوں نے ایک جماعت کی مخالفت کی ہے۔ خود امام حاکم رحمہ اللہ نے ہی اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

إنما رواہ الناس عن معتمر عن لیث عن مجاھد. (أیضاً)

”لوگ اسے (عبد الرحمن بن مبارک کے برعکس) معتمر عن لیث عن مجاہد کی سند سے روایت کرتے ہیں۔“

چنانچہ انھی میں ایک عباس بن ولید النرسی ہیں جیسا کہ الآحاد والمثانی[3] میں ہے، مگر

---

① الآحاد والمثانی: 102/2، طبرانی کبیر، ابن عساکر ② المستدرک: 387/3

③ الآحاد والمثانی: 102/2، رقم: 803

الآحاد کے محقق نے لیث کو لیث بن سعد قرار دیا ہے۔ جو بہر نوع غلط ہے۔ کیونکہ علامہ المزی رحمہ اللہ وغیرہ نے امام لیث رحمہ اللہ کے اساتذہ میں امام مجاہد رحمہ اللہ کا ذکر نہیں کیا۔ امام لیث رحمہ اللہ مصری ہیں ۹۲ھ میں پیدا ہوئے ۱۱۳ھ میں وہ حج پر آئے تو مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے شیوخ مثلاً عطاء بن ابی رباح، الزهری، نافع اور ابوالزبیر وغیرہ سے سماع کیا۔ ① جبکہ امام مجاہد ۱۰۱ھ یا اس کے بعد ۱۰۴ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ ②

دوسرے امام مسدد ہیں جیسا کہ ان کی مسند سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے المطالب العالیہ ③ میں نقل کیا ہے۔ تیسرے صالح بن حاتم اور چوتھے عمرو بن علی ہیں۔ جیسا کہ ابن عساکر ④ میں ہے۔

اس لیے ان چاروں کی روایت عبدالرحمٰن بن مبارک سے راجح ہے اور عبدالرحمٰن کی روایت مرجوح ہے۔ علاوہ ازیں اس میں سلیمان تیمی مدلس ہیں اور روایت معنعن ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ اور امام ابن معین رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے مدلس قرار دیا ہے۔ تاریخ ابن معین بروایت الدوری (رقم ۳۶۰۰) طبقات المدلسین ⑤ وغیرہ، تاہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے دوسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

۳۔ اس روایت کی تیسری سند «عفان بن مسلم قال: أخبرنا حماد بن سلمة قال: أخبرنا أبو حفص وكلثوم بن جبر عن أبي غادية» سے مسند امام احمد ⑥ میں منقول ہے اور اسی سند کے بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: «هذا إسناد صحيح رجاله ثقات رجال مسلم» یہ سند صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ اور مسلم کے راوی ہے۔ ⑦ اور یہی بات المطالب العالیہ کے محقق نے بھی کہی ہے۔

لیکن یہ بھی درست نہیں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسی سند سے یہ روایت ذکر کر کے فرمایا ہے:

---

① التهذيب للمزی: 441/15 ② التقريب: 228 ③ المطالب العاليه: 165/35 ، رقم: 4415 ④ ابن عساكر: 426,474/43 ⑤ طبقات المدلسين: 22 ⑥ مسند احمد: 194/4 ، ابن سعد: 260/3 ⑦ الصحيحة: 19/5

إسناده فيه انقطاع.

کہ "اس کی سند میں انقطاع ہے۔"①

اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ قول درست ہے کیونکہ کلثوم بن جبر اسے ابو غادیہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تفصیل بیان کرتے ہیں، اس کے بعد کے الفاظ ہیں:

فاخبر عمرو بن العاص فقال سمعت رسول الله ﷺ يقول. الخ

کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی گئی تو انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل اور ان کا سامان چھیننے والا آگ میں ہے۔ یہاں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو خبر دینے والا اور ان سے یہ روایت سننے والا کون ہے؟ ظاہر ہے وہ نہ ابو غادیہ رضی اللہ عنہ ہیں اور نہ ہی کلثوم بن جبر ہو سکتے ہیں۔ کلثوم، ابو غادیہ، عبداللہ بن زبیر اور انس سے تو روایت کرتے ہیں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی وفات میں اختلاف ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے وہ ۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ ابن یونس وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔②

اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ اہلِ مصر کے بارے میں ابن یونس کا قول راجح ہوتا ہے اور کلثوم ابن جبر ۱۳۰ھ میں فوت ہوئے۔ یوں کلثوم نے اگر ۸۷ سال سے زائد عمر پائی ہو تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع ممکن ہے ورنہ نہیں۔ اور غالباً یہی وہ سبب ہے جس کی وجہ سے علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو منقطع قرار دیا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت ابن عساکر③ میں ایک اور سند سے منقول ہے۔ لیکن یہ سند بھی مجہول اور متکلم فیہ راویوں سے منقول ہے۔

مزید برآں یہ روایت صحیح مسلم وغیرہ کی روایت کے مخالف ہے جس میں مذکور ہے کہ صلح حدیبیہ میں شریک ہونے والے آگ میں نہیں جائیں گے۔ ابو غادیہ رضی اللہ عنہ چونکہ اصحابِ حدیبیہ

① سیر أعلام النبلاء: 544/2 ② التهذيب: 57/8 ③ ابن عساكر: 473/43

میں سے ہیں اس لیے صحیح مسلم کی روایت ہی راجح اور اس کے مقابلے کی روایت اپنے ضعف کے علاوہ مرجوح ہے۔ اس روایت کے اور شواہد بھی ہیں۔ جنھیں شیخ البانی رحمہ اللہ نے ان کے ضعف کی بنا پر ذکر نہیں کیا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصراً ان کی حقیقت بھی بیان کر دی جائے۔

پہلا شاہد

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

تقتلك الفئة الباغية، بشر قاتل عمار بالنار.[1]

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار تجھے باغی جماعت قتل کرے گی، قاتل عمار کو آگ کی بشارت دیں۔''

لیکن یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔ عمرو بن مالک الراسبی ضعیف ہے اور اس کا استاد یوسف بن عطیہ متروک ہے۔[2]

دوسرا شاہد

حافظ ذہبی نے السیر[3] میں ابو عوانہ اور ابو یعلی سے یہی روایت حضرت عثمان سے نقل کی ہے۔ جس کی سند انھوں نے یوں نقل کی ہے:

أبو عوانة في مسنده وأبو يعلىٰ من حديث أحمد بن محمد الباهلي حدثنا يحيى بن عيسى حدثنا الأعمش حدثنا زيد بن وهب. الخ

---

(1) المطالب العالية: 174/35، رقم: 4419، ابن عساكر: 474/43 (2) تقريب: 568، 39
(3) السير: 420/1

او اس کے الفاظ ہیں: «تقتلك الفئة الباغية وقاتله في النار» مگر یہ الفاظ اور سند دونوں محلِ نظر ہیں۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ابو عوانہ کی سند ہی ذکر نہیں کی، البتہ ابو یعلی رحمہ اللہ کی سند انھوں نے ذکر کی ہے اور وہ امام ابو یعلی رحمہ اللہ کی المسند الکبیر اور المعجم[1] میں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے المطالب العالیہ[2] میں المسند الکبیر ہی سے نقل کیا ہے۔

اولاً: مسند ابو یعلی کی سند یوں ہے:

- حدثنا الفضل بن سكين ثنا أحمد بن محمد الرملي ثنا يحيى ابن عيسى الرملي ثنا الأعمش. الخ

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے ابو عوانہ سے بھی اسے اتحاف المہرۃ[3] میں نقل کیا ہے۔ ابو یعلی رحمہ اللہ اور ابو عوانہ رحمہ اللہ کی سند میں الفضل بن سکین ہے جس کی امام ابن معین رحمہ اللہ نے تکذیب کی ہے۔[4] مگر وہ منفرد نہیں۔ اس کا استاد احمد بن محمد الرملی کی توثیق نہیں ملی۔ ابو عوانہ میں اسے احمد بن محمد الباہلی لکھا ہے۔ اور اس کا متابع احمد بن بدیل القاضی ہے۔[5] اور وہ صدوق ہے۔ ان کا استاد یحییٰ بن عیسیٰ الرملی متکلم فیہ ہے۔ یہ وہی ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کرتا ہے: «النظر إلى علي عبادة» ''کہ علی رضی اللہ عنہ کو دیکھنا عبادت ہے۔'' شیخ البانی رحمہ اللہ اس پر بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں: «فمثله لا يحتج به، لا سيما فيما يؤيد تشيعه» اس جیسا راوی قابلِ استدلال نہیں بالخصوص جبکہ اس کی روایت اس کی شیعیت کی مؤید ہو۔[6] اس لیے یہاں بھی اس کی روایت قابلِ استدلال نہیں ہے۔

ثانیاً: ابو یعلی، طبرانی میں «قاتله في النار» کے الفاظ ہی نہیں ہے۔

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد[7] میں یہ روایت ابو یعلی اور طبرانی (کبیر، اوسط اور

---

[1] المعجم: 283 [2] المطالب العالية: 183/35، رقم: 4423 [3] إتحاف المهرة: 38/11
[4] لسان: 441/4 [5] المعجم الصغير: 187/1 [6] الضعيفة: ج10 ق1 /242 نیز دیکھئے الفوائد المجموعه مع هامش المعلمي: 359 [7] مجمع الزوائد: 242/7

صغیر) سے نقل کی ہے اور اس میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں یہ الفاظ صحیح نہیں۔

ہماری ان معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ «قاتله وسالبه فی النار» کے الفاظ سے روایت صحیح نہیں، اور بات وہی صحیح ہے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ حضرت ابو غادیہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کا سبب اسی روایت میں موجود ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر معترض تھے اور ان کے بارے میں تأثرات درست نہیں تھے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی زبان سے اس نوعیت کی باتیں حضرت ابو غادیہ رضی اللہ عنہ نے سنی تو ان کے دل میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے نفرت پیدا ہو گئی اور اس کا نتیجہ ان کی شہادت پر منتج ہوا۔ سلف نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نوعیت کے باہمی معاملات کے بارے میں کفِ لسان کا فیصلہ فرمایا ہے۔ جس کی تفصیل راقم الحروف کی تصنیف ''مشاجرات صحابہ اور سلف کا موقف'' میں دیکھی جا سکتی ہے، اور یہی سلامتی کی راہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الآثار

کیا پہلی صحیح کتاب ہے؟

امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی تصانیف میں ایک مشہور کتاب ''کتاب الآثار'' ہے۔ حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

کتاب الآثار للإمام محمد بن الحسن وهو مختصر على ترتيب الفقه ذكر فيه ماروى عن أبى حنيفة من الآثار.[1]

''کتاب الآثار امام محمد بن حسن رحمہ اللہ کی تصنیف ہے اور فقہی ترتیب پر مختصر کتاب ہے، جس میں انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی آثار کو ذکر کیا ہے۔''

یہی بات اسماعیل پاشا نے ہدیۃ العارفین[2] میں کہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدث دہلوی نے کتاب الآثار کے اطراف کا سماع شیخ تاج الدین حنفی رحمہ اللہ مفتی مکہ مکرمہ سے کیا ہے، فرماتے ہیں:

و طراف...... کتاب الآثار امام محمد وموطأ أو ازوے سماع نمود.[3]

اسی طرح حضرت موصوف اپنی ایک اور تصنیف میں فرماتے ہیں:

---

① کشف الظنون: 2/1384 ② ہدیۃ العارفین: 2/8 ③ انسان العین: 16

أما الأحاديث والآثار التي عليها بناء مذهب أبي حنيفة فقد رويتها مسلسلًا بالفقهاء الحنفيين في ضمن كتاب الآثار للإمام محمد بن الحسن. [1]

''وہ احادیث وآثار جن پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کا دارومدار ہے، انھیں میں نے امام محمد رحمہ اللہ بن حسن کی کتاب الآثار کے ضمن میں مسلسل فقہائے حنفیہ کی سند سے روایت کیا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے اپنی سند ذکر کی ہے اور آخر میں لکھا:

قالا أخبرنا به مؤلفه الإمام محمد بن الحسن عن أبي حنيفة وغيره من المشايخ.

''ان دونوں (یعنی اسماعیل بن توبہ قزوینی اور ابوحفص احمد بن حفص) نے ہمیں خبر دی ہے اس کتاب کی اس کے مؤلف امام محمد رحمہ اللہ بن حسن سے، وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دوسرے مشائخ سے روایت کرتے ہیں۔''

اسی طرح شیخ محمد سعید سنبلی رحمہ اللہ المتوفی ۱۱۷۵ھ نے بھی ''الاوائل السنبلیہ'' [2] میں کتاب الآثار کو امام محمد رحمہ اللہ کی ہی تصنیف قرار دیا ہے۔ یہ کتاب شیخ ابوغدہ رحمہ اللہ کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے۔

علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے الاعلان بالتوبیخ [3] میں بھی کتاب الآثار کو امام محمد رحمہ اللہ کی ہی تصنیف قرار دیا ہے۔ یہی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری [4]، الدرایہ [5] اور تعجیل المنفعہ [6] میں اور علامہ الزیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ [7] میں، مولانا عبدالحی رحمہ اللہ نے مقدمہ التعلیق الممجد [8] میں، علامہ الکوثری نے بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی [9] میں کہی ہے۔

[1] اتحاف النبیہ: 121 [2] الاوائل (ص58) [3] الإعلان بالتوبیخ: 234 [4] فتح الباری: 250/9 [5] الدرایۃ: 300/2 [6] تعجیل المنفعۃ: 9،24 [7] نصب الرایہ: 128/4
[8] التعلیق الممجد، 149/1 [9] بلوغ الامانی، ص: 200

کتاب الآثار میں چوں کہ اکثر و بیشتر روایات امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ہیں اس لیے بعض حضرات نے اس کتاب کا انتساب ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف کر دیا ہے۔ حتی کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ایک کلام سے بھی بعض کو دھوکا لگا اور کہا گیا کہ وہ بھی اس کا انتساب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں۔

علامہ الحسینی رحمہ اللہ نے ائمۂ اربعہ کی مرویات کے رجال کو جمع کیا تو انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات کے حوالے سے ''مسند ابی حنیفہ'' کا نام لیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس بات پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كذلك مسند أبي حنيفة، توهم أنه جمع أبي حنيفة، وليس كذلك والموجود من حديث أبي حنيفة مفرداً إنما هو كتاب الآثار التي رواها محمد بن الحسن عنه.[1]

''اسی طرح ''مسند ابی حنیفہ'' کا نام، جس سے وہم ہوتا ہے کہ اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حدیث میں موجود ''کتاب الآثار'' ہے جسے محمد بن حسن ان سے روایت کرتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسند ابی حنیفہ کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ وہ امام صاحب کی کتاب نہیں۔ پھر ان کی مرویات کی نشان دہی کی ہے کہ وہ ''کتاب الآثار'' میں ہیں جنھیں امام محمد رحمہ اللہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح المجمع المؤسس للمعجم المفهرس[2] میں بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے امام محمد رحمہ اللہ کی تصنیف ہی قرار دیا ہے۔ اسی ''کتاب الآثار'' کے رجال حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے «الإيثار بمعرفة رواة الآثار» کے نام پر علیحدہ طور پر مرتب کیے ہیں۔ جس میں وہ رقم طراز ہیں:

«فإن بعض الإخوان التمس مني الكلام على رواة كتاب الآثار للإمام أبي عبد الله محمد بن الحسن الشيباني، التي رواها عن الإمام أبي حنيفة.[3]

[1] تعجيل المنفعة: 5 [2] المجمع المؤسس للمعجم المفهرس: 390 [3] الإيثار: 1

’’بعض بھائیوں نے مجھ سے امام ابوعبداللہ محمد بن حسن شیبانی کی کتاب الآثار کے راویوں پر کلام کا تقاضا کیا۔ جسے وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔‘‘

ظاہر ہے کہ یہ ’’کتاب الآثار‘‘ اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تھی تو صاف «للإمام أبي حنيفة» کہنے میں کیا انقباض تھا۔ اور «التي رواها عنه» کے تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حافظ قاسم قطلوبغا رحمہ اللہ نے بھی امام محمد رحمہ اللہ کی ’’کتاب الآثار‘‘ کے رجال پر مستقل کتاب لکھی۔ [1]

کتاب الآثار اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

ہماری اس وضاحت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ’’کتاب الآثار‘‘ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نہیں بلکہ امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے تقریباً چھبیس مقامات پر امام صاحب رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر مشائخ سے روایات بیان کی ہیں۔ یہی پوزیشن کتاب الآثار لأبي یوسف رحمہ اللہ کی ہے۔ مگر کچھ عرصہ سے بعض حضرات اس کوشش میں ہیں کہ کتاب الآثار کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب باور کرایا جائے۔ بلکہ اسے تدوینِ حدیث کے سلسلے کی سب سے پہلی تصنیف قرار دیا جائے، حتی کہ اسے صحیح احادیث پر مشتمل پہلی کتاب قرار دیا جائے۔ غالباً برصغیر میں اس فکر کے سرخیل ماضی قریب میں مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی «ماتمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجة» جو بعد میں «الإمام ابن ماجه وكتابه السنن» کے نام سے شائع ہوئی، اور اس کے اردو ایڈیشن ’’ابن ماجہ اور علم حدیث‘‘ میں اپنے ان افکار کا تذکرہ کیا۔ اس کے علاوہ یہی کچھ انھوں نے شیخ مسعود بن شیبہ سندھی کی کتاب ’’مقدمہ کتاب التعلیم‘‘ کے حواشی اور «ذب ذبابات الدراسات» للشیخ عبداللطیف سندھی کے حواشی میں بتکرار کہا۔

[1] الإعلان بالتوبيخ: 234، فهرس الفهارس:972/2

ایک دلچسپ بات کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی کوئی کتاب نہیں لکھی

یہاں یہ بات بھی یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الآثار" جس میں وہ اکثر و بیشتر امام ابوحنیفہ سے روایت کرتے ہیں، پہلی بار ۱۳۵۵ھ میں، حضرت مولانا ابوالوفا افغانی رحمۃ اللہ علیہ رئیس لجنۃ المعارف النعمانیہ حیدر آباد دکن کی تحقیق و حواشی سے مصر میں طبع ہوئی تھی۔ جس کے مقدمہ میں حضرت موصوف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تصانیف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ولم يصنف الإمام الأعظم رضي الله عنه كتاباً في الأخبار والآثار كماصنف الإمام مالك رضي الله عنه الموطأ، وإنما كان يملي فروع الفقه على تلاميذه، فإذا احتاج إلى دليل مسألة حدثهم عن شيوخه من الأحاديث المرفوعة والموقوفة وآثار التابعين، بالسند المتصل تارة وأخرى بلاغاً وتعليقاً أو انقطاعاً، ولم يجلس للتحديث كعادة المحدثين ولهذا قلت روايته في الحديث.الخ (1)

"امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث و آثار پر مشتمل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جس طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے الموطأ لکھی ہے۔ امام صاحب اپنے تلامذہ کو فقہی فروعات و مسائل لکھواتے تھے اور جب کسی مسئلہ میں دلیل کی ضرورت محسوس کرتے تو اپنے شیوخ سے مرفوع، موقوف اور آثار تابعین کبھی متصل سند سے، کبھی بلاغاً اور تعلیقاً یا منقطع روایت بیان فرما دیتے۔ حدیث کی تعلیم و تدریس کے لیے محدثین کی طرح انھوں نے مجلس قائم نہیں کی اس لیے حدیث میں ان کی روایات کم ہیں۔"

---

(1) مقدمة كتاب الآثار

اس کے بعد انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ البتہ ان کے تلامذہ نے ان سے جو آثار سنے تھے انھیں فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب آثار اور ''مسند ابی یوسف'' ہے جسے ''نسخۃ ابی یوسف'' بھی کہا گیا ہے۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ نے دو کتابیں لکھیں ایک میں آثار مرفوعہ ہیں جو ''مسند'' ہے اور دوسری ''کتاب الآثار'' ہے جس میں مرفوع اور موقوف روایات ہیں۔ اور امام حسن رحمہ اللہ بن زیاد لؤلؤی نے بھی مسند لکھی جسے مسند الحسن یا نسخۃ الحسن کہا گیا ہے۔'' ایضاً

عرض ہے کہ حسن لؤلؤی کی اسی مسند کی سند علامہ خوارزمی نے اپنی سند سے محمد بن ابراہیم ابن حبیش ① عن محمد بن شجاع الثلجی ② عن حسن لؤلؤی تک نقل کی ہے اور اس کی روایات کو بعض نے ''الآثار'' سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے لسان المیزان ③ میں محمد بن ابراہیم بن حبیش کے ترجمہ کے تحت ذکر کیا ہے۔ لیکن لسان میں ''الحسن بن زیاد اللؤلؤی عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار'' ہے۔ مگر اس میں ''محمد بن الحسن'' کا واسطہ غلط ہے جیسا کہ المؤتلف للدارقطنی ④ اور جامع المسانید سے عیاں ہوتا ہے۔ ان میں یہ واسطہ نہیں۔

مولانا ابو الوفا افغانی مرحوم نے کتاب الآثار کی تحقیق و تنقیح ضرور کی مگر انہوں نے اسے حدیث کی پہلی صحیح کتاب قرار نہیں دیا عرصہ بعد مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم نے «ما تمس إلیہ الحاجۃ» اور پھر ابن ماجہ اور علم حدیث لکھی جس میں انہوں نے کتاب الآثار کے بارے میں حدیث کی پہلی صحیح کتاب ہونے کا دعویٰ کیا اول الذکر کتاب انہوں نے ۱۳۷۳ھ اور ثانی الذکر ۱۳۷۶ھ میں تحریر کی جیسا کہ دونوں کے اختتام پر خود انہوں نے ذکر کیا مولانا

---

① جامع المسانید میں خنیس ہے جبکہ صحیح حبیش ہے۔ لسان (31/5) میں ''حسن'' بھی غلط ہے۔ البتہ لسان (25/5) میں درست ہے۔ ② جامع المسانید اور لسان میں البلخی ہے۔ جامع المسانید کا نسخہ بہت سی اغلاط اور تصحیفات سے بھرا ہوا ہے۔ ③ لسان (31/5) میں بھی حبیش کی جگہ ''حسن'' اور ابن شجاع الثلجی کی بجائے نجیح البلخی غلط طبع ہوا ہے۔ البتہ (25/5) میں حبیش ہے۔
④ المؤتلف للدارقطنی: 689/2

نعمانی کے اس انکشاف کے بعد اور تو کیا مولانا ابوالوفا افغانی بھی نعمانی صاحب کی فکر کا شکار ہو گئے۔

چنانچہ کتاب الآثار امام محمد رحمہ اللہ کے جب انھوں نے حواشی لکھے اور اس پر طویل مقدمہ تحریر کیا تو اس میں انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ علم حدیث میں سب سے پہلی کتاب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ''کتاب الآثار'' ہے اور امام محمد، قاضی ابو یوسف، امام زفر اور ابن زیاد لؤلؤی رحمہم اللہ کی کتاب الآثار اس کے مختلف نسخے ہیں۔ امام مالک نے موطا میں امام صاحب کی متابعت کی ہے۔ ①

قارئینِ کرام! انصاف فرمائیں کہ حضرت موصوف نے ''مقدمہ کتاب الآثار لابی یوسف'' میں جو کچھ فرمایا اور جن مقدمات کے تحت فرمایا کیا اس کے برعکس اب ثابت ہو گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے محدثین کی طرح درسِ حدیث کی مجلس سجائی تھی؟ اور کتاب الآثار امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے؟ مولانا نعمانی کی کورانہ اتباع میں جو کچھ فرمایا وہ بس ''مقدمہ کتاب الآثار لأبي یوسف'' کی الٹی صورت ہے۔ پہلے انھی مسلمات کے باوجود امام صاحب کی حدیث کے بارے میں کتاب کی نفی، پھر وہی مسلمات ہیں جو کتاب الآثار کے مختلف نسخے ثابت کرنے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کی اصل بنیاد

دراصل یہ حضرات مدینہ طیبہ کی بجائے کوفہ کو مرکزِ علم باور کرانے کے درپے ہیں۔ اسی لیے کتاب الآثار کو پہلی مدونہ کتاب بلکہ صحیح احادیث پر مشتمل پہلا مجموعہ قرار دینے کی سعیِ بلیغ کرتے ہیں۔ مولانا نعمانی ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

كتاب الآثار وهو أم الأم رغم إعراض من أعرض عنه. ②

یعنی جو اس حقیقت کو نہیں مانتا اس کے انکار کے علی الرغم ''کتاب الآثار'' موطا کی اصل اور ماں ہے۔ یہی بات انھوں نے ایک اور جگہ ذرا تفصیل سے فرمائی ہے۔ ③ کتاب الآثار

① مقدمہ کتاب الآثار: 5-1 ② الامام ابن ماجہ: 183 ③ الامام ابن ماجہ: ص: 79

کے مقدمہ[1] میں بھی لکھتے ہیں: ''کتاب الآثار صحیحین کی اُم الام ہے۔'' نیز لکھتے ہیں:

''آج امت کے پاس احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم ترین کتاب یہی ''کتاب الآثار'' ہے۔''[2]

''کتاب الآثار میں جو احادیث ہیں وہ موطا کی روایات سے قوت وصحت میں کم نہیں.... موطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔''[3]

''غرض کتاب الآثار، قرآنِ پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب ہے جو ابواب پر مرتب ومدون ہوئی اور جس میں صرف ان ہی احادیث اور آثار وفتاوے نے جگہ پائی کہ جن کی روایت ثقات اور اتقیائے امت میں برابر چلی آتی ہے۔''[4]

ہم یہاں اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتے کہ حدیث کا مدونِ اول کون ہے؟ اور کیا ''کتاب الآثار'' واقعی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب ہے؟ بلکہ ہم یہاں اس دعویٰ کا جائزہ قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی کتاب الآثار ''اُم الام'' ہے؟ کیا یہ صحیح احادیث کا اولین مجموعہ ہے؟ اور اس کی موطا امام مالک سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے؟

ہم یہاں اس بحث میں بھی جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ ''کتاب الآثار'' کے جامع امام محمد ابن حسن شیبانی رحمہ اللہ کا روایتِ حدیث میں کیا مرتبہ ہے۔ قاضی ابویوسف رحمہ اللہ جو ان کے استاد بھائی اور استاد بھی ہیں ان کی رائے امام شیبانی رحمہ اللہ کے بارے میں کیا ہے؟ امام یحییٰ ابن معین، جنھیں حنفی باور کرایا جاتا ہے، ان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ میزانِ جرح وتعدیل میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ اسی طرح امام شیبانی رحمہ اللہ کے استاد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جنھیں کتاب الآثار کا اصل مدون قرار دیا جا رہا ہے ائمہ جرح وتعدیل کے نزدیک ان کی روایت کی کیا پوزیشن ہے؟ یہ مباحث جہاں تطویل کا باعث ہیں، وہاں ان کے بارے میں آرا مختلف قرار دے کر ان سے اغماض کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس کی بجائے اُن نکات کے

---

[1] مقدمہ کتاب الآثار: ص: 21 [2] ابن ماجہ اور علمِ حدیث: 159

[3] ایضاً: 162,163 [4] ایضاً: 165

حوالے سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن میں اس نوعیت کے شک وریب کی گنجائش نہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ صحیح بخاری ومسلم کے مقابلے میں کتاب الآثار کی پوزیشن کے علاوہ ہم خوب جانتے ہیں کہ صحیحین کے حوالے سے ان کے تاثرات کیا ہیں۔ ان کی اسی سعی نامشکور کا شکوہ انہی کے حلقہ کے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے کیا[1] اور معروف علمی ماہنامے معارف کے تبصرہ نگار نے بھی فرمایا کہ ''ان کا قلم جادہ اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے''[2] مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے افکار سے منکرین حدیث نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ جس کی وضاحت ہم ''احادیث صحیح بخاری ومسلم میں پرویزی تشکیک کا علمی محاسبہ'' میں کر چکے ہیں۔ مولانا نعمانی مرحوم دراصل اس حوالے سے اپنے استاد مولانا حیدر حسن ٹونکی سے متاثر تھے۔ جن کے تصلب اور مخالفین پر ان کے تشدد کا شکوہ مولانا سید عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں کیا ہے۔[3] پھر علامہ کوثری کے ''انکشافات'' نے انہیں دو آتشہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی خطائیں معاف فرمائے۔

سب سے پہلی صحیح کتاب

چناں چہ عرض ہے کہ امام ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ علوم الحدیث میں فرمایا تھا کہ سب سے پہلے جس نے صحیح احادیث کو جمع کیا وہ امام بخاری رحمہ اللہ ہیں۔ مگر معروف حنفی محدث علامہ علاء الدین مغلطائی رحمہ اللہ نے اس پر مواخذہ کیا ہے اور اپنی کتاب ''اصلاح کتاب ابن الصلاح'' میں اس پر نقد وتبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

قوله أول من صنف الصحيح البخاري وتلاه مسلم، غير جيد، ...وإن كان قد قاله قبله غيره ...لأن مالكاً رحمه الله بلا خلاف بين المحدثين صنف الصحيح قبله. الخ[4]

''ابن الصلاح کا کہنا کہ سب سے پہلے ''الصحیح'' کی تصنیف امام بخاری رحمہ اللہ کی ہے

---

[1] ماہنامہ برہان دھلی فروری 1956ء [2] معارف جنوری 1961ء

[3] نزهة الخواطر 128/8 [4] اصلاح: 66/2

اور ان کے پیچھے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ہیں، صحیح نہیں، اگرچہ یہ بات ان سے پہلے بھی دوسرے حضرات نے کہی ہے،......اس میں محدثین کے ہاں کوئی اختلاف نہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پہلے "الصحیح" تصنیف کی ہے۔"

علامہ مغلطائی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں کیا گھپلا ہے حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے النکت [1] میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ مگر ہمارا یہ موضوع نہیں۔ ہم قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ علامہ مغلطائی رحمۃ اللہ علیہ حنفی ہونے کے باوصف حافظ ابن الصلاح وغیرہ کی تردید میں صحیح بخاری کی بجائے موطا کو پہلی صحیح کتاب قرار دیتے ہیں۔ مگر "کتاب الآثار" کا نام آخر کیوں نہیں لیتے؟

موطا کو پہلی صحیح کتاب قرار دینے والے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جیسا کہ التذکرہ [2] وغیرہ کتب میں ہے کہ کتاب اللہ کے بعد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے بڑھ کر کوئی صحیح کتاب نہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مداح تھے، نے بھی صحیح احادیث کا اولین مجموعہ قرار دیا ہے تو موطا کو، کتاب الآثار کو نہیں۔

غرض یہ کہ صحیح بخاری سے پہلے معروف قول کے مطابق موطا کو اولین صحیح کتاب قرار تو دیا گیا ہے مگر "کتاب الآثار" کو اولین صحیح کتاب کہنا چودھویں صدی کی بدترین "بدعت" ہے۔ اس سے پہلے اس دعویٰ کی نظیر قطعاً نہیں ملتی۔

بلکہ نہ امام صاحب نے یہ دعویٰ کیا نہ ہی ان کے تلامذہ نے کہ "کتاب الآثار" کی مرویات صحیح ہیں۔ اس لیے اسے پہلی صحیح کتاب قرار دینا مدعی سست گواہ چست کا مصداق ہے۔

علامہ خوارزمی کا ایک دعویٰ کہ مدوّن اوّل امام صاحب ہیں

مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم نے بتکرار لکھا ہے کہ

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ میں تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] النکت: 1/277,280 [2] التذکرۃ: 1/298، النکت: 1/279

''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان خصوصی مناقب میں سے، جن میں وہ متفرد ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمِ شریعت کو مدوّن کیا اور اس کو ابواب پر مرتب کیا پھر امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے موطا کی ترتیب میں انھی کی پیروی کی اور اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں۔''①

یہی بات انھوں نے مقدمہ کتاب الآثار② اور الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن③ میں اور دیگر اپنی تعلیقات میں نقل کی ہے۔ مقام شکر ہے کہ الامام ابن ماجہ میں انھوں نے یہ بھی نقل کر دیا کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ

قال بعض من جمع مسند أبي حنيفة

گویا یہ بات مسند ابی حنیفہ کے کسی جامع نے فرمائی ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نہیں۔ جیسا کہ ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' وغیرہ سے تاثر نکلتا ہے۔ بلکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ الخلفاء میں ۱۴۳ھ کے حوادثات اور واقعات میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ

''کوفہ میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں لکھیں، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی مرتب کیے اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ اور اجتہادی مسائل کو مدوّن کیا۔''④

نیز علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تو فرمایا ہے کہ قرنِ اوّل کے اختتام پر تدوینِ حدیث کا آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سب سے پہلے حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ اور قرنِ ثانی میں مکہ مکرمہ میں امام ابن جریج نے، امام ابن اسحاق یا امام مالک رحمۃ اللہ علیہم نے مدینہ طیبہ میں، امام ربیع بن صبیح یا امام سعید بن ابی عروبۃ یا حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہم نے بصرہ میں، امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کوفہ میں، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے شام میں، امام ہشیم رحمۃ اللہ علیہ نے واسط میں، امام معمر رحمۃ اللہ علیہ نے یمن میں، امام جریر بن عبدالحمید رحمۃ اللہ علیہ نے رے میں، امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے خراسان میں سب سے پہلے احادیث کو مدوّن کیا۔ علامہ عراقی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ سبھی معاصر ہیں معلوم نہیں ان میں سے پہل کس نے کی ہے۔''⑤

① ابن ماجہ اور علم حدیث: 160,161 ② مقدمہ کتاب الآثار: 18 ③ الإمام ابن ماجہ وكتابه السنن: 59 ④ تاريخ الخلفاء: 261 ⑤ تدريب الراوي: 89/1

غور فرمایا آپ نے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے حوالے سے مولانا نعمانی مرحوم نے جو بظاہر تاثر دینے کی کوشش کی ہے خود علامہ سیوطی کی دوسری تصانیف میں ان کا اپنا موقف کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمہ فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ عصرِ تابعین کے اواخر میں ابواب پر سب سے پہلے ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ نے احادیث جمع کی ہیں۔ اور تیسرے طبقہ میں امام مالک، امام ابن جریج اور امام اوزاعی رحمہم اللہ وغیرہ نے احادیث کو مرتب و مدوّن کیا ہے۔ ①

ان سے قبل امام رامہرمزی رحمہ اللہ «المحدث الفاصل بین الراوی والواعی» جسے اصولِ حدیث میں پہلی مرتب کتاب قرار دیا گیا ہے، میں لکھتے ہیں:

أول من صنف وبوب فيما أعلم الربيع بن صبيح بالبصرة ثم سعيد بن أبي عروبة . الخ ②

''میرے علم کے مطابق بصرہ میں سب سے پہلے مصنف اور ابواب پر مرتب احادیث جمع کرنے والے ربیع بن صبیح (المتوفی ۱۶۰ھ) ہیں پھر سعید بن ابی عروبۃ ہیں۔''

یہ اور اسی نوعیت کی دیگر تصریحات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دوسری صدی ہجری میں تبویب پر احادیث جمع کرنے کی اولیت بصرہ میں ربیع بن صبیح وغیرہ کو ہے۔ البتہ ایک باب کی احادیث کو علیحدہ طور پر جمع کرنے میں امام عامر شعبی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۰۴ھ) کو تقدم حاصل ہے۔ ③

چناں چہ انھوں نے فرمایا ہے کہ «هذا باب من الطلاق جسيم» ''یہ طلاق کا بڑا باب ہے۔'' پھر اس سے متعلق احادیث ذکر کی ہیں۔ ④

اسی طرح ''الفرائض والجراحات'' کا ذکر بھی خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ⑤ میں کیا ہے۔ بلکہ امام شعبی رحمہ اللہ سے بھی پہلے امام عروہ رحمہ اللہ بن زبیر (المتوفی ۹۳ھ) ہیں جن کی

① مقدمہ: 6 ② المحدث الفاصل: 611 ③ تدریب: 89/1 ④ الجامع للخطیب: 180/1، المحدث الفاصل ⑤ تاریخ بغداد: 232/12

سیرتِ نبوی پر مشتمل کتاب معروف ہے۔ وہ اپنے تلامذہ کو احادیث املا کرواتے بلکہ اپنے بیٹے ہشام اور ان کے بھائی کو بلا کر علیحدہ علیحدہ ابواب پر مشتمل روایات بیان کرتے۔ ہشام کا بیان ہے:

وكان يحدثنا ويأخذ في الطلاق ثم الخلع ثم الحج ثم الهدى هكذا.①

اور ہشام کے پاس تو ان کی مرویات کا ایک ''دفتر'' تھا اور وہ فرماتے ہیں:

في هذا أحاديث أبي صحيحة②

''کہ اس میں میرے والد کی صحیح احادیث ہیں۔''

جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابواب پر علیحدہ طور پر احادیث بیان کرنے اور جمع کرنے کا تصور امام شعبی رحمہ اللہ سے بھی پہلے پایا جاتا تھا۔ اس لیے ایک باب کی احادیث جمع کرنا ہوں، جسے بعد میں ''جزء'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یا ابواب پر مشتمل احادیث ہوں، ان میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو قطعاً اولیت حاصل نہیں۔

معروف ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے موطا کی ترتیب و تصنیف خلیفہ منصور کے کہنے پر کی۔ منصور ابوجعفر اپنے بھائی ابوالعباس سفاح کی وفات (۱۳۶ھ) کے بعد خلیفہ بنا اور ۱۵۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے:

إن الموطأ ألفه مالك رضي الله عنه بعد موت يحيى بن سعيد الأنصاري بلاشك.③

''کہ بلاشبہ امام مالک رحمہ اللہ نے موطاً کی تالیف امام یحییٰ بن سعید انصاری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد کی ہے۔''

① المعرفة والتاريخ للفسوى: 178/2 ② المعرفة: 263/3 ③ الاحكام: 136/2

امام یحییٰ بن سعید انصاری رحمہ اللہ ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے، ظاہر ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے موطا کی تدوین ۱۴۳ھ کے بعد ہی کی ہے۔ بلکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اور ان کے حوالے سے علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے تو یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے مہدی نے کتاب لکھنے کا کہا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ ۱۵۸ھ تک موطا کی تکمیل نہیں کر پائے تھے۔ بلکہ خلیفہ مہدی کے ابتدائی دور میں ۱۵۸ھ کے بعد انھوں نے موطا کی تکمیل کی۔ اور قاضی عیاض وغیرہ نے تو صراحت کی ہے کہ

فلم يفرغ حتى مات أبو جعفر.①

''کہ موطا کی تکمیل سے پہلے ابوجعفر فوت ہوگئے۔'' واللہ اعلم

مگر موطا سے پہلے امام محمد رحمہ اللہ بن عبدالرحمٰن بن مغیرۃ ابن ابی ذئب (المتوفی ۱۵۸ھ) نے فقہی ابواب پر مرتب کتاب لکھی۔ الندیم نے اس کا نام ''کتاب السنن'' ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

يحتوي على كتب الفقه مثل صلاة وطهارة و صيام وزكاة ومناسك وغير ذلك.②

ان کی کتاب موطا بھی معروف ہے اور خطیب بغدادی کی الجامع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ کتاب امام مالک رحمہ اللہ کے موطا سے پہلے مرتب ہوئی تھی۔③

ان کی یہ کتاب امام مالک رحمہ اللہ کی کتاب سے بڑی تھی اور امام مالک رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ آپ کی کتاب کا کیا فائدہ؟ تو انھوں نے فرمایا:

ما كان لله بقي.④

اس بات کی تنقیح نہیں ہوسکی کہ موطا وہی ہے جسے الندیم ''السنن'' کہتے ہیں، یا یہ اس کے علاوہ ہے۔ تاہم اس سے یہ بات تو مترشح ہوتی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی کتاب سے پہلے امام ابن ابی ذئب کی فقہی ترتیب پر کتاب موجود تھی۔

---

① ترتیب المدارک: 162/1، شرح الزرقانی: 7/1 ② الفہرست: 373 ③ دراسات في الحديث النبوي: 306/1 ④ تدریب الراوی: 89/1

امام ابن ابی ذئب کے علاوہ امام عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون (المتوفی ۱۶۴ھ) کی کتاب الموطأ بھی مشہور ہے، بلکہ انھوں نے بھی یہ کتاب امام مالک رحمہ اللہ سے پہلے لکھی تھی اور امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے جب اسے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کی تحسین تو کی مگر ابواب میں آثار ذکر نہ کرنے پر اعتراض کیا اور فرمایا: میں اپنی کتاب میں صحیح احادیث و آثار جمع کروں گا۔ ①

اسی طرح امام ابن جریج رحمہ اللہ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے معاصر تھے، دونوں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے، کے بارے میں الندیم نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے کتاب السنن لکھی جو کتب سنن کی طرح روایات و اخبار پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ کتاب المناسک، کتاب الجامع، کتاب التفسیر بھی لکھی اور یہ کتابیں عرصہ تک اہلِ علم کے ہاتھوں میں رہیں۔ جس کی تفصیل دکتور محمد مصطفیٰ اعظمی نے دراسات فی الحدیث النبوی ② میں بیان کی ہے، بلکہ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ سب سے پہلے ابن جریج رحمہ اللہ نے کتابیں لکھیں۔ ③ خود ان کا بیان ہے:

ما دون العلم تدويني أحد. ④

''کسی نے میری طرح علم کو مدوّن نہیں کیا۔''

اور خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ ربیع بن صبیح، حماد، معمر اور سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ نے انھی کی پیروی کی ہے۔

امام ابن ابی ذئب، امام ماجشون اور امام ابن جریج، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے معاصر ہیں۔ اب اس کی واضح دلیل تو علامہ خوارزمی اور ان کے ہمنواؤں کے ذمہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ''کتاب الآثار'' ان حضرات کی کتابوں سے بھی پہلے تھی۔ اگر اس پر کوئی یقینی دلیل نہیں تو ان کی کتاب کو ابواب پر مرتب پہلی کتاب کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟

علاوہ ازیں یہاں دو باتیں مزید غور طلب ہیں۔ علامہ خوارزمی کا دعویٰ ہے کہ

① ترتیب المدارک: 195/1، تنویر الحوالك: 6/1 ② دراسات فی الحدیث النبوی: 286,289/1 ③ الجامع للخطیب: 281/1 ④ ایضاً

إنه أول من دون علم الشريعة ورتبه أبوابا.[1]

''کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمِ شریعت کو مدوّن کیا اور اسے ابواب پر مرتب کیا۔''

بالکل یہ اور اس سے بعد کی باتیں موفق المکی نے مناقب الامام[2] میں قاضی سنیق بن داود الیمانی صاحب ''فضل ابی حنیفہ'' المتوفی ۴۶۰ھ کے حوالے سے نقل کی ہیں۔ غالباً یہ سب تاثر دراصل قاضی الیمانی اور مناقب الامام للموفق سے ماخوذ ہے۔

گویا یہ حضرات احادیث جمع کرنے اور انھیں ابواب پر مرتب کرنے میں اوّلیت کا شرف امام صاحب کو دیتے ہیں۔ یہ اگر ثابت ہو تو بلاشبہ یہ ان کا بہت بڑا اعزاز ہے، مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ علامہ خوارزمی رحمہ اللہ انھیں مکمل علمِ شریعت کا مدون و مرتبِ اول تحت الابواب باور کرا رہے ہیں۔ یوں نہیں کہ وہ انھیں محض احادیث تحت الابواب کا مدون اول قرار دیتے ہیں جیسا کہ عموماً سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس کے ساتھ یہ وضاحت خود کی ہے کہ ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ نے نہ علمِ شریعت کی تبویب کی اور نہ ہی کتابوں میں مرتب کیا۔ وہ حفظ پر اعتماد کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جب دیکھا کہ علم منتشر ہو رہا ہے تو انھوں نے بُرے اخلاف کے خوف سے، کہ وہ اس علم کو ضائع ہی نہ کر دیں، اسے ابواب پر مدوّن کیا۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کے حوالے سے مطلقاً تدوین کا انکار اور امام صاحب کے بارے میں ابواب پر تدوین کا اظہار بجائے خود اس بات کا مشعر ہے کہ علامہ خوارزمی انھیں مکمل طور پر علمِ شریعت کا مدوّنِ اوّل قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بات بداہتاً خلافِ واقع ہے۔ تاریخِ تدوین حدیث سے ادنیٰ شغل رکھنے والا طالبِ علم بھی اس کی کمزوری کو خوب سمجھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ علامہ الخوارزمی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ امام صاحب نے کتاب کا آغاز طہارت سے کیا پھر نماز، روزہ اور دیگر عبادات اور معاملات کو بیان فرمایا ''ثم ختم الكتاب

---

[1] جامع المسانید: 34/1 [2] مناقب الامام 136/2

بالمواریث» پھر کتاب کا اختتام کتاب المواریث پر کیا۔ [1]

اب اٹھایے کتاب الآثار اور ملاحظہ فرمایے کہ واقعی ''کتاب المواریث'' پر اس کا اختتام ہے؟ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب الآثار للامام محمد رحمہ اللہ میں، جسے امام صاحب کی'' کتاب الآثار'' کا نسخہ باور کرایا جا رہا ہے، اس میں کتاب الارث کے بعد کتاب الایمان، کتاب البیوع، کتاب الحظر والاباحۃ ہے اور کتاب الآثار قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ جسے امام صاحب کی کتاب کا نسخہ کہا جاتا ہے، میں پہلے کتاب الایمان پھر کتاب العلم پھر کتاب الآداب، کتاب الفتن، کتاب شمائل النبی ﷺ اور آخری کتاب، کتاب المناقب ہے۔ علامہ خوارزمی وغیرہ نے فقیہانہ فکر کی مناسبت سے بڑے طمطراق سے فرمایا کہ ابتدا طہارت ونماز سے، اس لیے کہ یہ تمام عبادات میں اہم ہیں اور اختتام ''مواریث'' پر اس لیے کہ یہ انسانوں کا آخری مسئلہ ہے۔ بات بڑی خوب صورت ہے مگر واقعاتی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان کا پہلا دعویٰ مبنی برحقیقت نہیں۔ البتہ خود ان کی جمع کی ہوئی ''جامع المسانید'' میں یہی ترتیب ہے۔ اسی ترتیب کو کتاب الآثار کی ترتیب کہنا بہرنوع غلط ہے۔

امام مالک کا کتب ابی حنیفہ سے استفادہ کا بے بنیاد دعویٰ

اسی طرح علامہ خوارزمی رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ دعویٰ بھی بلادلیل ہے کہ ثم تابعہ مالك بن أنس في ترتيب الموطأ ''پھر امام مالک رحمہ اللہ نے موطأ کی ترتیب میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کتاب الآثار کی اتباع کی۔'' بلاشبہ امام مالک رحمہ اللہ نے موطأ کی تکمیل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے انتقال کے عرصہ بعد کی، لیکن اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوتا ہے کہ کتاب الآثار، امام مالک رحمہ اللہ کے پیشِ نگاہ تھی۔ علامہ کوثری رحمہ اللہ اور ان کی اتباع میں مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قاضی ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن ابی العوام نے اپنے دادا کی کتاب أخبار

[1] جامع المسانید: 34/1

أبـي حـنـيـفـة [1] میں جواضافے کیے ہیں، ان میں انھوں نے بسند متصل عبدالعزیز الدراوردی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

كان مالك بن أنس ينظر في كتب أبي حنيفة وينفع بها. [2]

''امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کتابوں کو دیکھتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔''

حالاں کہ یہ ابوالعباس، احمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن احمد ابن ابی العوام مصر میں بنوعبید، جو معروف باطنی اور رافضی تھا، کی طرف سے مصر کا قاضی تھا۔ کوئی قابلِ اعتبار جملہ بھی اس کی توثیق کا منقول نہیں۔ وہی اپنے دادا کی کتاب ''اخبار ابی حنیفہ'' اپنے باپ کے واسطہ سے روایت کرتا ہے۔ اور اس کا دادا عبداللہ بن محمد کا بھی اتا پتا معلوم نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں قاضی ابوالعباس احمد نے جس سند سے یہ قول ذکر کیا ہے اس کا راوی محمد بن حازم الفقیہ بھی بحث طلب ہے۔ تتبع بسیار کے باوجود اس کا ترجمہ نہیں ملا۔ لہٰذا جب یہ قول سنداً ہی صحیح نہیں تو اس سے کتب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے امام مالک رحمہ اللہ کے استفادہ کی کہانی لغو اور بے اصل ثابت ہوتی ہے۔

اقوام المسالک میں اس حوالے سے علامہ کوثری رحمہ اللہ نے ابوعبداللہ الحسین الصیمری کی ''اخبار ابی حنیفہ واصحابہ'' [3] کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ابن الدراوردی نے فرمایا کہ ''میں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد مبارک میں عشاء کی

---

[1] مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے ابن ماجہ اور علم حدیث (ص ۱۶۱) اور مقدمہ کتاب الآثار (ص ۱۹) میں اسے قاضی ابوالعباس کی کتاب قرار دیا ہے۔ جب کہ علامہ کوثری نے اسے ابوالعباس کے دادا کی کتاب قرار دیا ہے اور اس پر قاضی ابوالعباس کے زیادات ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں «وقال أبو العباس فيما زاد على كتاب جده في أخبار أبي حنيفة» یہ کتاب ''فضائل ابی حنیفہ واخبارہ ومناقبہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ [2] اقوام المسالک للکوثری، ص99 ابن ابی العوام: 235

[3] اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ: ص74-73

نماز کے بعد دیکھا وہ دونوں باہم صبح کی نماز تک مذاکرہ کرتے رہے اور جب دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے قول وعمل سے آگاہی حاصل کر لیتا تو اسے غلط نہ کہتا۔'' یہ قول علامہ الصیمری رحمہ اللہ کی کتاب اخبار ابی حنیفہ ① میں بالا سناد مذکور ہے اور یہی قصہ ابن ابی العوام نے فضائل ابی حنیفہ ② میں ذکر کیا ہے، مگر اس کی سند بھی درست نہیں۔ اس کا ایک راوی جبرون بن عیسیٰ بن یزید مجہول ہے۔ یہ امام طبرانی رحمہ اللہ کا بھی استاد ہے اور علامہ الہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے «لم أعرفه» ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ''واہی الحدیث'' ہے اور علامہ المنذری نے فرمایا ہے:

لم أقف فيه على جرح ولا تعديل. ④

''کہ میں اس کے بارے میں جرح وتعدیل پر واقف نہیں۔''

ابن ابی العوام کی الفضائل میں یہ جبرون بن سعید بن یزید ہے، مگر صحیح ابن عیسیٰ بن یزید معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

جبرون کا استاد ایوب بن عبدالرحمٰن العراقی ابوہشام کا ترجمہ راقم کو کوشش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا اور یہی پوزیشن اس کے استاد محمد بن رشید صاحب عبدالرحمٰن بن القاسم کی ہے۔ لہٰذا دونوں بزرگوں کے مابین مذاکرہ کی یہ روایت بھی درست نہیں۔

علامہ کوثری نے اخبار ابی حنیفہ ⑤ کے حوالے سے کادح بن رحمہ سے نقل کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ایک آدمی کے پاس دو کپڑے ہیں ایک پاک اور دوسرا ناپاک، نماز کا وقت ہو جائے تو وہ کیا کرے۔ انھوں نے فرمایا: جو قابلِ استعمال ہے اسے استعمال کرے۔ کادح کہتے ہیں: کہ میں نے اس بارے میں انھیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول بتلایا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک میں ایک بار نماز پڑھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے یہ سن کر سائل کو طلب کیا اور اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا۔ علامہ کوثری رحمہ اللہ نے یہ کہانی لکھنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس کا راوی سلیمان اور کادح «متكلم فيهما» دونوں

---

① اخبار أبي حنيفة: 73,74 ② فضائل أبي حنيفة: 103 ③ مجمع الزوائد: 211/5، 249/10 ④ تراجم شيوخ الطبراني: 232 ⑤ أخبار أبي حنيفه: 74

میں کلام ہے۔ اور ساتھ اس بات کی طرف اشارہ بھی ضروری سمجھا کہ کادح کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کا شاگرد قرار دیا ہے۔

مگر عرض ہے کہ وہ «متکلم فیهما» ہی نہیں بلکہ کادح بن رحمہ کو امام ازدی وغیرہ نے کذاب کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے ترجمہ میں اس کی موضوع اور بے اصل روایات کا تذکرہ کیا ہے۔ ①

اس کا شاگرد سلیمان بن ربیع ہے۔ کادح کے ترجمہ میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے متروک قرار دیا ہے۔ اور میزان ② میں ہے کہ «ترکه الدارقطنی» اور فرمایا کہ وہ اپنے اساتذہ کے نام تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ ③

لہٰذا جب اس کے راوی کذاب اور متروک ہیں تو صرف متکلم فیہ کہہ کر اور کادح کو امام مالک رحمہ اللہ کا تلمیذ ثابت کرنے سے اس قصہ کا اثبات علامہ کوثری کے علم کی ''معراج'' ہے۔ اس نوعیت کے بعض دیگر اقوال سے علامہ کوثری رحمہ اللہ نے ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے، مگر یہ تمام کوششیں مجہول اور ناقابلِ اعتبار اقوال پر مبنی ہیں۔ دونوں بزرگ باہم معاصر تھے اگر صحیح اسانید سے ثابت ہو جائے کہ امام مالک رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے استفادہ کرتے یا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کے علم سے استفادہ کرتے تھے تو یہ ان دونوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ دونوں بزرگوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کوئی عار کا باعث نہیں۔ محدثین کے ہاں تو یہ بات ہے کہ کوئی اس وقت تک صحیح محدث نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے سے اعلیٰ، ہم عصر اور اپنے سے کم تر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ ④

---

① میزان: 399/3، اللسان: 485/5، المجروحین: 299/2، الضعفاء لأبی نعیم 134 وغیرہ ② میزان: 207/2 ③ اللسان: 91/3، الدیوان: 172، المغنی: 279/1، الضعفاء لابن الجوزی: 19/2 ④ مقدمة ابن الصلاح

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ

افسوس اس بات کا ہے کہ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے امام ابوحنیفہ سے استفادہ کا ذکر تو خوب تفصیل سے کرتے ہیں، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استفادہ سے حتی الوسع صرف نظر کر جاتے ہیں یا مقدور بھر اس کی تغلیط اور اس کی بے ثبوتی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اندازہ کیجیے کہ امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے تقدمۃ الجرح والتعدیل میں ذکر کیا ہے:

حدثنا أبوبكر الجارودي محمد بن النضر النيسابوري قال: سمعت أحمد بن حفص يقول: سمعت أبي يقول: سمعت إبراهيم بن طهمان يقول: أتيت المدينة فكتبت بها ثم قدمت الكوفة فأتيت أباحنيفة في بيته فسلمت عليه فقال لي: عمن كتبت هناك؟ فسميت له فقال: هل كتبت عن مالك بن أنس شيئا؟ فقلت: نعم، فقال جئني بما كتبت عنه، فأتيته به فدعا بقرطاس ودواة فجعلت أملي عليه وهو يكتب.[1]

''ابراہیم بن طہمان فرماتے ہیں: میں مدینہ طیبہ آیا تو میں نے وہاں سے احادیث لکھیں پھر میں کوفہ گیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے گھر میں ملا، انھیں سلام کہا۔ تو انھوں نے فرمایا: تم نے وہاں مدینہ طیبہ میں کس کس سے احادیث لکھی ہیں؟ میں نے ان کا نام لیا تو انھوں نے فرمایا کیا تم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بن انس سے بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، انھوں نے فرمایا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ میرے پاس لاؤ، میں وہ ان کے پاس لے گیا تو انھوں نے کاغذ اور

[1] تقدمة: 3,4

سیاہی طلب کی، میں انھیں وہ احادیث لکھواتا جاتا اور وہ لکھتے جاتے۔"

امام ابراہیم رحمہ اللہ بن طہمان ثقہ محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلمیذ ہونے کے ناطے مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم نے ابن ماجہ اور علم الحدیث [1] میں ان کا خوب تعارف کروایا ہے۔

امام ابراہیم رحمہ اللہ کا اسی ناطے سے ذکر اگر علامہ قرشی نے الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیۃ میں کیا تو قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بھی ترتیب المدارک [2] میں انھیں امام مالک رحمہ اللہ کا تلمیذ رشید قرار دیا ہے۔ امام ابراہیم کے اس بیان کی سند بھی ثقہ وصدوق راویوں پر مشتمل ہے۔ [3]

---

(1) ابن ماجہ اور علم الحدیث: 103,104 (2) ترتیب المدارک: 252/1

(3) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ ہی نے سند صحیح سے ذکر کیا ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی سے کہا گیا: آپ یہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے "اعلم" ہیں؟ انھوں نے فرمایا: بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ امام مالک رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاد حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ سے بھی "اعلم" ہیں۔ (تقدمہ الجرح والتعدیل: 11) یہی قول ابن عبدالبر نے الانتقاء (62) میں بھی نقل کیا ہے۔ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اسے ایک اور سند سے بھی نقل کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ علامہ عبدالقادر قرشی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حماد بن ابی سلیمان نے فرمایا: کوفہ والو! تمھیں مبارک ہو تمہارے بچے کیا، بچوں کے بچے بھی عطاء رحمہ اللہ، طاؤس رحمہ اللہ، مجاہد رحمہ اللہ سے زیادہ فقیہ ہیں۔ (الجواہر المضیہ: 226/1) علامہ القرشی رحمہ اللہ نے یہ قول امام مغیرۃ بن مقسم رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے مگر افسوس کہ اسے مکمل نقل نہیں کیا۔ امام مغیرۃ رحمہ اللہ، حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ کا یہی قول نقل کر کے مزید فرماتے ہیں: «فرأینا ذلك بغیا منه» "کہ ہم ان کا یہ قول بغاوت سمجھتے تھے۔" (میزان: 596/1، سیر اعلام النبلاء: 235/5) حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہ قول امام العقیلی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور الضعفاء للعقیلی (302/1) میں اس کے بعد مزید یہ الفاظ بھی ہیں: «قال جریر قال مغیرۃ کذب حماد» کہ "مغیرہ رحمہ اللہ نے فرمایا: حماد رحمہ اللہ نے غلط کہا ہے۔" امام حماد رحمہ اللہ بن ابی سلیمان کی یہ "جسارت" امام محمد بن الحسن شیبانی رحمہ اللہ کے بیان کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ جب ان سے امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں قرآن پاک کو زیادہ جاننے والے ہمارے استاد امام مالک رحمہ اللہ ہیں یا آپ کے استاد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ؟ تو امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: امام مالک رحمہ اللہ۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ نے پوچھا سنت کو زیادہ جاننے والے ہمارے استاد ہیں یا آپ کے؟ تو انھوں نے فرمایا: آپ کے استاد=>

علامہ کوثری کی تلبیس

یہی وجہ ہے کہ علامہ کوثری اس کی سند پر تو کوئی کلام نہ کر سکے لیکن اس کے انکار کی جو سبیل انھوں نے نکالی وہ انھی کے الفاظ میں پڑھیے، لکھتے ہیں:

وأما ماذكره ابن أبي حاتم في تقدمة الجرح والتعديل من أن أبا حنيفة كان يطلع على كتب مالك فيخدش فيه أن مالكا لم يؤلف شيئا قبل الموطأ وكان تأليفه للموطأ في أواخر عهد المنصور العباسي بعد وفاة أبي حنيفة.[1]

یہی بات علامہ کوثری نے علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی کتاب «الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء» کے حواشی میں کہی اور جب یہی کتاب شیخ ابو غدہ مرحوم کی تحقیق ومراجعت سے شائع ہوئی تو انھوں نے بھی حاشیہ[2] میں حق تلمذ ادا کرتے ہوئے اسے علامہ کوثری رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کر دیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام ابراہیم رحمہ اللہ کے مذکورۃ الصدر بیان میں موطأ امام مالک کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ حدیث کا درس موطأ کی تالیف سے پہلے بھی دیتے تھے اور تلامذہ ان سے مستفیض ہوتے تھے۔ بلکہ وہ سترہ سال کے تھے جب وہ مسند نشیں ہوئے جیسا کہ آئندہ اس کا باحوالہ ذکر ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کی

=> یعنی امام مالکؒ۔ پھر امام شافعیؒ نے فرمایا: صحابہ کرامؓ اور متقدمین کے اقوال کو زیادہ جاننے والے ہمارے استاد ہیں یا آپ کے؟ تو انھوں نے فرمایا: امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: اب قیاس رہ گیا تو قیاس انھی سے مستنبط ہوتا ہے۔ جو اصول نہ جانتا ہو وہ قیاس کس سے کرے گا؟ (تقدمۃ الجرح: 12,13) فقہ الحدیث تو کتاب وسنت سے یا اقوالِ صحابہ سے مأخوذ ہے اور اس میں امام مالکؒ کو برتری حاصل ہے۔ رہی فقہ اہل الرأی تو ایں چیزے دیگر است۔

[1] اقوام المسالك [2] حاشیہ: 44

مرویات کو قلم بند کیا، کوفہ تشریف لے گئے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دیگر شیوخِ مدینہ کی بجائے امام مالک رحمہ اللہ کی مرویات کے بارے میں اشتیاق کا اظہار کیا۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے وہ روایات لکھوائیں اور انھوں نے لکھ لیں۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں امام مالک رحمہ اللہ کی کیا قدر و منزلت تھی۔ وہ خود پوچھتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی کچھ لکھا؟ جب بتلایا گیا کہ جی ہاں، تو بڑے اشتیاق سے انھیں قلم بند کیا۔ مگر دیکھا آپ نے کہ اس کی تغلیط و تردید کے لیے علامہ کوثری رحمہ اللہ نے ایسی کہانی بنائی جس کا اصل کہانی میں کوئی اشارہ تک نہیں۔

اسی طرح علامہ ذہبی نے التذکرہ میں اشہب بن عبدالعزیز کا یہ بیان نقل کیا ہے:

رأيت أبا حنيفة بين يدي مالك كالصبي بين يدي أبيه. [1]

''میں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے اس طرح دیکھا جس طرح بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو۔''

یہ واقعہ علامہ شبلی رحمہ اللہ نے سیرۃ النعمان میں اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے حیات امام مالک رحمہ اللہ میں بھی ذکر کیا ہے۔

علامہ کوثری نے اقوام المسالک میں اس کے بارے میں فرمایا:

''اشہب کا سنِ ولادت حسبِ بیان ابن یونس ۱۴۵ھ ہے اور اس عمر کے بچے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مصر سے مدینہ طیبہ جائے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو امام مالک رحمہ اللہ کے یہاں دیکھ سکے۔''

یہی بات علامہ کوثری کے حوالے سے مولانا نعمانی نے ابن ماجہ اور علم حدیث [2] میں کہی ہے۔

[1] التذکرہ: 209/1 [2] ابن ماجه و علم حدیث: 162

اشہب کا سن پیدائش

حالاں کہ اشہب بن عبدالعزیز کا سنِ ولادت ۱۴۰ھ ہے ۱۴۵ھ نہیں۔ جیسا کہ الثقات لابن حبان (1) میں ہے۔ یہی بات علامہ ابن عبدالبر نے الانتقاء (2) میں کہی ہے کہ «ولد سنة أربعين ومائة» اشہب ۱۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور یہی کچھ انھوں نے ترتیب المدارک (3) میں فرمایا ہے۔

بلکہ علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان (4) میں ابن یونس ہی سے ان کی پیدائش ۱۴۰ھ میں نقل کی ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی پر اعتماد کیا ہے۔ (5)

دراصل تہذیب التہذیب (6) میں ہندسوں میں ان کی پیدائش ۱۴۵ھ لکھی ہوئی ہے جس سے انھیں غلطی لگی۔ مگر قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ تہذیب کے علاوہ الانتقاء اور ترتیب المدارک تو ان کے سامنے تھیں۔ دوسرے مراجع سے بھی وہ غافل نہ تھے، مگر چونکہ بات کی تغلیط کرنا تھی اس لیے تہذیب کا سہارا ناگزیر تھا۔ تقریب التہذیب جو تہذیب ہی کا اختصار ہے سے بھی یہ غلط فہمی دور ہو سکتی تھی جس میں لکھا «مات سنة أربع وهو ابن أربع وستين» کہ وہ ۲۰۴ میں فوت ہوئے جب کہ ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ نتیجہ واضح ہے کہ یوں ان کا سن پیدائش ۱۴۰ھ ہی بنتا ہے۔

علاوہ ازیں اس بات سے بھی وہ غالبًا بے خبر نہیں کہ تہذیب کے نسخہ میں اس قسم کی طباعتی و دیگر اغلاط بھی پائی جاتی ہیں۔ بقیہ بن ولید کی پیدائش ۱۱۵ھ میں لکھی ہوئی ہے جب کہ صحیح ۱۱۰ھ ہے۔ حارث بن مسکین کی پیدائش ۲۲۵ھ میں لکھی ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ ۲۵۰ میں پیدا ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح اشہب کے ترجمہ میں بھی ۱۴۰ھ کی بجائے ۱۴۵ھ غلط طبع ہوا

---

(1) الثقات لابن حبان: 136/8 (2) الانتقاء: 97 (3) ترتیب المدارك: 452/1 (4) وفیات الأعیان: 250/1، 249 (5) العبر: 345/1، تاریخ الإسلام: 62/12، سیر أعلام النبلاء: 501/9، شذرات الذهب: 12/2، حسن المحاضرة: 122/1، التهذیب للمزي: 294/2، إكمال تهذیب الكمال: 246/1، خلاصة تهذیب الكمال: 117/1 (6) تهذیب التهذیب: 360/1

ہے۔ لہٰذا جب اشہب ۱۴۰ھ میں پیدا ہوئے، ۵، ۶ سال کی عمر میں مدینہ طیبہ آئے ہوں تو اس میں کوئی امر مستبعد نہیں۔ محدثین کرام کے ہاں تو سنِ شعور میں بچے کا سماع صحیح ہے گو وہ پانچ سال سے کم عمر کا ہی کیوں نہ ہو۔ امام ابو محمد رحمہ اللہ اصبہانی پانچ سال کے تھے کہ انھوں نے قرآنِ مجید یاد کر لیا تھا اور چار سال کے تھے جب وہ ابو بکر المقریٔ کے ہاں سماعِ حدیث کے لیے حاضر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ جیسے ناقدِ رجال نے بھی اس کی تردید نہیں، بلکہ تصدیق وتائید کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

فهذا يدل على حسن أدب أبي حنيفة وتواضعه مع كونه أسن من مالك بثلاث عشر سنة.[1]

''یہ واقعہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے حسنِ ادب اور ان کی تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ وہ عمر میں امام مالک رحمہ اللہ سے ۱۳ سال بڑے تھے۔''

مگر غور فرمایئے علامہ کوثری نے ایک غلط حوالے کے سہارے اس قصہ کی تاریخی اعتبار سے تردید کر دی۔

یہاں یہ بات بھی یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی کہ علامہ عبدالرحمٰن المعلمی نے التذکرہ کے حاشیہ میں فرمایا ہے کہ ''یہ واقعہ درست نہیں کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وفات کے وقت اشہب کی عمر پانچ سال تھی۔ صحیح یہ ہے کہ میں نے محمد بن حسن صاحب ابی حنیفہ کو امام مالک رحمہ اللہ کے پاس دیکھا۔'' بلکہ علامہ البانی نے بھی اشہب کی پیدائش ۱۴۵ھ ہی لکھی ہے۔[2] لیکن یہاں علامہ المعلمی رحمہ اللہ اور علامہ البانی رحمہ اللہ کو بھی تہذیب میں اشہب کے سنِ پیدائش ۱۴۵ھ سے غلطی لگی تبھی تو وہ امام صاحب کی وفات پر ان کی عمر پانچ سال بتا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات ہی بجائے خود غلط ہے کہ اشہب ۱۴۵ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ ابھی ہم با حوالہ ذکر کر آئے ہیں۔ یہاں علامہ ابو غدہ رحمہ اللہ کی ہوشیاری بھی دیکھئے کہ وہ الانتقاء کے

---

[1] التذکرہ [2] هامش التنكيل: 185

حواشی میں علامہ المعلمی کے حوالے سے اشہب کے سنِ پیدائش کے بارے میں تو نقل کرتے ہیں، مگر یہی بات پہلے علامہ کوثری نے کہی مگر ان کا وہ نام لینا گوارا نہیں کرتے، آخر کیوں؟ کیا وہ علامہ کوثری کے اس موقف سے بے خبر تھے؟ ہرگز نہیں۔

البتہ علامہ کوثری نے الانتقاء کے حواشی میں کہا ہے کہ ''اشہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت دس سال کے تھے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے آخری ایام میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں ملے۔ ان کی ملاقات ۱۴۶ھ سے پہلے ہوئی جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بلند مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مؤدب الاطفال نہ تھے۔''[1]

قابلِ غور بات ہے کہ جب شیخ ابوغدہ کے نزدیک بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت اشہب کی عمر دس سال تھی تو پھر علامہ المعلمی سے اشہب کی پیدائش ۱۴۵ھ میں نقل کرنا چہ معنی دارد؟ وہ یہی بات اپنے شیخ علامہ کوثری سے بھی نقل کیوں نہیں کرتے؟ محض اس لیے کہ اس کی اگر تردید ہو تو علامہ کوثری پر اس حوالے سے تنقید نہ ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی بلندیٔ مرتبت بلاشبہ ان کے دورِ ابتلا سے پہلے بھی تھی بعد میں مزید اجاگر ہوتی چلی گئی۔ یہ ابتلائی دور ۱۴۶ھ میں آیا اس سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی قدر و منزلت کیا تھی اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اپنے استاد نافع رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں مسندِ افتا پر سرفراز ہوئے۔ امام نافع ۱۱۷ھ میں فوت ہوئے۔ ایوب سختیانی کا بیان ہے کہ میں امام نافع رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں مدینہ طیبہ گیا تب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا حلقۂ درس تھا۔ بلکہ مصعب تو فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ درس امام نافع رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا تھا۔ امام سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سترہ سال کے تھے کہ مسندِ درس پر مسند نشین ہوئے۔ اور خود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب مجھے ستر شیوخ نے فرمایا کہ آپ درس و افتا کے اہل ہیں تب میں نے درس دینا شروع کیا۔[2]

خود علامہ ابوغدہ نے نقل کیا ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے علمائے مدینہ کے بارے میں پوچھا

---

[1] حاشیہ الانتقاء: 43,44 [2] ترتیب المدارک: 125,126/1

گیا تو انھوں نے فرمایا: «الغلام الأبیض المحمر، یرید مالکا» سرخ وسفید رنگ کا ''غلام'' اس سے ان کی مراد امام مالک رحمہ اللہ تھے۔ [1]

اس لیے یہ کہنا کہ امام مالک رحمہ اللہ کو شہرت ان کے دورِ ابتلاء کے بعد حاصل ہوئی اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ان سے ملاقات امام مالک کے علوِ مرتبت «قبل أن یأخذ شأنه» سے پہلے تھی، درست نہیں۔ ۱۴۶ھ سے پہلے دونوں بزرگوں کی ملاقات ایک حقیقت ہے، مگر یہ کہنا کہ امام مالک رحمہ اللہ کی شہرت اور بلندیٔ مرتبت ۱۴۶ھ کے بعد ہوئی بہرنوع غلط ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ امام مالک رحمہ اللہ مؤدبِ اطفال نہ تھے محض دل کی تسلی کا سامان ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ اشہب نے صغرسنی میں جب دونوں کا اجتماع دیکھا تو وہ بھی امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے دوزانو بیٹھے تھے اور درس کی سماعت کر رہے تھے؟

ہماری ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ علامہ کوثری اور ان کی معنوی ذریت بے بنیاد قوال کی بنیاد پر امام مالک رحمہ اللہ کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مستفید ہونے کا تاثر تو بڑے شد و مد سے بیان کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں وہ یہ گوارا نہیں کرتے کہ ن کا بھی امام مالک رحمہ اللہ سے مستفید ہونا تسلیم کیا جائے۔ اوران کے علم وفضل کا اعتراف کیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم اشہب کے بیان کے حوالے سے مزید یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے پچپن (۵۵) حج کیے تھے۔ [2] بلاشبہ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندے کو عطا فرمایا ہے۔ م ابن عیینہ نے ستر حج کیے تھے [3] اور یہ بات بھی نعمانی صاحب مرحوم کے ہاں مسلّم ہے امام صاحب نے پہلا حج ۹۶ھ میں کیا تھا۔ [4]

قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے پہلا حج ۹۶ھ میں کیا جب کہ ان کی عمر سولہ

---

[1] حاشیة الانتقاء: 43، ترتیب المدارك: 129/1 [2] ابن ماجه اور علم حدیث: 16 [3] السیر وغیرہ [4] حاشیه مقدمه کتاب التعلیم: 36 وغیرہ

سال تھی تو اس کے بعد ہر سال آپ حج پر گئے ہوں تو پھر بھی ۵۵ کی تعداد پوری نہیں ہوتی۔ شعبان ۱۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوتا ہے اس اعتبار سے ان کے حج تعداد میں ۵۴ ہیں ۵۵ نہیں۔ ممکن ہے تغلیباً راوی نے ۵۵ کہا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں ۵۴ یا ۵۵ مرتبہ حج کی سعادت بخشی۔ راوی کا اگر یہ بیان صحیح ہے تو یقیناً یہ بڑی سعادت ہے، مگر ہمارا سوال یہ ہے کہ جب ان کی یہ فضیلت ثابت ہے تو کیا ۱۴۶ھ کے پس و پیش حج کے ساتھ مدینہ طیبہ بھی جاتے تھے یا نہیں؟ حج بیت اللہ کے لیے جائیں اور مدینۂ طیبہ نہ جائیں تو یہ کہیں آپ ﷺ سے ''جفا'' کے زمرہ میں تو نہیں آتا؟ کیا فرماتے ہیں علمائے احناف اس مسئلہ میں؟ مدینۂ طیبہ بھی گئے ہیں تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا انکار محض مجادلہ ہے اور پھر ان آخری سالوں میں اشہب کی مدینۂ طیبہ میں موجودگی پر اعتراض میں کون سی معقولیت رہ جاتی ہیں؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی ترتیب المدارک [1] میں نہیں بلکہ موفق حنفی اور الکردری حنفی جنھوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب پر کتابیں لکھی ہیں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت لی ہے۔ [2]

علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے الانتقاء [3] میں، علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے السیر [4] میں، علامہ ابن فرحون رحمۃ اللہ علیہ نے الدیباج المذہب [5] میں، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدۃ القاری [6] میں امام صاحب کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تلمیذ بتلایا ہے۔ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عندی ثلاثة أحاديث رواها أبوحنيفة عن مالك وقال علاء الدين مغلطائی الحنفی روی أبوحنيفة عن مالك بلا ريب. [7]

---

[1] ترتیب المدارک: 1/143,257 [2] المناقب للموفق: 1/50، وللکردری: 1/86 [3] الانتقاء: 41 [4] السیر: 8/52 [5] الدیباج المذہب: 30 [6] عمدۃ القاری: 1/37 [7] العرف الشذی: 389

''کہ میرے پاس تین احادیث ہیں جنھیں امام صاحب امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں اور علامہ مغلطائی حنفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلاریب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔''

امام صاحب رحمہ اللہ کا امام ابراہیم بن طہمان رحمہ اللہ سے امام مالک رحمہ اللہ کی روایت کا نقل کرنا پہلے ذکر ہوا مگر آپ پڑھ آئے ہیں یہ علامہ کوثری کو قطعاً گوارا نہیں۔ اسی طرح امام صاحب کا امام مالک رحمہ اللہ سے روایت لینا بھی ان کے ہاں قابلِ برداشت نہیں۔ اس کے لیے انھوں نے مستقل رسالہ «أقوام المسالك في بحث رواية مالك عن أبي حنيفة ورواية أبي حنيفة عن مالك» لکھا جو ان کے رسالہ احقاق الحق کے آخر میں مطبوع ہے۔

علامہ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اپنے المقدمہ میں ذکر فرمایا تھا کہ سب سے اجل سند ''شافعی عن مالک عن نافع عن ابن عمر'' ہے۔ جس پر علامہ مغلطائی حنفی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ جلالتِ شان کے اعتبار سے یہ بات درست ہے مگر اس پر بھی اعتراض ہے کہ اجل سند ''ابوحنیفہ عن مالک'' ہے جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ [1]

علامہ عراقی نے تو اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ یہ اعتراض درست نہیں، امام دارقطنی رحمہ اللہ نے یہ روایت کتاب المدبج میں ذکر کی ہے لیکن وہ ''مالک عن نافع عن ابن عمر'' کی سند سے نہیں بلکہ ایک اور سند سے ہے جب کہ بحث ''مالک عن نافع عن ابن عمر'' کی سند سے روایت میں ہے۔ [2]

غور فرمایئے یہ دونوں حضرات ''ابوحنیفہ عن مالک'' کی روایت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ علامہ مغلطائی رحمہ اللہ اسے ''اجل الاسانید'' قرار دیتے ہیں اور علامہ عراقی رحمہ اللہ صاف فرماتے ہیں کہ جس روایت کی بنیاد پر یہ کہا گیا وہ مالک عن نافع کی سند سے نہیں اس لیے یہ اجل الاسانید نہیں جیسا کہ علامہ مغلطائی رحمہ اللہ کا خیال ہے۔ گویا علامہ عراقی رحمہ اللہ نے

---

[1] إصلاح كتاب ابن الصلاح: 52/2 [2] التقييد والإيضاح: 23

''ابوحنیفہ عن مالک'' کا انکار نہیں کیا بلکہ ''ابوحنیفہ عن مالک عن نافع'' کی سند کا انکار کیا ہے۔

مگر حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ اور ان کے بعد خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے دو مختلف اسناد سے دو روایتیں ذکر کی ہیں اور ان دونوں کی صحت میں کلام ہے۔ دارقطنی رحمہ اللہ اور خطیب رحمہ اللہ نے ان کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا۔ اگر ان کا ثبوت تسلیم بھی کیا جائے تو بھی مغلطائی رحمہ اللہ کا اعتراض درست نہیں کیونکہ جو مذاکرہ کی صورت میں ایک دو احادیث روایت کرتا ہے اسے اس راوی پر کیوں کر فضیلت ہو سکتی ہے جس نے ہزاروں روایتیں بیان کی ہوں۔ ①

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام دارقطنی رحمہ اللہ اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی بیان کی ہوئی روایت کو ضعیف قرار دے کر فرمایا ہے کہ اگر اس کا ثبوت ہے تو یہ بطور مذاکرہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے سنی ہیں۔ باقاعدہ مجلسِ سماع میں نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے باقاعدہ سماع کیا ہے اور ہزاروں روایات ان سے سنی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ

عمران بن عبد الرحيم الأصفهاني حدثنا بكار بن الحسن حدثنا إسماعيل بن حماد بن أبي حنيفة عن أبيه عن أبي حنيفة عن مالك عن عبد الله بن الفضل عن نافع بن جبير عن ابن عباس.

کی سند سے ہے۔ جس کے الفاظ ہیں الأيم أحق بنفسها من وليها، الحديث یہ روایت اسی سند سے مسند ابی حنیفہ لابی نعیم ② اور تاریخ بغداد میں ③ مذکور ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے، بعض نے اسے ''اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفہ عن

---

① النكت: 263/1 ② مسند أبي حنيفه لأبي نعيم: 433، جامع المسانيد: 119/2، سير أعلام النبلاء: 124/8 ③ تاريخ بغداد، 376/5

ابی حنیفہ عن مالک‘‘ اور بعض نے ’’حماد بن ابی حنیفہ عن مالک‘‘ بیان کیا ہے۔ جیسا کہ الخوارزمی نے اشارہ کیا ہے۔ اور علامہ کوثری نے بھی اقوام المسالک میں اس کی تفصیل دی ہے۔ مگر انھوں نے الانتقاء کے حاشیہ ① میں اسے ’’حماد بن ابی حنیفہ ثنا مالک‘‘ کی سند سے نقل کرنے میں جو گھپلا کیا ہے اس کی دلچسپ وضاحت التنکیل کے حاشیہ ② میں علامہ البانی نے بیان کر دی ہے، مگر یہ تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ علامہ کوثری کو اصرار ہے کہ یہ روایت ’’حماد عن مالک‘‘ کی سند سے ہے۔ ’’ابوحنیفہ عن مالک‘‘ کی سند سے نہیں۔ اس میں جو غرض ہے اس کی نقاب کشائی علامہ المعلمی نے التنکیل ③ میں کر دی ہے۔ شائقین التنکیل ملاحظہ فرمائیں۔

اس روایت کا دارومدار عمران بن عبدالرحیم الاصبہانی پر ہے۔ وہ بواسطہ ابوحنیفہ عن مالک ہو یا حماد عن مالک ہو، عمران وضاع ہے۔ اور علامہ کوثری نے بھی تسلیم کیا ہے۔ «اتهمه غير احد بوضع هذا السند» کہ بہت سے اہلِ علم نے اس سند کو وضع کرنے میں عمران کو متہم قرار دیا ہے ④ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: «هو الذي وضع حديث ابي حنيفة عن مالك» ⑤ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ’’ابوحنیفہ عن مالک‘‘ کی روایت نہیں تو علامہ مغلطائی کا ’’ابوحنیفہ عن مالک‘‘ کی سند کو ’اجل الاسانید‘ کہنا کس ’بنیاد‘ پر ہے؟ آپ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنیاد بیتِ عنکبوت سے کمزور تر ہے مگر سرے سے اس کے انکار میں کوئی معقولیت نہیں۔ یہی عمران ہے جو کبھی ’’حماد عن مالک‘‘ کہتا ہے کبھی ’’اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفہ عن ابی حنیفہ عن مالک‘‘ کہتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ جامع المسانید ⑥ کی ایک سند میں سرے سے عمران کا واسطہ ہی ساقط ہے اور یہ واسطہ مسند امام لابن خسرو میں بھی ساقط ہے۔ ⑦ دوسری دو اسانید میں اسے عمران بن عبدالرحمن کہا گیا ہے۔ جامع المسانید میں اس نوعیت کی طباعتی اغلاط بہت ہیں۔ اسی طرح

---

① حاشیہ الانتقاء: 42 ② حاشیہ: 186/1 ③ التنکیل: 186/1 ④ اقوام المسالک، ص 100

⑤ میزان: 238/3، نیز دیکھیے لسان: 347/4 ⑥ جامع المسانید: 119/2

⑦ مسند الامام لابن خسرو 813/2

مسند ابی حنیفہ لابی نعیم [1] میں «أنبأ أبو محمد بن الضحاك بن عمرو بن أبي عاصم» بھی درست نہیں، صحیح «أنبأ أبو علي محمد بن الضحاك بن عمرو» ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ تھا کہ ''ابوحنیفہ عن مالک'' کی سند سے بھی روایت موجود ہے۔ مگر علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے یہ بات بڑی ناگوار تھی۔ انھوں نے تمام مباحث سے صرف نظر کر کے بات ہی یہ بنائی کہ یہ سند ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ''حماد عن مالک'' ہے۔ چلیے یہی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کا راوی بھی تو وہی عمران بن عبدالرحیم ہے جو متہم ہے۔ پھر آپ کیوں کہتے ہیں کہ حماد، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں۔ اس کے علاوہ بھی علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے تین روایات ذکر کی ہیں اور ان پر کلام کیا ہے۔ ان کے علاوہ امام ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے مسند ابی حنیفہ میں ایک اور سند سے ''ابوحنیفہ عن مالک'' کے واسطے سے روایت کی ہے، مگر اس کی سند بھی محلِ نظر ہے۔ علامہ بدرالدین الزرکشی نے النكت على ابن الصلاح میں تو کہا ہے کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مستقل جزء ''ابوحنیفہ عن مالک'' کی مرویات پر مشتمل ہے۔ اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ «أسأل الله أن يمن علي بالوقوف على مؤلف الدارقطني فى ذلك» میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ پر مطلع فرما کر میرے اوپر احسان فرمائیں۔ [2] بلکہ جامع المسانید [3] سے ایک روایت اسی حوالے سے نقل کر کے فرماتے ہیں: «فهذا ثابت وقد سررت بوجوده كثيرا» یہ ثابت ہے اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ [4]

گویا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ امام صاحب کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کے قائل ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے عمران کی روایات کے ضمن میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی

---

[1] مسند أبي حنيفه لأبي نعيم: 433، رقم: 336 [2] تزيين الممالك [3] جامع المسانيد: 440/1 [4] تزيين الممالك

یہ بات تو تنویر الحوالک[1] کے حوالے سے نقل کر دی کہ «قیل إنه رواه عن أبي حنيفة ولا يصح» [2] مگر تزیین الممالک میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا جو موقف ہے اسے نظر انداز کر دیا۔

ہمیں یہاں صرف یہ عرض کرنا تھا کہ علامہ کوثری رحمہ اللہ اور ان سے متاثرین کا پیمانہ انصاف پر مبنی نہیں۔ ''ابوحنیفہ عن مالک'' کے حوالے سے تنقید کا ہر حربہ اختیار کرتے ہیں، مگر ''مالک عن ابی حنیفہ'' کے حوالے سے انھیں اصرار ہے کہ یہ صحیح ہے اور امام مالک رحمہ اللہ، امام صاحب کی کتابوں سے مستفید ہوتے تھے۔ موطا کی ترتیب میں انھوں نے کتاب الآثار کو پیش نظر رکھا تھا۔ حالانکہ یہ دعویٰ بھی عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

کیا کتاب الآثار پہلی صحیح کتاب ہے؟

پہلے مولانا نعمانی مرحوم کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے کہ ''کتاب الآثار'' ''ام الام'' ہے اور ''امت کے پاس احادیثِ صحیحہ کی سب سے قدیم ترین کتاب یہی ہے۔'' مقدمہ کتاب الآثار[3] میں بھی ان کے الفاظ ہیں: ''اس میں تبویب کے ساتھ ساتھ صحیح روایات کے درج کرنے کا التزام تھا۔'' بڑے طمطراق سے انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''کتاب الآثار میں جو احادیث ہیں وہ موطا کی روایات سے قوت وصحت میں کم نہیں۔ ہم نے خود اس کے ایک ایک راوی کو جانچا اور ایک ایک روایت کو پرکھا ہے۔''[4]

اسی طرح انھوں نے ماتمس إليه الحاجة میں بھی لکھا ہے۔

كتاب الآثار هو أول مصنف في الصحيح.

حالانکہ کتاب الآثار میں منقطع، مراسیل روایات باکثرت ہیں۔ ہماری تتبع کے مطابق اس میں کل مرفوع روایات تقریباً ۱۰۰ ہیں، جن میں ۵۳ مرسل و منقطع ہیں۔ اسانید میں

---

[1] تنویر الحوالک: 62/2 [2] اقوام المسالك [3] کتاب الآثار: 22 [4] ابن ماجہ اور علم حدیث: 162 امام ابن ماجہ وکتابہ السنن: 58

مدلس ومختلط، مجہول وضعیف بلکہ متروک راوی پائے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود نعمانی مرحوم کو یہ سب صحیح معلوم ہوتی ہیں اور کتاب الآثار پہلی صحیح کتاب قرار پاتی ہے۔ کیا عبدالکریم بن ابی المخارق، طریف بن شہاب، ابان بن ابی عیاش، مسلم بن کیسان الاعور، ابراہیم بن یزید المکی، جراح بن منہال، اسماعیل بن مسلم مکی، مجالد بن سعید، لیث بن ابی سلیم، محمد بن زبیر بصری، سعید بن مرزبان وغیرہ جیسے کذاب، متروک اور ضعیف راوی بھی نعمانی صاحب کے ہاں ثقہ اور ان کی احادیث صحیح ہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ أخبرنا شيخ، عن شيخ، عن رجل، حدثنا شيخ لنا کہہ کر روایت کرتے ہیں۔ کیا یہ سب شیوخ ثقہ قرار دیے جائیں گے؟ حارث بن زیاد، حنظلہ بن بناتہ، کدام بن عبدالرحمٰن، محمد بن عبیدۃ، ابوکباش، ابوسوار ولید بن عثمان، اسحاق بن ثابت، اس کا باپ ثابت، عبداللہ بن داود، ابوعلی الصیقل، ابونصر سلیمی، ابوغسان، ام ثور، ابوجبلہ، عبدالرحمٰن بن ذاذان ایسے راوی ہیں جو مجہول اور مستور ہیں۔ کیا ان سب کی روایات ''صحیح'' ہیں؟

کتاب الآثار میں تقریباً ستر فیصد روایات حماد بن ابی سلیمان سے ہیں۔ جبکہ حماد مختلط ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ حماد سے شعبہ، سفیان، ہشام الدستوائی کی روایات تو درست ہیں ان کے علاوہ متاخرین کی روایات میں عجائبات ہیں۔ [1] علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد [2] میں فرمایا ہے: «لا یقبل من حديث حماد إلا ما روى عنه القدماء شعبة وسفيان الثوري وهشام الدستوائي ومن عدا هؤلاء رواه عنه بعد الاختلاط» امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی ان کے قدماء تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے اس لیے کتاب الآثار کی ۷۰ فیصد روایات غیر معتبر ہیں۔ الا یہ کہ ثابت کیا جائے کہ امام صاحب ان کے قدماء تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ إذلیس فلیس یہ تو محض ایک سرسری جائزہ ہے۔ اب آیئے ذرا اس کی ضروری تفصیل بھی ملاحظہ فرمایئے اور مولانا نعمانی کا دعویٰ بھی دیکھیے کہ ہم نے خود اس کے ایک ایک راوی کو دیکھا اور ایک ایک

[1] الجرح والتعدیل: 147/3، التہذیب وغیرہ [2] مجمع الزوائد: 119,120/1

روایت کو پرکھا ہے، اس میں صحیح روایات کا التزام ہے۔

پہلی روایت

کتاب الآثار میں حدیث نمبر۴ اور کتاب الآثار قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی پہلی حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاذ ''ابوسفیان'' ہیں۔ جن کا نام طریف بن شہاب ہے۔ امام احمد، ابن معین، ابو حاتم، بخاری، ابوداود، نسائی، دارقطنی، ابن حبان رحمہم اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں: «أجمعوا على أنه ضعيف الحديث» ''تمام محدثین کا اجماع ہے کہ وہ ضعیف ہے۔'' بلکہ امام احمد رحمہ اللہ، امام ابوداود رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: لیس بشيء اور امام نسائی رحمہ اللہ نے متروک، لیس بثقة کہہ کر سخت جرح کی ہے۔ ①

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے بھی ضعیف کہا ہے۔ ② حافظ عبدالحق نے فرمایا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔ ③ علامہ ابن الترکمانی اس پر جرح نقل کر کے بالآخر لکھتے ہیں: «لا يصح ان يستشهد به» کہ یہ اس لائق نہیں کہ اس سے استشہاد کیا جائے۔ ④ مولانا ابوالوفا افغانی رحمہ اللہ جنھوں نے کتاب الآثار از امام محمد رحمہ اللہ اور کتاب الآثار از قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ پر حواشی لکھے ہیں: وہ بھی ایک کلمۂ توثیق اس کے بارے میں نہیں لکھ سکے۔ بس اس قدر تعارف پیش کر سکے کہ ''فلاں فلاں سے اس نے روایت لی ہے اور فلاں فلاں اس سے روایت کرتے ہیں، ترمذی اور ابن ماجہ کے راوی ہیں۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ امام صاحب کے استاد ابوسفیان طریف بن شہاب ضعیف اور اس کی یہ روایت بھی ضعیف۔ مگر نعمانی صاحب نے تو ایک ایک راوی اور ایک ایک حدیث کا جائزہ لے کر حکم صادر فرمایا ہے کہ اس کی تمام احادیث صحیح اور یہ پہلی صحیح کتاب ہے۔ وہ تو اس دنیائے فانی سے چلے گئے، سب نے جانا ہے، اللہ تعالیٰ ایمان سے لے جائے، زندہ ہوتے تو دریافت کرتے حضرت! طریف کو کس نے ثقہ کہا ہے؟ اور اس حدیث کو کس نے صحیح قرار

① تہذیب: 11,12/5 ② تقریب: 157 ③ نصب الرایہ: 363/1 ④ الجوہر النقی 258/1

دیا ہے؟ مگر ان کے فیض یافتگان تو ہیں اور ان کے اس موقف کے علمبردار بھی ہیں، کم سے کم وہی اس کی وضاحت فرما دیں۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے ''نسخہ'' کے مطابق یہ پہلی روایت ہے۔ خشتِ اوّل ہی جس کی ضعیف اور کمزور ہو اس کی باقی عمارت کا اندازہ مشکل نہیں رہتا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

ابو سفیان طریف سے اور روایات بھی ہیں۔[1] یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ امام صاحب نے ابو سفیان طریف سے روایت ہی نہیں لی بلکہ اس کی روایت کے مطابق فتویٰ بھی دیا جیسا کہ امام محمد نے وضاحت کی ہے۔

طریف بن شہاب کے حوالے سے مزید دلچسپ تفصیل شائقین راقم الحروف کی کتاب ''اعلاء السنن فی المیزان''[2] میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری روایت

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک روایت «عبد الرحمن بن زاذان عن أبی سعید الخدری» کی سند سے بیان کی ہے۔ جسے امام محمد نے کتاب الآثار[3] میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الإیثار بمعرفة رواة الآثار میں فرمایا ہے «لم أقف له علی ترجمة» میں نے اس کا کہیں ترجمہ نہیں پایا۔[4]

اس سند کے بارے میں اختلاف ہے قاضی ابو یوسف نے اسے امام صاحب سے ''داود بن عبد الرحمن عن شرحبیل عن ابی سعید'' کی سند سے بیان کیا ہے۔[5] بعض نے تو داود بن عبد الرحمن کی بجائے عبد الرحمن بن داود روایت کیا ہے۔ جس کی تفصیل جامع المسانید[6] میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے التعجیل[7] میں داود بن عبد الرحمن کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے

---

[1] الآثار، رقم: 81,99 [2] اعلاء السنن فی المیزان: 116-109 [3] کتاب الآثار، رقم: 17
[4] الإیثار: 17، رقم: 146 [5] الآثار، رقم: 45 [6] جامع المسانید: 250,254/1 [7] التعجیل 505/1

«روی عن شرحبیل عن أبی سعید وعنه أبوحنیفه لیس بالمشهور» لہٰذا راوی داود بن عبدالرحمٰن ہو یا عبدالرحمٰن بن زاذان ہو دونوں مجہول ہیں۔ امام ابونعیم نے مسند الامام ابی حنیفہ [1] میں یہی روایت ذکر کی تو عبدالرحمٰن بن رواد مدنی (یا عبدالرحمٰن بن رزاذ یا رداد) کہا مگر عبدالرحمٰن بن رواد یا رزاذ یا رداد کا ترجمہ بھی نہیں ملتا۔ البتہ امام ابونعیم نے داود بن عبدالرحمٰن کو العطار کہا ہے۔ (واللہ اعلم) ابن خسرو نے عبدالرحمٰن بن ابی الزناد یا عبدالرحمٰن بن الرداد کہا ہے۔ [2] اور داود بن عبدالرحمٰن بھی۔ [3] بلکہ انھوں نے اسے ابوحنیفہ عن شرحبیل بن سعد عن ابی سعید بھی روایت کیا ہے۔ [4] مولانا ابوالوفا افغانی مرحوم نے تکلفاً فرمایا ہے کہ کوئی بعید نہیں یہ داود بن یزید بن عبدالرحمٰن الاودی ہو۔ [5] چلیے داود بن یزید الاودی سہی مگر وہ بھی ضعیف ہے۔ [6] اس کا استاد شرحبیل ابن سعد صدوق ہے مگر مختلط ہے اور معلوم نہیں ان کے "تلمیذ رشید" نے اختلاط سے پہلے سماع کیا ہے یا بعد میں۔ اس لیے یہ روایت بھی ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ امام صاحب کے استاد کی تعیین بجائے خود ایسا معمہ ہے جو نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا مصداق ہے، پھر اس کی توثیق بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔

تیسری حدیث

امام محمد نے کتاب الآثار [7] میں اپنے استاد «أیوب بن عتبة قاضی الیمامة عن یحییٰ بن أبی کثیر عن أبی سلمة بن عبد الرحمٰن» کی سند سے روایت کی ہے۔ جب کہ ایوب کے بارے میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ ضعیف ہے [8] بلکہ امام احمد رحمہ اللہ نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایات کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کی یحییٰ اور غیر یحییٰ سے روایات میں اضطراب ہے۔ حتیٰ کہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے منکر

[1] مسند الإمام أبی حنیفه، رقم: 275 [2] المسند لابن خسرو: 681/2 [3] ایضاً: 425/1
[4] مسند ابن خسرو: 480,481/1 [5] حاشیه الآثار لأبی یوسف: 9 [6] تقریب: 97
[7] کتاب الآثار، رقم: 50 [8] تقریب: 41

الحدیث اور ابن جنید رحمۃ اللہ علیہ نے "شبہ المتروک" کہا ہے، علاوہ ازیں اکثر ائمہ نے بھی اس پر کلام کیا ہے۔ تہذیب [1] میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

تنبیہ (۱)

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جامع المسانید [2] میں یہی روایت ابن مظفر اور ابن خسرو کی مسانید سے بواسطہ امام محمد "عن ابی حنیفہ عن ایوب بن عتبہ" منقول ہے۔ [3] اس کے بعد علامہ الخوارزمی نے الآثار لمحمد سے جو سند نقل کی ہے اس میں امام ابوحنیفہ، عن رجل عن أبی سلمۃ بن عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں مگر یہ سند کتاب الآثار کے نسخہ میں تتبع کے باوجود نہیں ملی۔ دونوں اسانید میں فرق ظاہر ہے۔

تنبیہ (۲)

کتاب الآثار میں ایوب بن عتبہ اسے یحییٰ بن ابی کثیر عن ابی سلمۃ سے روایت کرتے ہیں کہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ ایوب جیسا کیسا ہے اس کی مختصراً پوزیشن آپ اوپر پڑھ چکے اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھئے کہ ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن کا ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی صحیح نہیں۔ [4] مزید یہ کہ یحییٰ سے یہی روایت ہشام الدستوائی، ابان اور معمر بیان کرتے ہیں اور وہ "ام حبیبہ بنت جحش" کا نام لیتے ہیں۔ [5] بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت صحیح مسلم، ابوداود اور نسائی وغیرہ میں معروف ہے اس میں بھی سائلہ کا نام ام حبیبہ بنت جحش ہے۔ اس لیے یہاں اس کی بجائے ام حبیبہ بنت ابی سفیان کا نام بھی منکر ہے اور ثقات کے مقابلے میں ثبوت کا محتاج ہے۔

---

(1) تہذیب: 408,409/1 (2) جامع المسانید: 267/1 (3) مسند ابن خسرو: 179/1
(4) تہذیب: 117/12 (5) بیہقی: 351/1، العلل للدارقطنی: 384/15

چوتھی حدیث

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اپنے شیخ ''ابان عن ابی نضرۃ'' سے روایت کرتے ہیں۔ [1] یہ ابان، ابن ابی عیاش ہے جیسا کہ الایثار [2] میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے اور تقریب [3] میں کہا ہے کہ وہ متروک ہے کیونکہ امام احمد، الفلاس، ابن معین، نسائی، دارقطنی اور ابن سعد رحمہم اللہ نے اسے متروک کہا ہے۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے «ترك الناس حديثه منذ دهر» لوگوں نے ایک زمانہ سے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے دیکھا کہ امام یحییٰ بن معین ''عبدالرزاق عن معمر عن ابان'' کی سند سے نسخہ لکھ رہے ہیں تو انھوں نے امام یحییٰ رحمہ اللہ سے فرمایا: آپ یہ لکھ رہے ہیں حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ ابان کذاب ہے۔ امام یحییٰ رحمہ اللہ نے فرمایا: اے ابوعبداللہ! میں یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر کوئی کذاب اسے معمر عن ثابت عن انس سے روایت کرے تو میں کہوں گا تم جھوٹے ہو یہ ابان سے ہے، معمر سے نہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شعبہ، ابوعوانہ، یحییٰ اور عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہم اللہ نے اسے ترک کر دیا، وہ منکر الحدیث ہے۔ [4] حیرانی ہوتی ہے مولانا ابوالوفا افغانی پر، جنھوں نے اپنے علم و فضل کے باوصف ابان جیسے متروک راوی کے بارے میں ائمۂ جرح و تعدیل کا تو ایک جملہ بھی نہیں لکھا لیکن اس کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے فرمایا:

> رجل صالح ضعفوه من قبل حفظه له في سنن أبي داود حديث واحد مقرون بغيره [5]

''ابان نیک آدمی تھا، حافظہ کی وجہ سے انھوں نے اسے ضعیف کہا ہے۔ سنن ابی داود میں اس کی مقرون روایت ہے۔''

---

[1] کتاب الآثار، رقم: 71 [2] الایثار، رقم: 1 [3] تقریب: 18 [4] تہذیب: 97,101/1 [5] شرح کتاب الآثار: 118

غور فرمائیے! کیا صالح ہونے سے اس کی توثیق ہو جاتی ہے؟ اسے ضعیف ہی کہا گیا ہے یا متروک بھی؟ اس کے متروک ہونے کی وجہ سے ہی تو امام ابوداود رحمہ اللہ نے تنہا اس سے روایت نہیں لی بلکہ مقروناً لی ہے۔

قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت کتاب الآثار[1] میں بیان کی ہے گویا ابان بن ابی عیاش، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور قاضی ابویوسف، دونوں کے استاد ہیں۔ مولانا ابوالوفا افغانی نے اس کے حاشیہ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اسے متروک کہا ہے۔ غور فرمائیے الآثار لمحمد کی شرح لکھنے سے پہلے حاشیہ الآثار لأبی یوسف میں مولانا ابوالوفا اس کے متروک ہونے کے معترف تھے مگر بعد میں شرح الآثار لکھتے ہوئے اس کے دفاع کی ناکام اور بھونڈی سی کوشش کی جس سے اس ''خدمت'' کا پس منظر سمجھا جاسکتا ہے۔

عرض ہے کہ تنہا امام احمد رحمہ اللہ ہی نہیں ایک درجن کے قریب محدثین نے متروک کہا ہے۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ نے تو اسے کذاب بھی قرار دیا ہے۔ امام ابونعیم رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت مسند ابی حنیفہ[2] میں بیان کی ہے اور فرمایا ہے: «جرحه شعبة وترکه وحدث عنه الثوری وقال متروك الحديث» بلکہ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ قاضی ابویوسف رحمہ اللہ اسے ''ابوحنیفہ عن ابان'' سے روایت کرتے ہیں اور حسن بن زیاد لؤلؤی اسے ''ابان عن انس'' سے بھی روایت کرتے ہیں۔

امام محمد رحمہ اللہ تو کتاب الآثار میں اسی حوالے سے پہلے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر پھر ابان کی یہ حدیث نقل کر کے فرماتے ہیں: «وبهذا كله نأخذ» ہم ان تمام پر عمل کرتے ہیں گویا امام محمد اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ابان جیسے متروک اور کذاب کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

ابان بن ابی عیاش کے بارے میں ہم یہاں انھی معروضات پر اکتفا کرتے ہیں۔ شائقین مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی تصنیف اعلاء السنن فی المیزان[3] ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] كتاب الآثار، رقم: 368 [2] مسند أبي حنيفه، رقم: 59 [3] إعلاء السنن في الميزان 98-106

پانچویں حدیث

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ محمد بن زبیر سے روایت کرتے ہیں جسے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار[1] میں نقل کیا ہے۔ یہ محمد بن زبیر بصری تمیمی ہیں جیسا کہ الایثار[2] میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور تقریب[3] میں فرمایا ہے کہ وہ متروک ہے۔ تہذیب[4] میں ہے کہ امام یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: «ضعیف لاشیء» امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے «منکر الحدیث، فیه نظر» امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے «ضعیف، لیس بثقة» امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے «لیس بالقوی فی حدیثه نکارة» کہا ہے۔ امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس نے ایک شخص پر افترا باندھا تھا۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: «قلیل الحدیث» ہے اور غرائب وافراد بیان کرتا ہے۔ کسی ایک محدث سے اس کے بارے میں توثیق وتوصیف کا ایک کلمہ بھی منقول نہیں۔ امام محمد اس کی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں: «وبه نأخذ» اس پر ہمارا عمل ہے۔ گویا متروک اور منکر الحدیث راوی کی روایت سے استدلال میں یہ بزرگ کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ مزید یہ کہ محمد بن الزبیر اسے ''حسن بصری عن عمران'' سے روایت کرتے ہیں اور حسن کا عمران بن حصین سے سماع بھی نہیں۔[5] اس لیے راوی متروک ہی نہیں سند منقطع بھی ہے۔

چھٹی حدیث

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ عبدالکریم بن ابی المخارق سے روایت کرتے ہیں اور امام محمد نے کتاب الآثار[6] میں اس کی روایات ذکر کی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب[7] میں تو اسے ضعیف کہا ہے، مگر لسان المیزان[8] میں حبیب بن مخنف کے ترجمہ میں ''متروک'' کہا ہے۔ ابن معین، ابن عیینہ وغیرہ نے ضعیف اور نسائی، دارقطنی اور سعدی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے

---

(1) کتاب الآثار، رقم: 719 (2) الإیثار: 23 (3) تقریب: 297 (4) تہذیب: 167/9 (5) تہذیب:

(6) کتاب الآثار، رقم: 204,374,595,626,766 (7) تقریب: 217 (8) لسان المیزان: 173/2

متروک کہا ہے۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لا یختلفون فی ضعفه» اس کے ضعیف ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اس کی شکل وصورت اور کثرتِ بُکا کی وجہ سے دھوکہ میں آ گئے اور جب حقیقتِ حال سے واقف ہوئے تو اس سے روایت لینے سے معذرت کی اور غلطی کا اعتراف کیا۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے «کثیر الوهم فاحش الخطا» کہا ہے۔ [1] ایسے متفق علیہ ضعیف راوی سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ روایت ہی نہیں لیتے بلکہ اس کی روایت سے استدلال بھی کرتے ہیں اور امام محمد فرماتے ہیں: «وبه نأخذ» [2] بلکہ یہ عبدالکریم اپنے ضعیف ہونے کے علاوہ مرسل روایت بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی اس سے استدلال کیا گیا ہے۔ کیا ضعیف مرسل بھی قابلِ استدلال ہے؟

بلکہ ایک روایت [3] میں تو وہ «عن رجل عن عمر» سے روایت کرتا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس پر امام صاحب کا عمل ہے۔ کتاب الآثار لابی یوسف [4] میں عبد الکریم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی روایت ہے۔ ایک اور مقام [5] پر عن رجل عن ابن عمر سے بھی روایت ہے۔

ساتویں حدیث

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک شیخ ابوالعطوف جراح بن منہال ہیں اور کتاب الآثار میں اس کی روایات منقول ہیں۔ [6] حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے الایثار [7] میں کہا ہے۔ «متفق علی ضعفه» وہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ امام یحییٰ رحمہ اللہ اور ابن الجارود رحمہ اللہ نے اسے «لیس بشیء» ابن مدینی رحمہ اللہ نے «لا یکتب حدیثه» ابن سعد رحمہ اللہ نے ضعیف، امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے ''منکر الحدیث''، نسائی، دولابی، ابوحاتم اور دارقطنی رحمہم اللہ نے متروک اور ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے: «یکذب فی الحدیث ویشرب الخمر»

---

① تہذیب: 377,378/6، میزان: 646/2 ② رقم: 626,766 ③ رقم: 595 ④ کتاب الآثار لأبی یوسف، رقم: 215 ⑤ رقم: 32 ⑥ کتاب الآثار، رقم: 461,541,589 ⑦ الإیثار: 4

وہ حدیث میں جھوٹ بولتا اور شراب پیتا تھا۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ الجراح، کوئی نہیں بلکہ ''الجزیرہ'' میں رہنے کی بنا پر الجزری تھے اور اس کے بارے میں ہے کہ «یشرب الخمر» وہ شراب پیتا تھا۔ البرقی نے «متهم بالكذب» کہا ہے۔ (1)

ایسے جھوٹ بولنے والے شرابی، منکر الحدیث، متروک اور بالاتفاق ضعیف راوی سے بھی امام صاحب روایت ہی نہیں لیتے بلکہ اس کی روایت سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ (2) مگر اس کے باوجود کتاب الآثار کی تمام روایات صحیح اور کتاب الآثار صحیح احادیث پر مشتمل پہلی کتاب ہے۔ (سبحان اللہ!)

آٹھویں حدیث

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں ایک نام سعید بن المرزبان ابو سعد ہے اور کتاب الآثار (3) میں اس سے روایات منقول ہیں۔ یہ ابو سعد سعید بھی ضعیف اور مدلس ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب (4) میں کہا ہے۔ امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ «ليس بشيء لا يكتب حديثه» ہے، عمرو بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف الحدیث اور متروک، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے منکر الحدیث، ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے لا يحتج به، نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف ليس بثقة، دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے متروک، عجلی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف، الساجی رحمۃ اللہ علیہ نے صدوق فيه ضعف، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے كثير الوهم فاحش الخطأ، ابو ہشام رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ثقہ، ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے لین مدلس کہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ صدوق ہے، انھوں نے فرمایا: ہاں صدوق ہے وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ (5) سعید ضعیف ہونے کے علاوہ مدلس بھی ہے اور کتاب الآثار میں یہ روایات معنعن ہیں۔ انصاف شرط ہے کہ اس کے باوصف

---

(1) میزان: 1/390، لسان: 2/99 وغیرہ (2) کتاب الآثار، رقم: 461،541،589 (3) کتاب الآثار، رقم: 242،850،891 (4) تقریب: 125 (5) تہذیب: 4/79،80، میزان: 2/157،158 وغیرہ

اس کی کتاب الآثار میں احادیث صحیح ہیں؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبقات المدلسین کے پانچویں طبقہ میں اسے ذکر کیا ہے جس کے بارے میں انہوں نے فرمایا ہے: کہ وہ تصریح سماع کریں تب بھی ان کی حدیث مردود ہے۔

نویں حدیث

امام صاحب کے شیوخ میں مسلم بن کیسان الاعور بھی ہیں اور کتاب الآثار لمحمد [1] اور کتاب الآثار لأبی یوسف [2] میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے تقریب [3] میں اسے "ضعیف" قرار دیا ہے۔ جبکہ امام دارقطنی، فلاس، نسائی اور ابن الجنید رحمہ اللہ نے متروک، ساجی رحمہ اللہ نے منکر الحدیث اور عمرو بن علی فلاس رحمہ اللہ نے ایک دوسرے قول میں «منکر الحدیث جدا» کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام وکیع رحمہ اللہ اس کے ضعف کی وجہ سے اس کا نام نہیں لیتے تھے۔ امام یحیٰی رحمہ اللہ اور امام ابوداود رحمہ اللہ نے لیس بشئی، امام بخاری رحمہ اللہ نے ضعیف ذاهب الحديث، امام علی بن المدینی، العجلی ترمذی، ابوزرعہ اور ابوحاتم رحمہم اللہ نے ضعیف کہا۔ کسی ایک محدث سے بھی کوئی کلمۂ خیر اس کے بارے میں منقول نہیں۔ [4] ضعیف ہونے کے علاوہ وہ مختلط بھی ہے۔ مزید یہ کہ کتاب الآثار امام محمد میں وہ "عن رجل" سے روایت کرتا ہے اور اسی روایت کے بارے میں امام محمد فرماتے ہیں: «وبه نأخذ» ہمارا اس کے مطابق عمل ہے۔ بجا فرمایا، مگر یہ اس سند سے بہ نوع ضعیف اور نا قابلِ اعتبار ہے کیونکہ امام صاحب کا استاد مسلم الاعور ضعیف، اس کا استاد "رجل" مبہم یعنی مجہول۔ چالیس ہزار احادیث سے اسی نوعیت کے راویوں سے مروی روایات کا انتخاب، عجیب انتخاب ہے۔

دسویں حدیث

امام محمد کتاب الآثار [5] میں ایک اثر ابراہیم بن یزید المکی سے لائے ہیں جس کے بارے

---

(1) کتاب الآثار، رقم: 792 (2) کتاب الآثار لأبی یوسف: 174، رقم: 792 (3) تقریب: 336

(4) تهذيب: 135,136/10 (5) کتاب الآثار، رقم: 134

میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''متروک''۔ ①

امام احمد، نسائی اور علی بن الجنید رحمہم اللہ بھی اسے متروک کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سکتوا عنہ، امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لیس بثقة ولیس بشيء»

دارقطنی رحمہ اللہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ منکر الحدیث اور البرقی متھم بالکذب کہتے ہیں۔ دولابی بھی فرماتے ہیں: «ترکوہ» ② علامہ ابوالوفا افغانی نے کتاب الآثار ③ میں «روی لہ الترمذی والنسائی» کہ امام ترمذی رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ نے اس سے روایت لی ہے، کہہ کے خود کو اور اپنے قارئین کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ حالانکہ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے متروک اور «لیس بثقة ولا یکتب حدیثه» کہا ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ بعض اہلِ علم نے اس پر حافظہ کی بنا پر کلام کیا ہے۔ ④

یہی بات انھوں نے ترمذی ⑤ میں اس سے قبل بھی فرمائی ہے، مگر اس کے ساتھ اس کی روایت کو حسن بھی قرار دیا ہے مگر امام ترمذی رحمہ اللہ متابعت اور شواہد کی بنا پر حسن کہہ دیتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے ابراہیم بن یزید مکی سے کوئی روایت نہیں لی۔ تقریب، تہذیب اور الخلاصہ میں اس بارے میں جو ''ت س'' کی علامت ہے۔ اس میں ''س'' کی علامت سے نسائی مراد ہے اور نسائی کی طرف اس کی روایت کا انتساب طباعتی غلطی ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان ⑥ میں اور علامہ المزی رحمہ اللہ نے تہذیب ⑦ میں ت ق علامت دی ہے، ''س'' نہیں اور اس کی روایت جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے «مایوجب الحج؟ قال: الزاد والراحلة» ذکر کی ہے وہ بھی ابن ماجہ رحمہ اللہ میں ہے، نسائی رحمہ اللہ میں نہیں۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ ⑧ میں اس

---

① تقریب: 24 ② تہذیب: 180/1 ③ کتاب الآثار، حاشیہ: 359/1 ④ ترمذی مع تحفہ: 82/4 ⑤ ترمذی مع التحفة: 79/2 ⑥ میزان: 75/1 ⑦ تہذیب: 452/1 ⑧ نصب الرایہ: 8/3.

روایت پر تفصیلاً نقد کیا ہے۔ ابراہیم بن یزید کے حوالے سے مزید دلچسپ تفصیل راقم الحروف کی تصنیف اعلاء السنن فی المیزان [1] میں ملاحظہ فرمائیں۔

گیارہویں حدیث

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شیوخ میں ایک شیخ اسحاق بن ثابت ہیں اور اسحاق اپنے والد ثابت سے روایت کرتے ہیں، سلسلہ سند یوں ہے «إسحاق بن ثابت عن أبيه عن علي بن الحسين عن النبي صلى الله عليه وسلم» [2] جب کہ امام صاحب کے یہ شیخ اور ان کا والد دونوں مجہول ہیں۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے تعجیل المنفعه [3] میں دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اسحاق کے بارے میں فرمایا: «لا يدري من هو» اور ثابت کے ترجمہ میں کہا «لا يعرفان» کہ باپ بیٹا دونوں پہچانے نہیں جاتے کہ کون ہیں۔ اور الإيثار بمعرفة رواة الآثار [4] میں علامہ الحسینی سے نقل کیا ہے «مجهول كأبيه» کہ اسحاق اپنے باپ ثابت کی طرح مجہول ہے۔

دونوں راوی مجہول، روایت مرسل پھر بھی امام محمد فرماتے ہیں: «هو قول أبي حنيفة» کہ اسی کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے۔

بارہویں حدیث

اسی نوعیت کی یہ روایت بھی دیکھیے کہ امام صاحب نے اپنے شیخ کدام بن عبدالرحمن عن أبي كباش أنه سمع أباهريرة کی سند سے موقوفاً روایت بیان فرمائی ہے، جسے امام محمد نے کتاب الآثار [5] میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ کدام بن عبدالرحمٰن مجہول ہے۔ [6] اور اس کا استاد ابوکباش بھی مجہول ہے۔ [7] امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہی روایت عثمان بن واقد عن

---

(1) إعلاء السنن في الميزان: 129,130 (2) كتاب الآثار، رقم: 842 (3) تعجيل المنفعة: 290,372/1 (4) الآثار: 2 (5) كتاب الآثار، رقم: 791 (6) تقريب: 285 (7) تقريب: 423

کدام سے مرفوعاً جامع الترمذی ① میں نقل کی ہے اور اسے ''غریب'' کہا ہے اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری ② میں فرمایا ہے: في سنده ضعف۔

تیرہویں حدیث

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الآثار ③ میں ایک روایت محمد بن عبیداللہ العزرمی سے بیان کی ہے۔ یہ دراصل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاد محترم ہیں اور کتاب الآثار میں امام صاحب کا واسطہ ساقط ہے۔ جس کی وضاحت حاشیہ میں مولانا ابوالوفا افغانی نے کر دی ہے اور امام ابونعیم نے بھی مسند ابی حنیفہ ④ میں اسے امام صاحب کا استاد لکھا ہے۔ جس کے بارے میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ متروک ہے۔ ⑤ امام حاکم رحمہ اللہ نے المدخل میں فرمایا: «متروك الحديث بلا خلاف» بلا اختلاف وہ متروک الحدیث ہے۔ امام ساجی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے: «أجمع أهل النقل على ترك حديثه» کہ اہلِ نقل کا اس کی حدیث کے ترک پر اجماع ہے۔ ⑥

اس کے بعد مزید اقوال لکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مولانا افغانی نے بھی حاشیہ میں فرمایا ہے: «تركه ابن المبارك» ''عبداللہ بن مبارک نے اسے چھوڑ دیا تھا'' یہ متروک امام صاحب کے کتاب الآثار میں استاد ہیں اور کتاب الآثار پہلی صحیح کتاب ہے۔

یہاں یہ عذر لنگ درست نہیں کہ یہ تو کتاب الآثار لابی یوسف میں ہے۔ کیونکہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ دراصل امام صاحب کی کتاب کا نسخہ ہے۔ ہمارا تو یہ موضوع ہی نہیں کہ امام صاحب کے کون سے شیوخ متروک ضعیف بلکہ کذاب ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ ان کے اساتذہ میں محمد بن سائب الکلبی بھی ہیں۔ دیکھیے جامع المسانید للخوارزمی ⑦ جو رافضی ہیں اور متہم بالکذب بھی۔ عمرو بن عبید بن باب بھی ان کا استاد تھا۔ ⑧ جو کذاب،

---

① جامع الترمذي: 2/355,356 ② فتح الباري: 10/16 ③ كتاب الآثار: 12,13 رقم: 56
④ مسند أبي حنيفة: 200 ⑤ تقريب: 309 ⑥ تهذيب: 9/322,323 ⑦ المسانيد للخوارزمي: 1/171 ⑧ جامع المسانيد: 2/504

متروک اور قدری تھا اور اس کا داعی بھی تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دیتا تھا۔ جس کی مزید تفصیل اعلاء السنن فی المیزان [1] میں ملاحظہ فرمائیں۔ اسی طرح جابر بن یزید جعفی بھی ان کے استاد ہیں، جیسا کہ جامع المسانید [2] میں ہے اور خود انھوں نے فرمایا ہے: «ما لقيت أكذب من جابر الجعفي» کہ میں جابر جعفی سے زیادہ کسی جھوٹے سے نہیں ملا۔

چودھویں حدیث

امام محمد رحمہ اللہ نے ایک روایت امام صاحب سے بایں سند نقل کی ہے:

يحيىٰ بن عبد الله عن أبي ماجد الحنفي عن ابن مسعود. [3]

اس سند میں ابو ماجد جسے ابو ماجدہ بھی کہا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو اسے مجہول کہا ہے۔ [4] مگر تہذیب [5] میں اس کے بارے میں نقل کیا ہے کہ امام ابن عیینہ نے فرمایا کہ میں نے یحییٰ بن عبداللہ بن حارث الجابر سے ..... جو اس کا شاگرد ہے.... امتحاناً پوچھا یہ ابو ماجد کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ «شيخ طرأ علينا من البصرة» اور کبھی کہا «طير طرأ علينا» کہ وہ بصرہ سے ہم پر وارد ہوئے تھے۔ ابن عیینہ نے فرمایا: وہ منکر الحدیث ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ مجہول ہے اور میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا وہ ابو ماجد کی اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی مجہول اور امام علی بن مدینی نے اس کی حدیث کو منکر کہا ہے۔ اس اڑتے پرندے سے روایت کرنے والے یحییٰ بھی متکلم فیہ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو اسے لین الحدیث کہا ہے۔ [6]

امام احمد رحمہ اللہ اور ابن عدی رحمہ اللہ نے اگر ليس به بأس کہا ہے تو امام یحییٰ رحمہ اللہ نے ضعیف اور ليس بشيء، ابو حاتم رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے۔ دار قطنی رحمہ اللہ نے فرمایا: "يعتبر به ولا يتابع على أحاديثه" اور عجلی رحمہ اللہ نے "يكتب حديثه

---

(1) إعلاء السنن في الميزان: 123-117 (2) جامع المسانيد: 1/304 (3) كتاب الآثار، رقم: 19، وأبي يوسف، رقم: 49 (4) تقريب: 472 (5) تهذيب: 12/217 (6) تقريب: 377

"ولیس بالقوی" کہا ہے۔[1]

ایسے راوی کی حدیث کو متابعت میں تو قبول کیا جا سکتا ہے استدلال واحتجاج میں نہیں لیکن امام صاحب رحمہ اللہ ایسے راویوں سے استدلال کرتے ہیں جیسا کہ امام محمد رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے، مگر اس کے باوجود کتاب الآثار صحیح کتاب ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ یہ ماشاء اللہ "چودہ چاند" ہیں مگر روایات دو درجن کے قریب ہیں۔ ان کے علاوہ ضعیف، متکلم فیہ، مجہول ومستور اور مبہم راویوں کی بھی متعدد روایات ہیں جیسا کہ قبل ازیں ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ عذر محض عذر بارد ہے کہ یہ روایات دوسرے طرق سے بھی مروی ہوں گی۔ کیونکہ یہ اگر "ثقہ راویوں" سے تھیں تو کتاب الآثار، جو پہلی "صحیح کتاب" تھی، اس میں ان متروک، کذاب، مجہول، ضعیف اور مبہم راویوں کا سہارا ہی کیوں لیا گیا؟ اور کیا جس کتاب میں صحیح احادیث کا التزام ہو اس کی یہی پوزیشن ہوتی ہے؟ جب یہ ثابت ہو چکا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ متروک، کذاب، ضعیف اور مجہول راویوں سے روایت لیتے اور اس کے مطابق فتویٰ وعمل اختیار کرتے ہیں تو اس کے بعد مبہم راویوں سے روایت کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے مگر اس کے باوجود کتنی دلیری سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کتاب الآثار صحیح احادیث پر مشتمل پہلا مجموعہ ہے۔

غلطی سے پاک کتاب

یہاں یہ عجیب دعویٰ بھی دیکھئے کہ موفق المکی نے المناقب میں قاضی عتیق بن داود الیمانی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے شخص تھے جنھوں نے علوم شریعت کی تدوین کی «فيبعد أن يكون الله تعالىٰ قد ضمنها ثم يكون اول من دونها على خطأ» تو بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ذمہ لے اور اس کا پہلا مدون غلطی کرے[2] لیجیے جناب! اب "کتاب الآثار" اور اس کے مدون غلطی وخطا سے پاک قرار پائے۔ (سبحان اللہ) ہمارے ان ارشادات سے یہ دعویٰ محض "خواب" محسوس ہوتا ہے اور "مناقب" میں ایسے

---

[1] تقریب: 238/11 [2] المناقب للموفق: 137/2

''خواب'' دیکھنے کی شاید ممانعت بھی نہیں۔ یوں کتاب الآثار بھی گویا ''کالقرآن'' ہے اس لیے اسے اگر پہلی صحیح کتاب قرار دیا گیا ہے تو اس میں کسی کے لیے تعجب کی کیا بات ہے۔

اس سے بڑی تعجب خیز بات یہ کہ کہا گیا کہ ''امام صاحب نے چالیس ہزار احادیث میں سے کتاب الآثار کو مدون کیا ہے۔[1]'' اور یہ بات مولانا نعمانی وغیرہ علمائے احناف نے بھی فرمائی ہے۔ قارئینِ کرام سے التماس ہے کہ چالیس ہزار احادیث سے انتخاب کا جو عالم ہے اس کا مختصراً جائزہ آپ کے سامنے ہے۔ اسی تناظر میں آپ فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ چالیس ہزار میں سے کتاب الآثار میں ۹۱۶ کے انتخاب کا جب یہ حشر ہے تو باقی روایات کی پوزیشن کیا ہوگی؟

بعض دیگر روایات

اب یہاں مزید چند روایات کی حقیقت حال ملاحظہ فرمائیں چنانچہ کتاب الآثار[2] میں امام محمد رحمہ اللہ خفین پر مسح کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر لائے ہیں کہ مقیم کے لیے مدتِ مسح ایک دن ایک رات ہے اور مسافر کے لیے تین دن تین راتیں ہیں۔ یہ اثر انھوں نے بواسطہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ «عن حماد عن ابراهيم عن حنظلة بن نباتة الجعفي» بیان کیا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے اسے کتاب الحجة على أهل المدينة[3] میں بھی ذکر کیا ہے۔ اسی سند سے یہ اثر مختصراً قاضی ابو یوسف نے بھی کتاب الآثار[4] میں ذکر کیا ہے جس میں صرف خفین پر مسح کا ذکر ہے مدتِ مسح کی تفصیل نہیں ہے۔

سند میں ''حنظلہ بن نباتہ الجعفی'' کون ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے الایثار میں فرمایا ہے «لا يعرف حاله» اس کا حال معلوم نہیں۔[5] مگر تعجیل المنفعہ میں انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ راوی تعجیل المنفعہ کی شرط پر ہے۔ جس کی وضاحت ہم نے «إتمام المنفعة بتعجيل المنفعة» میں بیان کر دی ہے۔

ہم یہاں دو باتیں قارئینِ کرام کی خدمت میں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] مناقب الموفق: 95 [2] کتاب الآثار، رقم: 9 [3] كتاب الحجة على أهل المدينة: 25/1

[4] کتاب الآثار: 15، رقم: 69 [5] الإيثار مع الآثار: 8

(۱) امام سفیان، امام شعبہ اور ہشام دستوائی رحمہم اللہ تینوں حضرات اسے "حماد عن ابراہیم عن الاسود عن نباتۃ عن عمر" کی سند سے ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ مصنف عبدالرزاق[1]، طحاوی[2] اور بیہقی[3] میں ہے۔ اور حماد سے ان تینوں کی روایت حماد کے اختلاط سے قبل ہے۔ جیسا کہ پہلے باحوالہ گزر چکا ہے اس لیے امام صاحب کی حماد سے یہاں روایت میں سند اور راوی کے نام میں اختلاف حماد کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اسے نسخہ میں تصحیف وتخلیط پر محمول کرنا اس لیے درست نہیں کہ یوں یہ تصحیف الآثار اور کتاب الحجہ میں بھی تسلیم کی جائے گی اور وہ بلا دلیل ہوگی۔

۲) کتاب الآثار کی یہ روایت امام صاحب کی مسانید جمع کرنے والوں میں سے کسی نے بھی ذکر نہیں کی حتی کہ علامہ الخوارزمی رحمہ اللہ نے بھی جامع المسانید میں اسے ذکر نہیں کیا۔ اور اس حقیقت کا اعتراف مولانا ابوالوفا افغانی مرحوم نے کتاب الآثار کی شرح میں کیا ہے۔[4] جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جامع المسانید میں بھی امام صاحب کی تمام مرویات نہیں ہیں۔

دوسری روایت

امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب الآثار[5]، قاضی ابویوسف نے بھی الآثار[6] میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اثر جنازہ اٹھانے کے بارے میں نقل کیا ہے۔ جس کی سند حسب ذیل ہے:

أبو حنيفة عن منصور بن المعتمر عن سالم بن أبي الجعد عن عبيد بن نسطاس عن عبد الله بن مسعود.

اسی سند سے یہ روایت مسند الامام لابن خسرو[7] میں اور مسند الحارثی[8] میں مذکور ہے استاذ الحارثی نے ذکر کیا ہے کہ امام صاحب سے یہ روایت اسی طرح محمد بن حسن، ابویوسف، شعیب بن اسحاق، زفر بن الھذیل، اسد بن عمرو، حسن بن زیاد وغیرہ نے ...

---

① مصنف عبد الرزاق: 205/1 ② طحاوی: 83/1 ③ بیھقی: 276/1 ④ کتاب الآثار، ج: 16/1 ⑤ کتاب الآثار، رقم: 235 ⑥ الآثار: 81، رقم: 404 ⑦ مسند الامام لابن خسرو: 798,802/2، رقم: 1040,1048 ⑧ مسند الحارثی: 807/2، رقم: 1393

جماعت نے روایت کی ہے۔علامہ الخوارزمی رحمہ اللہ نے بھی جامع المسانید [1] میں ان اسانید کا ذکر کیا ہے۔امام صاحب سے یہی روایت اسی سند سے ان کے متعدد تلامذہ کے حوالے سے امام ابونعیم رحمہ اللہ نے بھی مسند الامام [2] میں بیان کی ہے اور اسی کے ساتھ یہ اشارہ بھی کیا ہے۔

روى عنه عبيد الله بن موسى مجوداً، كمارواه الثورى ومسعر وزاد فيه حديثه عن الحكم.

''کہ عبید اللہ بن موسیٰ نے اسے امام صاحب سے صحیح طور پر روایت کیا جیسے اسے امام سفیان ثوری اور مسعر نے بیان کیا ہے اور اس کی حدیث میں (ایک) حکم کا اضافہ (بھی) کیا ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے عبید اللہ بن موسیٰ کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بواسطہ «منصور عن عبيد بن نسطاس عن أبي عبيدة عن عبد الله بن مسعود» یہی اثر ذکر کیا ہے۔جس میں جنازہ کو اٹھانے کے علاوہ تشہد اور تکبیر عندالرکوع والسجود کی تعلیم دینے کا بھی ذکر ہے۔اس کے بعد وہ امام سفیان ثوری اور مسعر کی اسانید لائے ہیں جو «منصور عن عبيد عن أبى عبيدة عن عبد الله» کی سند سے ہیں۔سفیان اور مسعر کے علاوہ شعبہ، جریر بن عبد الحمید، حماد بن زید، ادریس الکوفی، الرحیل بن معاویہ بھی منصور سے یہی اثر بواسطہ ''ابوعبیدۃ'' ہی بیان کرتے ہیں۔جیسا کہ مسند الطیالسی [3]، المصنف لعبد الرزاق [4]، ابن ابی شیبۃ [5]، ابن ماجہ [6]، الجعدیات للبغوی [7] اور طبرانی [8] میں مروی ہے۔امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ شعبہ، ثوری، زائدۃ، فضیل بن عیاض، حماد بن زید، جریر بن عبد الحمید، ابوالاحوص، ابن عیینہ، مسعر اور ادریس اسے منصور بن المعتمر سے بواسطہ عبید بن نسطاس عن أبی عبیدۃ بیان کرتے ہیں۔اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وخالفهم أبو حنيفة فرواه عن منصور ووهم فى إسناده جعله

---

[1] جامع المسانید: 1/451-453 [2] مسند الامام: 220,221 [3] مسند الطیالسی: 330
[4] المصنف لعبد الرزاق: 6517 [5] ابن ابی شیبۃ: 3/168 [6] ابن ماجہ: 1478
[7] الجعدیات للبغوی: 901 [8] طبرانی: 9/371,372

عن سالم بن أبي الجعد عن عبيد بن نسطاس عن ابن مسعود وأسقط أبا عبيدة، والصحيح عن منصور عن عبيد بن نسطاس عن أبي عبيدة، والصحيح عن منصور عن عبيد بن نسطاس عن أبي عبيد ة، ورواه أبو عوانة عن منصور كذلك أيضاً.[1]

ان کی مخالفت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اسے انھوں نے منصور سے بیان کیا ہے اس کی سند میں ان سے وہم ہوا ہے جسے انھوں نے «سالم بن ابی الجعد عن عبید عن ابن مسعود» بنا دیا اور ''ابو عبیدۃ'' کا واسطہ گرا دیا ہے۔ جبکہ منصور سے صحیح بواسطہ عبید عن أبي عبیدۃ ہے، منصور سے ابو عوانہ نے بھی اسے اسی طرح (بواسطہ ابو عبیدۃ) بیان کیا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے الایثار[2] میں عبید بن نسطاس کے ترجمہ میں اشارہ کیا ہے کہ ''ابو عبیدۃ'' کا واسطہ ساقط ہے۔ عرض ہے کہ جہاں ابو عبیدۃ کا واسطہ ساقط ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ ''سالم بن ابی الجعد'' کا واسطہ بھی منصور اور عبید کے مابین زائد ہے اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہم ہے۔ یہی اشارہ امام ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔

تیسری حدیث

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار[3] میں ایک روایت یوں ذکر کی ہے۔

أخبرنا أبو حنيفة قال حدثنا أبو هيثم المكي عن يوسف بن ماهك عن حفصة زوج النبي صلى الله عليه وسلم، أن امرأة أتت النبي صلى الله عليه وسلم.

یہ روایت کتاب الآثار لأبي یوسف[4] میں بھی ہے لیکن وہاں ''ابو ہیثم'' کی بجائے ''ابن خثیم'' ہے اور یہی ''ابن خثیم'' صحیح ہے کاتب سے یہاں تصحیف ہوئی ہے کہ اس ابن خثیم

---

[1] العلل: 306/5 [2] الإيثار: 18 [3] كتاب الآثار: 97، رقم: 450 باب العزل [4] كتاب الآثار لأبي يوسف: 134، رقم: 614

کی بجائے ابوہیثم لکھ دیا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے الایثار [1] میں ابوخثیم کا ذکر کیا ہے اور ہے نسخہ میں اسی طرح ہے مگر صحیح ابن خثیم ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الآثار کے نسخہ میں یہ پرانی تصحیف ہے۔ یہی روایت ابن خسرو نے مسند الامام [2] میں اور علامہ الخوارزمی نے جامع اسانید [3] میں بھی ذکر کی ہے۔ امام ابونعیم نے بھی مسند الامام [4] میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی دیکھئے کہ (۱) وہیب بن خالد [5]، (۲) سفیان ثوری [6]، (۳) روح بن قاسم [7] اور (۴) معمر [8] یہ روایت ''ابن خثیم عن عبدالرحمٰن بن سابط عن حفصۃ بنت عبدالرحمٰن عن ام سلمۃ'' کی سند سے بیان کرتے ہیں اور علامہ محمد مرتضیٰ الزبیدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

الصحیح أن الحدیث حدیث أم سلمة، وأن حفصة هذه هی بنت عبد الرحمن حققه قاسم بن قطلوبغا. [9]

''صحیح یہ ہے کہ حدیث ام سلمۃ رضی اللہ عنہا کی ہے اور حفصہ یہ عبدالرحمٰن کی بیٹی ہے جیسا کہ قاسم ابن قطلوبغا رحمہ اللہ نے اس کی تحقیق کی ہے۔''

گویا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو ''حفصۃ زوج النبی ﷺ'' کہا اور عبدالرحمٰن بن سابط کی بجائے ''یوسف بن ماھک'' کہا یہ ان کا وہم ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ سفیان ثوری، وہیب، روح بن قاسم، معمر، عبدالرحیم بن سلیمان اور قاسم بن معن تو ''ابن خثیم عن عبدالرحمٰن بن سابط عن حفصۃ بنت عبدالرحمٰن عن ام سلمۃ'' سے روایت کرتے ہیں۔

وخالفهم أبو حنيفة فرواه عن ابن خثيم، فوهم في اسناده في موضعين فقال عن يوسف بن ماهك مكان ابن سابط، وقال:

---

[1] الإيثار: 31 [2] مسند الامام: 569,912/2 [3] جامع المسانيد: 86,110/2 [4] مسند الامام: 178 [5] احمد: 305/6، 26601، طحاوی: 42,43/3 [6] احمد: 318/6، 26698,26706، ترمذی: 2979، بیهقی: 195/7 [7] بیهقی: 195/7 [8] احمد: 310/6، 26643 [9] عقود الجواهر المنيفة: 161/2

عن حفصة زوج النبی صلی الله علیه وسلم،ولم یقل حفصة بنت عبد الرحمن بن أبی بکر وأسقط أم سلمة.[1]

''اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھیں ابن خثیم سے روایت کرتے ہوئے دو مقام پر وہم ہوا ہے ایک تو انھوں نے ابن سابط کی بجائے یوسف بن ماھک کہا اور دوسرا انھوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بجائے حفصہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہا ہے، اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو ساقط کر دیا۔''

یہاں یہ بھی دیکھیے کہ ابن خسرو نے مسند[2] ہی میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام زفر رحمہ اللہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بواسطہ ''ابن خثیم عن یوسف بن ماھک عن ام سلمۃ'' روایت کرتے ہیں۔ مگر اس میں گھپلا یہ ہے کہ یہاں ''حفصہ'' کا واسطہ ساقط ہے اور عبدالرحمٰن بن سابط کی بجائے یوسف بن ماھک کا ذکر بدستور موجود ہے۔ جس سے وہم کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کا مدار لاحق بن حسین مقدسی پر ہے جو کذاب، افاک اور وضاع ہے حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ اس جیسا اور کوئی کذاب نہیں۔[3] اس لیے اس کی ذکر کی ہوئی اس سند کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس نوعیت کی اور مثالیں بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ استیعاب مقصود نہیں۔ اس قسم کی معلول روایات کا چالیس ہزار احادیث سے انتخاب بھی عجیب انتخاب ہے اور باور کرایا جاتا ہے کہ ''مدون اول'' غلطی نہیں کر سکتا۔ (سبحان اللہ)

کیا کتاب الآثار اجماع کے مطابق ہے اور اسے تلقی بالقبول حاصل ہے؟

نعمانی صاحب کی یہ لن ترانی بھی دیکھیے، لکھتے ہیں:

وبعد أن قام عشرین سنة ینتقی الأحادیث والآثار ویعرض

---

[1] العلل: 256/15 [2] مسند: 570/2 [3] لسان المیزان: 237/6

ماروى منها بطريق الاحادعلى معاني كتاب الله وما أجمعت الأئمة عليه، فينتخب من أربعين ألف حديث كتاباً ثم يخرجه للناس لكي ينتفع به. ①

”امام صاحب بیس سال تک احادیث و آثار کو چھانتے رہے اوران میں جو خبرآحاد کے طریق سے مروی تھیں انھیں کتاب اللہ اور اجماعِ امت پر پیش کرتے رہے، یوں وہ چالیس ہزار احادیث سے کتاب منتخب کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ اس سے استفادہ کریں۔“

کیسا خوبصورت تصور ہے اگر یہ حقیقت ہے تو غور فرمایئے امام صاحب اپنے شیخ حماد ابن ابی سلیمان سے وابستہ ہوئے، پندرہ سال اور ایک قول کے مطابق ۱۲اور ۱۸ سال تک ان کی خدمت میں رہے، حماد ۱۲۰ھ میں فوت ہوئے تو امام صاحب ان کے جانشین بنے، اس کے بعد بیس سال تک احادیث سے منتخب مجموعہ کتاب الآثار مرتب کیا بلکہ احادیث کے انتخاب میں یہ بھی انھوں نے ملحوظ رکھا کہ اخبارِ آحاد کو قرآنِ پاک اور اجماعِ امت پر پیش کیا اور انھی احادیث کا انتخاب کیا جو قرآنِ پاک اور اجماع کے موافق تھیں۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کی بات ہے۔ مگر جب ہم ان چالیس ہزار میں سے ۹۱۶ کے انتخاب کو دیکھتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیسا انتخاب ہے جس میں کذاب، متروک، ضعیف، مجہول و مستور اور مبہم راویوں کی روایات کا انتخاب کیا گیا، بلکہ ان سے استدلال بھی کیا گیا۔ مولانا نعمانی مرحوم نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے اس میں ان صحیح احادیث کا اہتمام کیا ہے جنھیں ائمۂ فقہا کا تلقی بالقبول حاصل ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

① الامام ابن ماجه وكتابه السنن:57

فتوخى فيه الصحيح المتلقى بالقبول من أئمة الفتيا .[1]

مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا نعمانی کے پہلے دعاوی کی طرح یہ دعویٰ بھی کتاب الآثار کی مراجعت کے بعد پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں جس طرح جھوٹی احادیث واقوال اور قصص کی بھرمار ہے ہمارے نزدیک تو یہ بھی اسی قبیل کی ایک کوشش ہے۔ بلکہ ہمارے نزدیک نعمانی صاحب کی یہ کوشش دراصل صحیحین کے تقابل میں ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی الجامع الصحیح صحیح احادیث پر مشتمل پہلی کتاب ہے اور صحیحین کی روایات کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا کہ انھیں تلقی بالقبول حاصل ہے اور اکثر اہلِ علم نے فرمایا ہے کہ صحیحین کی احادیث بالاجماع صحیح ہیں۔ نعمانی صاحب اس کے برعکس اس کوشش میں ہیں کہ ثابت کرسکیں کہ کتاب الآثار پہلی صحیح کتاب، اس کی احادیث اجماع کے موافق اور ان کو فقہاء کے ہاں تلقی بالقبول کا شرف حاصل ہے اور اگر موطأ کی احادیث کا مؤید عمل اہل المدینۃ ہے تو کتاب الآثار کی احادیث کو بھی اہلِ فتاویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے تاکہ ان تینوں کتابوں سے بہر نوع کتاب الآثار کو مقدم ثابت کیا جائے۔ آیئے سرسری نظر سے اب اس دعویٔ غیر مرضیہ کا بھی جائزہ لے لیجیے۔

پہلی روایت

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بواسطہ حماد رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں:

لاتكون ذكوة نفس ذكوة نفسين.[2]

''یعنی بچہ مادہ جانور کے پیٹ میں ہو تو مادہ کو ذبح کرنے سے بچہ ذبح نہ ہوگا تا آنکہ اسے بھی ذبح کیا جائے۔''

چالیس ہزار احادیث وآثار سے انتخاب کرکے قرآنِ پاک اور اجماع کے موافق اور فقہاء کے ہاں جنھیں تلقی بالقبول حاصل تھا، ان میں سے ایک یہ اثر بھی ہے جب کہ امام

---

[1] الامام ابن ماجه وسننه :79 [2] كتاب الآثار:175، رقم:808

محمد رحمہ اللہ ہی نے فرما دیا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ تو اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ اس کے برعکس «ذکوة الجنین ذکوة أمه» کے الفاظ سے حدیث حضرت علی، ابن مسعود، ابوایوب، براء بن عازب، ابن عمرو، ابن عباس، کعب بن مالک، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ، ابوالدرداء اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ تام الخلقہ ہو، ماں کو ذبح کیا جائے، بچہ مرا ہوا ہو تو بچے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ماں کا ذبح ہونا ہی کافی ہے۔ علامہ زیلعی نے نصب الرایہ ① میں اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے التلخیص الحبیر ② میں ان روایات کی تفصیل بیان کی ہے اور دونوں نے ہی امام ابن المنذر رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا ہے۔

لم یرو عن أحد من الصحابة والتابعین وسائر العلماء أن الجنین لا یؤکل إلا باستئناف الذکاة فیه إلا ماروی عن أبی حنیفة ولا أحسب أصحابه وافقوه علیه. ③

”کسی ایک صحابی اور تابعی بلکہ تمام علماء سے کسی ایک سے یہ منقول نہیں کہ بچہ کو جب تک ذبح نہ کیا جائے اسے نہ کھایا جائے سوائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے، میرا خیال ہے کہ ان کے شاگردوں نے بھی اس میں ان کی موافقت نہیں کی۔“

امام محمد رحمہ اللہ نے کتاب الآثار ہی نہیں موطأ وغیرہ میں بھی اپنے استاد محترم سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ پہلے امام صاحب کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سعید بن المسیب رحمہ اللہ کا فتویٰ ذکر کیا ہے اور فرمایا کہ ہمارا قول اس کے مطابق ہے، مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ابراہیم نخعی کے قول کے مطابق فرماتے ہیں: کہ اس کا کھانا مکروہ ہے اگر زندہ

① نصب الرایة: 189,192/4 ② التلخیص الحبیر: 157/4 ③ نصب الرایة

ماں کے پیٹ سے نکل آئے تو ذبح کیے بغیر نہ کھایا جائے۔[1] علامہ محمد طاہر پٹنی نے بھی فرمایا ہے کہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں صحابۂ کرام اور سلف امت سے اختلاف کیا ہے۔[2]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے گو اس بارے میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے فتویٰ پر عمل کیا ہے مگر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا فتویٰ صحیح سند سے اس کے برعکس بھی ہے کہ «ذكاته ذكاة أمه» اس کی ماں کا ذبح اس بچہ کا ذبح ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے مختلف اسانید سے یہ اثر نقل کیا ہے۔[3]

بلکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''حماد عن ابراہیم'' کے واسطہ سے ان کا فتویٰ جو کتاب الآثار[4] میں ہے، نقل کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ «حماد إذ قال برأيه أصاب وإذا قال: قال إبراهيم أخطأ» کہ حماد رحمہ اللہ جب اپنی رائے سے کہیں تو درست ہوتا ہے اور جب ابراہیم رحمہ اللہ کا قول بیان کریں تو غلطی کرتے ہیں۔ یہی بات امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔[5] اس کے بعد متعدد تابعین کے فتاویٰ، حدیث کے مطابق ذکر کیے ہیں۔ ہم یہاں مزید اس کی اسنادی پوزیشن پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے، امر واقع یہ ہے کہ یہ اثر صحیح نہیں بالفرض اگر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اس فتویٰ کو تسلیم بھی کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں تو باور کرایا گیا ہے کہ برس سال تک احادیث کو قرآن مجید اور اجماع پر پیش کرتے رہے اور اصحاب الفتویٰ نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہوتا اس روایت اور اثر کو کتاب کی زینت بناتے مگر انھیں یہاں نہ بیشمارہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کسی روایت کا علم ہوا اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کے کسی فتوے ہی کا علم ہوا، اگر ہوا تو صرف اور صرف ابراہیم نخعی کے فتویٰ کا علم۔ حالانکہ یہ نقل بجائے خود محفوظ نہیں۔

---

[1] موطا: 483,484 [2] مجمع البحار: 442/1 [3] السنن الكبرى: 336/9 نیز دیکھیے مصنف عبدالرزاق: 8645,8646، الجعديات: 216/1 [4] كتاب الآثار: 9 [5] تهذيب: 17/3

ایک سوال

امام صاحب کے اصولِ فتویٰ میں تو یہ بات بڑے وثوق سے بیان کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسئلہ کی بنیاد پہلے قرآن پر، اس میں نہ ملے تو حدیث پر، پھر صحابہ کے اقوال پر رکھتے رہے ہیں۔ رہے تابعین کرام تو ان کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

هم رجال ونحن رجال

مگر غور فرمائیے یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ احادیث و آثار صحابہ کی بجائے ابراہیم رحمہ اللہ نخعی کے فتویٰ پر فتویٰ ہے، اصول کہاں گیا؟ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے تو فرمادیا ہے۔

إن هذا الحديث لعله لم يبلغ أبا حنيفة فإنه لاتأويل له ولو بلغه لما خالفه وهذا حسن.[1]

''یہ حدیث شاید امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو نہیں پہنچی، کیونکہ اس کی کوئی تاویل نہیں، اگر یہ حدیث انہیں ملتی تو وہ اس کی مخالفت نہ کرتے، اور یہ توجیہ اچھی ہے۔''

بلکہ خود مولانا لکھنوی نے فرمایا ہے: «فقول من قال بموافقة الحديث أقوى» کہ جن کا قول حدیث کے موافق ہے ان کا قول زیادہ قوی ہے۔[2]

اس مختصر وضاحت سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا نعمانی نے کتاب الآثار کی ترتیب میں جن اصولوں کو بیان کیا ہے وہ واقعی امام صاحب کے مناقب میں دیگر بہت سی روایات وحکایات کی طرح غلط اور محض خانہ ساز نہیں؟

دوسری روایت

کتاب الآثار، باب ذکاۃ الجنین والعقیقۃ کے تحت ہی امام صاحب پہلے ''حماد عن ابراہیم''

---

[1] التعليق الممجد: 284 [2] ایضاً

سے روایت کرتے ہیں کہ «كانت العقيقة في الجاهلية فلما جاء الإسلام رفضت» کہ عقیقہ زمانہ جاہلیت میں تھا جب اسلام آیا تو وہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہی قول انھوں نے «حدثنا رجل عن محمد بن الحنفية» سے نقل کیا ہے۔[1] امام محمد فرماتے ہیں: «وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ» ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور یہی قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

ہم یہاں اس بحث میں جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ عقیقہ سنت ہے یا واجب، یا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حنفی مذہب میں یہ جائز ہے یا ناجائز اور منسوخ۔ بلکہ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جن آثار کی بنا پر عقیقہ کو جاہلیت کا عمل کہہ کر منسوخ کہا گیا ہے۔ کیا فی الواقع یہ جاہلیت ہی کا عمل تھا اور اسلام میں اس کا کوئی حکم یا اس پر کوئی عمل نہیں رہا تھا کہ امام صاحب اور ان کے شاگردِ رشید نے اس کی مخالفت کی ہے۔ یہاں ہم مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ کی یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں تا کہ اس حوالے سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ امام محمد رحمہ اللہ نے عقیقہ کے بارے میں جو فرمایا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ عقیقہ مشروع نہیں یا یہ کہ مکروہ ہے جیسا کہ الجامع الصغیر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے، ان کے الفاظ ہیں:

كأنه يشير إلى عدم مشروعية العقيقة الآن أو إلى كراهته كما تفيد عبارته في الجامع الصغير. الخ[2]

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عقیقہ کی روایت کو حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت سلمان بن عامر الضبی، حضرت سمرہ، حضرت ام کرز، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت بریدۃ اسلمی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بیان کریں، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے تحفۃ المودود میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے التلخیص الحبیر میں ان روایات کو ذکر کیا ہے۔

---

[1] کتاب الآثار: 178، رقم: 809،810 [2] التعليق الممجد: 288

امام مالک رحمہ اللہ فرمائیں کہ «هذا الأمر الذی لا خلاف فیه عندنا» عقیقہ کے مسئلہ میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں، امام ابن المنذر فرمائیں کہ سرزمین حجاز میں «قديماً وحديثاً» اس پر عمل ہے۔ (1)

کسی ایک صحابی سے اس پر انکار ثابت نہ ہو، حتیٰ کہ حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی عقیقہ کے حق میں ذکر کیا ہے۔ لیکن غیر مستند سند سے مروی تابعی کے قول کی بنا پر یہ عمل، عملِ جاہلیت قرار پائے اور اس کی منسوخی اور عدم مشروعیت کا فتویٰ داغ دیا جائے۔ جس حقیقت کا علم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ سرزمین حجاز کے ائمۂ کرام کو نہ ہو، اس کا انکشاف کوفہ میں امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کو ہو جائے۔ ایں چہ بوالعجبی است۔ ہم یہاں نہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور نہ ہی حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے اثر کی استنادی حیثیت پر بحث مناسب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ دونوں اثر سنداً ضعیف اور کمزور ہیں، لیکن امام صاحب اور ان کے تلمیذ رشید کے فتویٰ کی بنیاد یہی دو اثر ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے تو اس پر انکار کیا ہے۔ بلکہ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ

فهذه كتب الحديث المعتبرة مملوءة من أحاديث شرعية العقيقة واستحبابها كما ذكرنا نبذا منها۔ الثاني: الأحاديث الدالة على استحبابها وشرعيتها لاشك أنها واقعة في الإسلام وهي معارضة لما بلغه من قول النخعي وابن الحنفية، ومن المعلوم أن أحاديث النبي صلى الله عليه وسلم أحق بالأخذ من قول غيره كائنا من كان۔ الثالث: أنه لو كان مطلق مشروعية العقيقة مرتفعة عن الإسلام لما عق النبي صلى الله عليه وسلم عن الحسن والحسين.... الرابع: أنه لو كانت

(1) تحفة المودود: 27

مشروعيتها المطلقة مرتفعة لما اختارها أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم بعد، الخ.[1]

''یہ معتبر کتب احادیث عقیقہ کی مشروعیت اور استحباب کے بارے میں بھری ہوئی ہیں جیسا کہ ان میں سے بعض کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

ثانیاً: احادیث جو عقیقہ کی مشروعیت واستحباب پر دلالت کرتی ہیں بلاریب وہ عہدِ اسلام ہی میں واقع ہوئی ہیں، وہ ابراہم نخعی اور ابن الحنفیہ کے قول کے معارض ہیں اور یہ حقیقت معلوم شدہ ہے کہ احادیثِ نبویہ کسی دوسرے کے قول سے زیادہ حق دار ہیں کہ ان سے استدلال کیا جائے، وہ قول خواہ کسی کا ہی کیوں نہ ہو۔

ثالثاً: اگر عقیقہ کی مشروعیت اسلام میں ختم ہوگئی تھی تو رسول اللہ ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا عقیقہ نہ کرتے۔

رابعاً: اگر اسلام میں عقیقہ کا حکم مرتفع ہوگیا ہوتا تو صحابۂ کرام اس کا اہتمام نہ کرتے۔''

مولانا لکھنوی رحمہ اللہ نے اپنے نقطۂ نظر سے جو بحث کی ہے اس سے قطعِ نظر ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عقیقہ کے عمل کی منسوخیت کا علم کسی صحابی کو نہیں ہوا۔ اس کا انکشاف عہد تابعین میں ہوا اور وہ بھی ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ پر، جن کی اسناد خود قابل اعتبار نہیں۔ تاہم اس پر امام صاحب اور ان کے ہمنواؤں نے فتویٰ دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یوں یا ان آثار کو ائمہ فتویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے؟ اور ایسے ہی غیر مستند آثار کو ''صحیح کتاب'' کی زینت بنایا جا سکتا ہے؟

تیسری روایت

امام محمد رحمہ اللہ باب الشرب فی الاوعیۃ میں ''ابوحنیفہ عن حماد عن ابراہیم'' کی سند سے ذکر کرتے ہیں کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

---

[1] التعليق الممجد:288

ما أسكره كثيره فقليله حرام، خطأ من الناس إنما أرادوا السكر حرام من كل شراب.[1]

”یہ کہنا کہ جس کا زیادہ پینا نشہ کا باعث ہے اس کا تھوڑا پینا بھی حرام ہے، یہ لوگوں کی غلطی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر پینے کی چیز سے نشہ حرام ہے۔“

یہ قول نقل کر کے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ

”یہی قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔“

امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ابن خسرو نے مسند الامام[2] میں نقل کیا ہے اس کے الفاظ ہیں: «القدح الأخر الذي يسكره هو الحرام» وہ آخری پیالہ جس سے نشہ ہو وہی حرام ہے۔

ہم یہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حنفی مسلک کی تفصیل اور اس سے متعلقہ مباحث کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ یہ سردست ہمارا موضوع بحث نہیں۔ ہم تو اس اثر کے حوالے سے قارئین کرام کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اسے بھی اصحاب الفتاویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے؟ اگر اصحابِ فتویٰ سے مراد کوفی اور حنفی فقہاء ہیں تو چشم ما روشن، دلِ ماشاد۔ لیکن اگر امت کے دیگر فقہاء بھی مراد ہیں تو ان میں سے کسی نے بھی اس اثر کے تناظر میں فتویٰ نہیں دیا۔ کیونکہ ان کے سامنے یہ حدیث صحیح ہے کہ «ما أسكر كثيره فقليله حرام» جسے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کی غلطی بتلاتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کی تائید و تقلید کرتے ہیں۔ علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ یہی حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں:

روي من حديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، ومن حديث جابر، ومن حديث سعد بن أبي وقاص، ومن حديث

---

① کتاب الآثار: 185، رقم: 843 ② مسند الامام: 412/1

علی، ومن حدیث عائشة، ومن حدیث ابن عمر، ومن حدیث خوات بن جبیر، ومن حدیث زید بن ثابت.[1]

گویا یہ حدیث کتبِ احادیث میں آٹھ صحابۂ کرام سے مروی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی الجامع[2] میں اسی حدیث کے الفاظ سے باب قائم کیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر کے فرمایا ہے کہ اس باب میں حضرت سعد، عائشہ، عبداللہ بن عمرو اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم سے بھی روایت ہے۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث بیس صحابہ سے مروی ہے اور کتاب الاشربہ میں ان روایات کا ذکر کیا ہے۔ یہی بات ان سے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری[3] میں ذکر کی ہے اور ان روایات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلکہ امام عبداللہ بن مبارک، جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ہیں، نے فرمایا ہے:[4]

لا يصح في حل النبيذ الذي يسكر كثيره عن الصحابة شيء ولا عن التابعين إلا عن إبراهيم النخعي.

''جس نبیذ کے زیادہ پینے سے نشہ ہو، اس کی (قلیل مقدار میں) حلت نہ کسی صحابی سے اور نہ ہی کسی تابعی سے ثابت ہے سوائے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ «كل مسكر حرام» ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ سائل نے عرض کیا آپ سچ فرماتے ہیں کہ نشہ آور حرام مگر چکھنے کے طور پر ایک دو گھونٹ؟ تو انھوں نے فرمایا: «ما أسكر كثيره فقليله حرام» امام احمد رحمہ اللہ نے اسے روایت کیا ہے اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند شرط مسلم پر صحیح ہے۔[5]

سائل کے جواب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس وضاحت سے اس تاویل کی بھی جڑ کٹ

---

[1] نصب الرايہ: 301/1 [2] الجامع: 104/3 [3] فتح الباری: 44/10

[4] فتح الباری: 43/10 [5] فتح الباری: 45/10

جاتی ہے، جس کا سہارا علامہ طحاوی رحمہ اللہ یا امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے لیا ہے۔

اسی حوالے سے جو ہرزہ سرائی مولانا ظفر احمد عثمانی نے کی ہے ہم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن یہاں اس کا جائزہ ہمارا موضوع نہیں۔

ہم نے پہلے عرض کیا کہ ہمارا مقصد اس مسئلہ کی تنقیح و تحقیق نہیں بلکہ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ جن الفاظ کو «خطأ من الناس» کہتے ہیں اور امام صاحب رحمہ اللہ بھی ان کی تائید فرماتے ہیں۔ وہ الفاظ تو حدیث کے ہیں اور بیس صحابہ نے بیان کیے ہیں۔ سب صحابہ اور تابعین کا فتویٰ و عمل اسی پر ہے بجز امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے۔ کیا اس کے بارے میں باور کر لیا جائے کہ اسے بھی اصحاب الفتاویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے؟

چوتھی روایت

امام محمد کتاب الآثار [1] باب إدخال الميت القبر میں ''ابوحنیفہ عن حماد عن ابراہیم'' کی سند سے ذکر کرتے ہیں کہ امام ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ میت کو قبلہ کی جانب سے اٹھا کر قبر میں رکھنا چاہیے اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ

وحدثني من رأى أهل المدينة يدخلون موتا هم في الزمن الاول من قبل القبلة، وأن السل شيء صنعه أهل المدينة بعد ذلك

''مجھے اس شخص نے بتلایا جس نے اہلِ مدینہ کو دیکھا کہ وہ اپنی میتوں کو پہلے زمانے میں قبلہ کی جانب سے قبر میں داخل کرتے تھے، اور قبر کی پاؤں والی جانب سے قبر میں اتارنے کا عمل لوگوں نے بعد میں شروع کیا۔''

---

[1] کتاب الآثار: 49

امام محمد رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ میت کو قبر کی پاؤں والی جانب سے نہیں، بلکہ قبلہ کی جانب سے قبر میں رکھنا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

ہمارا یہاں یہ سوال قطعاً نہیں کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کو یہ خبر دینے والا کون اور کیسا تھا؟ کیونکہ صحابی تو وہ یقیناً نہیں کہ صحابہ سے ان کی نہ روایت ہے نہ رؤیت، صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں جنھیں انہوں نے دیکھا، روایت ان سے بھی نہیں سنی۔ اور ابراہیم ثقات سے نہیں مجہول راویوں سے بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے معرفۃ علوم الحدیث [1] میں نقل کیا۔ بلکہ کتاب الآثار [2] میں وہ حنظلہ بن نباتہ اور ابونصر السلمی سے روایت کرتے ہیں جو مجہول و مستور ہیں جیسا کہ الایثار میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

اسی طرح یہاں اس مسئلہ کی تنقیح بھی مطلوب نہیں کہ میت کو قبر میں کس جانب سے اتارنا ہے۔ بلکہ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے اہلِ مدینہ کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے وہ کس قدر مبنی بر حقیقت ہے۔

کتاب الآثار میں امام محمد رحمہ اللہ کے الفاظ آپ کے سامنے ہیں اور کتاب الآثار قاضی ابو یوسف میں ان کے الفاظ ہیں:

كان أهل المدينة يدخلون من قبل القبلة في الزمان الأوّل فأحدثوا السل لضعف أرضهم. [3]

''کہ اہلِ مدینہ پہلے میتوں کو قبلہ کی جانب سے قبر میں داخل کرتے تھے پھر انھوں نے مدینہ کی زمین کمزور ہونے کی بنا پر پاؤں کی جانب سے داخل کرنا شروع کر دیا۔''

مدینہ طیبہ کی زمین نرم اور ''ضعیف'' تھی یا پتھریلی اور سخت تھی؟ اس پر اہلِ علم خود ہی فرمالیں گے۔ کیا نرم زمین میں ''لحد'' نکالی جا سکتی ہے؟ إن في ذلك لعبرة

[1] معرفة علوم الحديث: 108 [2] كتاب الآثار، رقم: 9,325 [3] كتاب الآثار، رقم: 421

لیکن اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھئے کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ اسی سند سے امام ابراہیم کا یہ بیان بھی نقل کرتے ہیں:

إن أصحاب محمد ﷺ كانوا يدخلون ممايلي القبلة ومن قبل الرجلين وكل ذلك كانوا يدخلون.[1]

''کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام میت کو قبلہ کی جانب سے داخل کرتے تھے اور پاؤں کی جانب سے بھی، ان دونوں طریقوں سے وہ قبر میں میت کو داخل کرتے تھے۔''

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب ان کے قول کے مطابق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دونوں پر عمل تھا۔ تو پھر ایک پر اصرار اور دوسرے سے انکار چہ معنی دارد؟ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے وہ قبلہ کی جانب سے میت کو قبر میں اتارتے تھے بعد میں زمین نرم ہوگئی تو پاؤں کی جانب سے اتارنے لگے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کے اس عمل کو ''احداث'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ بینوا توجروا

علاوہ ازیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ حارث کا انتقال ہوا تو انھوں نے پہلے سے وصیت کر رکھی تھی کہ میری نماز جنازہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن یزید پڑھائیں۔ چنانچہ انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی، راوی کا بیان ہے کہ

ثم أدخله القبر من قبل رجل القبر وقال: هذا من السنة[2]

''پھر انھوں نے حارث کو قبر کی پاؤں والی جانب سے قبر میں داخل کیا اور فرمایا یہ سنت ہے۔''

اور امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

---

(1) كتاب الآثار:84، رقم:418 (2) سنن أبي داود، رقم:3203، ابن أبي شيبة:328/3، بيهقي 54/4، عبد الرزاق:498/3

هذا إسناد صحيح وقد قال: هذا من السنة فصار من المسند.

''یہ سند صحیح ہے اور حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے یہ سنت ہے، تو یہ مرفوع ہوگئی۔''

کہنے والوں نے یہ کہہ کر اس سے گلو خلاصی کرالی کہ ''شاید کسی ضرورت کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہو اور صحابی اسے نہ سمجھ سکے تو اسے سنت سے تعبیر کر دیا۔''

یہ حقیقت مؤولین کی سمجھ میں تو آ گئی مگر افسوس صحابہ نہ سمجھ سکے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن یزید ہی نہیں، بلکہ یہی بات امام عامر شعبی رحمہ اللہ نے بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ابن علیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور وہ منصور بن عبدالرحمن رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے امام شعبی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آدمی نے میت کو قبر کی پاؤں والی جانب سے قبر میں اتارا ہے تو انھوں نے فرمایا: «هذا۔ والله۔ سنة» اللہ کی قسم یہ سنت ہے۔[1]

اس کی سند صحیح ہے البتہ مرسل ہے۔ مگر مرسل اور بالخصوص امام شعبی رحمہ اللہ کی، مرسل تو کیا ان کا تو قول بھی مؤولین کے ہاں حجت ہے۔[2]

اور کیا یہاں بھی اسی تاویل کی گنجائش ہے جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن یزید کے بیان میں پیدا کر لی گئی ہے؟ مزید برآں امام عبدالرزاق رحمہ اللہ امام ابن جریج رحمہ اللہ سے اور وہ بہت سے اہل مدینہ سے اور وہ بہت سے تابعین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کی جانب سے قبر میں دفن کیا گیا بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی اسی طرح دفن کیا گیا۔ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: «إن الأمر قبلهم لم يزل على ذلك» کہ پہلے یہی طریقہ ہمیشہ رہا کہ میت کو قبلہ کی جانب سے نہیں بلکہ سر کی جانب سے قبر میں اتارا جاتا تھا۔ مگر یہ روایت مرسل ہونے کے علاوہ اہل مدینہ اس میں مبہم و مجہول ہیں اور مسند روایت کے بھی خلاف ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ

---

[1] ابن أبي شيبة: 327/3 [2] إعلاء السنن: 11/3

هي من الأمور العامة التي يستغني فيها عن الحديث، ويكون الحديث فيها كالتكلف بعموم معرفة الناس لها، ورسول الله صلى الله عليه وسلم والمهاجرون والأنصار بين أظهرنا ينقل العامة عن العامة، لا يختلفون في ذلك أن الميت يسل سلا، الخ.[1]

''یہ تو ان عمومی امور میں سے ہے جن میں حدیث کی ضرورت نہیں بلکہ حدیث کی تلاش تو اس میں محض تکلف ہے۔ کیونکہ لوگوں کو اس کی عمومی معرفت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ، مہاجرین اور انصار کا عمل نقل العامۃ عن العامۃ کے طریقہ پر ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں کہ میت کو قبر کی پاؤں والی جانب سے قبر میں داخل کیا جائے۔''

اندازہ کیجئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت ﷺ اور مہاجرین وانصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس عمل کو متواتر قرار دیتے ہیں کہ میت کو پاؤں کی جانب سے قبر میں اتارا جائے اور اس مسئلہ میں حدیث کی تلاش کو تکلف سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ اسے بعد کے دور کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کہنے والوں نے کہا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے امام ابراہیم نخعی متقدم ہیں۔ مگر امام ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی نفی کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن یزید اور عامر الشعبی کا اسی عمل کو سنت قرار دینا اس پر مستزاد ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ الحارث الهمدانی ۶۵ھ میں فوت ہوئے جب حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ نے ان کا جنازہ پڑھایا۔ عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ عہدِ فاروقی میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں: میں نے ۵۰۰ صحابہ کو پایا ہے۔ جب کہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض نے ۴۹ھ کہا ہے اور تقریب[2] میں یہی

---

(1) کتاب الأم: 1/242، المعرفة للبيهقي: 3/183 (2) تقریب: 24

رجحان حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا کسی صحابی سے سماع نہیں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیارت کی ہے۔ [1]

بلکہ امام ابوداود نے فرمایا ہے:

مرسل الشعبي أحب إلي من مرسل النخعي.

''کہ میرے نزدیک شعبی کی مرسل نخعی کی مرسل سے زیادہ محبوب ہے۔'' [2]

بایں طور بھی کہ جب امام شعبی رحمہ اللہ کو بہر نوع تقدم حاصل ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کے بیان کو راجح قرار دیا جائے کہ وہ اسے سنت کہتے ہیں۔

ہم نے اس مسئلہ میں دیگر آثار اور مباحث سے قصداً صرفِ نظر کیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا یہ بیان خود ان کے دوسرے بیان کے معارض ہے، جو علت انھوں نے بجانب پاؤں سے دفن کرنے کی بتلائی وہ بھی پھس پھسی ہے، امام ابن جریج سر کی جانب سے دفن کرنے کا ذکر کرتے ہیں جب کہ حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ اور عامر شعبی رحمہ اللہ نے پاؤں والی جانب سے دفن کرنے کو سنت قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی پر متواتر عمل بتلایا ہے۔ اگر اس کے برعکس اکا دکا عمل ہے تو اسے ''سنت'' نہ خود کرنے والوں نے کہا ہے اور نہ ہی دیگر حضرات نے۔ کیا ''تلقی بالقبول'' اسی کا نام ہے؟

پانچوں روایت

امام محمد باب الصلاة بعرفة وجمع میں ''ابوحنیفہ عن حماد'' کی سند سے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

إذا صليت يوم عرفة في رحلك فصل كل واحد من الصلاتين لوقتها.

''جب تم عرفہ کے دن اپنے مقام پر نماز پڑھو تو دونوں نمازیں (ظہر و عصر) ان

---

[1] تہذیب: 1/178 [2] تہذیب: 1/68

کے اپنے اپنے وقت میں پڑھو۔"

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنے مقام پر بھی اسی طرح پڑھے جس طرح امام کے ساتھ دونوں پڑھی جاتی ہیں۔ کیونکہ عصر وقوفِ عرفہ کے لیے پہلے کر دی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

كذلك بلغنا عن عائشة أم المؤمنين وعن عبد الله بن عمر وعن عطاء بن أبي رباح وعن مجاهد.[1]

"اسی طرح ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عطاء رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ سے پہنچا ہے۔"

کتاب الآثار کی روایات و آثار کو جو اصحاب الفتیا کے ہاں معمول بہا اور تلقی بالقبول کا درجہ باور کرایا گیا ہے۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر پر تو تلمیذ رشید کا بھی عمل نہیں بلکہ جمہور فقہاء و محدثین کا بھی عمل نہیں۔ جس کی تفصیل یہاں مطلوب و مقصود نہیں۔ بلکہ تلمیذ رشید اس کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ کا فتویٰ و عمل پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے مقابلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اثر بہر نوع مقدم و مؤثر ہے۔ وہ معروف اصول کہاں گیا کہ حدیث نہ ہو تو امام صاحب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض متاخرین نے تلاش سے ایک صحابی کا اس حوالے سے اثر امام صاحب کی تائید میں پیش کیا ہے مگر کتب احادیث و آثار میں اس کا بالاسناد وجود مفقود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کی تائید میں صحابی کا قول ہوتا تو امام محمد رحمہ اللہ اس کے مقابلے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو پیش کرنے کا تکلف نہ کرتے۔ اور امام صاحب سے اختلاف کی جسارت بھی نہ کرتے۔

[1] کتاب الآثار: 70، رقم: 343

چھٹی روایت

اسی طرح امام محمد رحمہ اللہ ''ابوحنیفہ عن حماد'' سے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا یہ قول ذکر کرتے ہیں کہ امام نماز جمعہ میں تشہد میں بیٹھا ہو اور کوئی شخص اس حالت میں آکر امام کی نماز سے ملتا ہے تو وہ امام کے سلام کے بعد دو رکعت جمعہ کی پڑھے، امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے مگر

لسنا نأخذ بهذا من أدرك من الجمعة ركعة أضاف إليها أخرى، وإن أدركهم جلوساً صلى أربعاً وبذلك جاءت الآثار من غير واحد.

''ہم اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ جو جمعہ کی ایک رکعت پائے وہ دوسری ساتھ ملا کر پڑھے، اور اگر تشہد میں ملا ہے تو چار (ظہر کی) رکعتیں پڑھے، اس کے مطابق بہت سے آثار آئے ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے اپنی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ، حسن بصری، سعید بن المسیب، خلاس بن عمرو، علقمہ بن قیس، اسود بن یزید رحمہم اللہ..... جو امام ابراہیم نخعی کے استاد ہیں..... سفیان ثوری رحمہ اللہ اور زفر کا یہی فتویٰ ذکر کیا ہے۔[1]

اس کی تائید میں مرفوع احادیث بھی ہیں۔ مگر یہ تفصیل ہمارا موضوع نہیں۔ ہمیں تو بس یہ عرض کرنا ہے کہ کتاب الآثار کی روایات و آثار کو اصحاب الفتویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل نہیں۔ جیسا کہ نعمانی صاحب نے باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ امام صاحب کا فتویٰ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول پر ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی رضی اللہ عنہ اور بہت سے تابعین کا فتویٰ و عمل اس کے خلاف ہے۔ تلقی بالقبول کی بات ہوتی تو امام محمد رحمہ اللہ اس کی مخالفت نہ کرتے۔

---

[1] کتاب الآثار: 26، رقم: 128

ساتویں روایت

امام محمد، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اور وہ حماد رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے امام طاوس رحمہ اللہ اور امام سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ سے ثلث یا ربع پر مزارعت کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے اس کا امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے ذکر کیا تو انھوں نے اسے مکروہ قرار دیا اور فرمایا: طاوس اپنی زمین مزارعت پر دیتے تھے اسی لیے انھوں نے ایسا کہا۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابراہیم رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے، مگر ہم امام طاوس رحمہ اللہ اور سالم رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہیں کہ ثلث یا ربع پر مزارعت میں کوئی حرج نہیں۔ ①

غور فرمایئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول کو ''الآثار'' میں بیان فرمایا اور اس پر فتویٰ دیا، کیا اسے فقہاء اور اصحابِ فتویٰ کے ہاں تلقی بالقبول حاصل ہے؟ اسے تو ان کے تلمیذ رشید نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ کوثری رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے:

بل نعترف بأن المجتهد قد يخطئ في التفريع، ولأبي حنيفة بعض أبواب في الفقه من هذا القبيل ففي كتاب الوقف أخذ بقول شريح القاضي وجعله أصلًا ففرع عليه المسائل فأصبحت فروع هذا الكتاب غير مقبولة حتى ردّها صاحباه، وهكذا فعل في كتاب المزارعة حيث أخذ بقول إبراهيم النخعي وجعله أصلا ففرع عليه الفروع. ②

''بلکہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ مجتہد کبھی تفریعات میں غلطی کر جاتا ہے اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ

---

① كتاب الآثار: 172، رقم: 774 ② تأنيب الخطيب: 203

کے بعض فقہی ابواب اسی نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ کتاب الوقف میں انھوں نے قاضی شریح رحمہ اللہ کے قول کو اصل قرار دے کر اس پر مسائل کی تفریعات قائم کیں تو اس کتاب کی فروعات غیر مقبول ٹھہریں حتی کہ ان کے دونوں شاگردوں نے اسے ردّ کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے کتاب المزارعۃ میں کیا کہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول کو لیا اسے اصل قرار دے کر اس سے فروعات نکالیں۔‘‘

گویا وقف اور مزارعت کے بارے میں امام صاحب رحمہ اللہ کا موقف علامہ کوثری رحمہ اللہ کی نگاہ میں بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ مگر افسوس کہ ایسا اثر بھی نعمانی صاحب کے نزدیک فقہاء کے ہاں تلقی بالقبول کے درجہ میں ہے۔ (سبحان اللہ)

ہم نے بفضل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کتاب الآثار کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے، ہم نے دیکھا کہ امام محمد کتاب الآثار میں ذکر کردہ آثار وروایات کے بارے میں کھلے دل سے اختلاف کرتے ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہیں، مگر ہم نہیں مانتے۔ وہ ان کے مقابلے میں صحابہ ودیگر تابعین کے عمل کو ترجیح دیتے ہیں جس کی تین درجن کے قریب مثالیں پیشِ نظر ہیں۔ مگر اس تفصیل کا یہ مقالہ متحمل نہیں۔ بلکہ امام صاحب اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل کو لیتے ہیں تو امام محمد رحمہ اللہ اس کے برعکس حضرت عمر، علی اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہم کے عمل کو لیتے ہیں۔ کبھی دونوں بزرگ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر کو چھوڑ کر دوسرے صحابی کے اثر کو لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال وآثار میں بھی اخذ وردّ کا ذکر موجود ہے۔ اس لیے کتاب الآثار میں مروی آثار کو اصحاب الفتویٰ کے ہاں تلقی بالقبول کا درجہ دینا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ اور صحیحین کے مقابلے میں دل کے بہلانے کی بے کار کوشش ہے۔

بے سند دیگر روایات

بلکہ کتاب الآثار میں بعض ایسی روایات ہیں جو بہر نوع بے بنیاد ہیں اور وہ بھی بیر ہ جو

صحیح احادیث کے معارض ومخالف ہیں۔ مثلاً قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عن أبي حنيفة عن حماد عن سعيد بن جبير عن ابن عمر أنه قال صلى النبي صلى الله عليه وسلم في الكعبة أربع ركعات، قال: فقلت له أرني المكان الذي صلى فيه. إلخ[1]

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں چار رکعت پڑھی ہیں۔ میں نے ان سے کہا مجھے وہ مقام دیکھایے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے۔''

اس روایت کے بارے میں مولانا ابوالوفا افغانی مرحوم نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''صحاح میں روایت معروف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے، آپ کے ہمراہ اسامہ، بلال اور عثمان الحجبی رضی اللہ عنہم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں نماز پڑھی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ آپ نے کس جگہ نماز پڑھی۔'' یعنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیت اللہ کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہی نہ تھے۔ اور انھوں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ نماز پڑھی تھی، مگر کتاب الآثار میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ مولانا افغانی نے اس حقیقت کا اظہار اور یہ اختلاف تو ذکر کر دیا، مگر کاش مولانا مرحوم یہ بھی ذکر کر دیتے کہ ''صحاح'' میں، کعبہ کے اندر کتنی رکعت نماز پڑھنے کا ذکر ہے تو معاملہ صاف ہو جاتا۔ صحیح بخاری[2] ہی میں دو رکعتوں کا ذکر ہے۔ علامہ محمد بن یوسف الشامی نے سبل الہدیٰ میں «ذكر قدر صلاته صلى الله عليه وسلم في الكعبة» کے تحت اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''بخاری و مسلم میں یحییٰ بن سعید کی روایت میں، بخاری اور نسائی میں ابوالفضل نعیم ابن دکین، ابن خزیمہ میں ابوعاصم الضحاک بن مخلد، اسماعیلی میں عمر بن علی، مسند امام احمد میں عبداللہ بن نمیر، یہ سب سیف بن ابی سلیمان عن مجاہد عن ابن عمر سے

[1] الآثار، رقم: 546 [2] صحیح بخاری: 397

روایت کرتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں نماز پڑھی، انھوں نے کہا: ہاں، دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ سیف بن ابی سلیمان کی متابعت مسند احمد میں خصیف نے کی ہے اور مجاہد کی متابعت مسند احمد، نسائی میں ابن ابی ملیکہ نے اور عمرو بن دینار نے کی ہے جیسا کہ مسند احمد میں ہے۔''[1]

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت، میں مختلف ومتعدد اسانید سے دو رکعت پڑھنے کا ہی ذکر ہے۔ بلکہ علامہ ابن یوسف شامی نے حضرت جابر، عثمان بن طلحہ، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمٰن بن صفوان رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابۂ کرام سے بھی دو رکعت پڑھنے کا ہی ذکر کیا ہے۔[2]

اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ بیت اللہ کے اندر نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے، نماز کی تعداد کے بارے میں سوال کرنے یا نہ کرنے کا ذکر تو احادیث میں ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے ان کے مابین تطبیق دی ہے۔ مگر یہ کسی صحیح روایت میں نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ روایت کتاب الآثار میں ہے، مگر سنداً صحیح نہیں۔ کیونکہ حماد بن ابی سلیمان اپنی عمر کے آخر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ امام صاحب ان کے اس دور میں بھی حماد سے ''استفادہ'' کرتے رہے ہیں بلکہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

لا يقبل من حديث حماد إلا ما رواه عنه القدماء: شعبة وسفيان الثوري والدستوائي وما عدا هؤلاء رواه عنه بعد الاختلاط.[3]

کہ حماد کی وہی حدیث مقبول ہوگی جو ان سے ان کے پہلے شاگرد شعبہ، سفیان ثوری اور ہشام دستوائی رحمہ اللہ بیان کریں اور جو ان کے علاوہ ہیں انھوں نے اختلاط کے بعد سماع کیا ہے۔ یہی بات امام احمد نے بھی فرمائی ہے۔[4] جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں۔

---

[1] سبل الهدى: 241/5 [2] فتح الباري: 501/1 [3] مجمع الزوائد: 116/1 [4] تهذيب 16/3

اس لیے یہ روایت تو تبھی قابلِ اعتنا ہو سکتی ہے جب حماد سے اس کے قدماء تلامذہ بیان کریں یا اس کی کسی اور ثقہ نے متابعت کی ہو۔ ورنہ یہ بہر حال غلط اور شاذ ہے۔

دوسری روایت

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کتاب الآثار میں ''ابو حنیفہ عن حماد'' ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں:

إنه كان لا يسجد في صٓ، ولا يسجد في سورة الحج إلا في الأولى.[1]

''کہ وہ سورۂ صٓ میں سجدہ نہیں کرتے تھے اور سورۃ الحج میں صرف پہلا سجدہ ہی کرتے تھے۔''

مولانا ابو الوفا افغانی نے حاشیہ میں فرمایا ہے کہ ''حماد عن ابن مسعود'' کے درمیان میں ''عن ابراہیم'' کا واسطہ گرا ہوا ہے۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں یہ اثر ابراہیم کے واسطہ سے نقل کیا ہے اور اس میں سورۃ الحج میں سجدہ کا ذکر نہیں۔ عرض ہے کہ بلاشبہ امام محمد نے الآثار[2] میں یہ اثر ''عن ابراہیم'' کے واسطہ سے ہی ذکر کیا ہے اور اس میں سورۃ الحج میں سجدہ کرنے یا نہ کرنے کا ذکر بھی نہیں۔ روایت میں ایسا اختلاف کوئی بعید نہیں۔ مگر یہ جو قاضی ابو یوسف نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سورۃ الحج میں صرف پہلا سجدہ کرنے کا ہی ذکر فرمایا ہے یہ محدثین اور ائمہ کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد صحت الرواية فيه من قول عمر بن الخطاب وعبد الله ابن عباس وعبدالله بن عمر وعبد الله بن مسعود وأبي موسى

---

[1] الآثار: 40، رقم: 203 [2] الآثار: 42، رقم: 209

وأبي الدرداء وعمار رضی الله عنهم.[1]

”یعنی سورۃ الحج میں دو سجدوں کے بارے میں صحیح روایت حضرت عمر، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، ابو موسیٰ، ابوالدرداء اور عمار رضی اللہ عنہم کے قول و عمل سے آتی ہے۔“

اس کے بعد انھوں نے بالاسناد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سورۃ الحج میں دونوں سجدے کرنے کی روایت ذکر کی ہے۔ یہی بات امام بیہقی رحمہ اللہ نے المعرفہ[2] میں اور ان کا باسناد اثر السنن[3] میں ذکر کیا ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ کی یہی بات علامہ زیلعی نے نصب الرایہ[4] میں، اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے التلخیص الحبیر[5] میں بلا نکیر نقل کی ہے۔ حتی کہ علامہ ابن قدامہ نے تو فرمایا ہے:

فإنه قول من سمينا من الصحابة لم نعرف لهم مخالفاً في عصرهم فيكون إجماعاً.[6]

”یہ ان صحابہ کا قول ہے جن کا ہم نے نام لیا ہے، ہم نہیں جانتے کہ ان کے زمانے میں کسی نے ان کی مخالفت کی ہو تو یہ اس پر (صحابہ کا) اجماع ہوا۔“

بلکہ ابو اسحاق تابعی جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد ہیں، فرماتے ہیں: ستر سال سے تو میں نے لوگوں کو سورۃ الحج میں دونوں سجدے کرتے دیکھا ہے۔[7]

اس لیے کتاب الآثار کی یہ روایت بھی ضعیف ہونے کے علاوہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے معروف عمل کے خلاف بیان ہوئی ہے۔ اس کی سند صحیح ہوتی تو ہم اس بارے میں ان کے دو قول تسلیم کر لیتے۔ إذ ليس فليس

---

[1] المستدرك: 390/2 [2] المعرفة: 153/2 [3] السنن: 318/2 [4] نصب الرایة: 180/2 [5] التلخيص الحبير: 9/2 [6] المغني: 649/1 [7] ابن أبي شيبة: 12/2، المغني لابن قدامة: 649/1

تیسری روایت

قاضی صاحب ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بواسطہ "الھیثم عن ابی قحافۃ" بیان کرتے ہیں:

أنه أتي به النبي صلى الله عليه وسلم ولحيته قد انتشرت فقال: لو أخذتم، وأشار بيده إلى نواحي لحيته.[1]

"کہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، ان کی ڈاڑھی منتشر تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش تم اس کو کاٹتے اور آپ نے اپنے ہاتھ سے ڈاڑھی کی دونوں طرف اشارہ کیا۔"

مولانا ابوالوفاء افغانی نے اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے۔ یہ روایت بھی سنداً و متناً غور طلب ہے۔ الھیثم، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاد الھیثم بن ابی الھیثم ہیں۔ ابوالھیثم کا نام حبیب تھا۔ تہذیب التہذیب[2] میں ان کا تذکرہ موجود ہے اور وہ ثقہ ہیں۔ تابعین سے وہ روایت کرتے ہیں اور الایثار میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ اتباع التابعین میں شمار ہوتے ہیں۔[3] وہ یہ حدیث حضرت ابوبکر کے والد محترم ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ (سبحان اللہ)

یہی روایت علامہ الحارثی نے مسند ابی حنیفہ[4] میں اور انھی کے واسطہ سے علامہ الخوارزمی نے جامع المسانید[5] میں «عن الهيثم عن رجل أن أبا قحافة» سے بیان کی ہے۔ مگر یہ "رجل" بھی مجہول ہے ہیثم تبع تابعی ہیں۔ اس لیے یہ "رجل" بہر حال صحابی تو نہیں، اس لیے سند میں کم سے کم دو واسطے ساقط ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی کے بکھرے بالوں کو دیکھ کو کاٹ چھانٹ کا حکم فرمایا تو یہ بھی اسی بے سند روایت کا کرشمہ ہے۔ ورنہ صحیح روایات میں تو سر اور ڈاڑھی کے بالوں کی سفیدی اور انھیں بس رنگنے کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ روایت بھی بے اصل ہونے کے علاوہ صحیح روایات کے تناظر میں منکر ہے۔

---

[1] الآثار: 234 رقم: 1038 [2] تهذيب التهذيب: 81/11 [3] الايثار: 27

[4] مسند أبي حنيفة: 359 مترجم [5] جامع المسانيد: 309/2

چوتھی حدیث

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ امام صاحب رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

بلغني أن رسول الله ﷺ مر بأم سلمة وهي تسبح بنواتها فقام عليها هنية ثم قال لها: لقد قلت كلمات لهن أكثر مماقلت ثم أخبرها أنه قال: سبحان الله عدد خلقه، سبحان الله زنة عرشه، سبحان الله مداد كلماته. (1)

”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے، وہ اپنی گٹھلیوں پر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ تھوڑی دیر وہاں رُکے، پھر ان سے فرمایا: میں نے کچھ کلمات کہے ہیں ان کا ثواب اس سے بہت زیادہ ہے جو کچھ تم نے پڑھا۔ پھر آپ ﷺ نے انھیں بتلایا کہ میں نے یہ کلمات پڑھے ہیں۔ سبحان الله عدد خلقه“ الخ

یہ روایت اصولِ حدیث کی اصطلاح میں امام صاحب کی بلاغات میں سے ہے۔ مگر یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔

(1) بتلایا گیا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پیش آیا۔ جب کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ یہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث کے ہاں پیش آیا مگر اس میں گٹھلیوں کا ذکر نہیں۔ مستدرک حاکم، طبرانی اور ترمذی وغیرہ میں ہے کہ یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پیش آیا، اس میں گٹھلیوں کا ذکر ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ ابو داود، ترمذی وغیرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک عورت کے ہاں گئے، اس میں نام کا ذکر نہیں اور اس میں بھی گٹھلیوں کا ذکر ہے، مگر سند اس کی بھی محل نظر ہے۔

ہمیں یہاں ان روایات کی اسنادی پوزیشن مطلوب نہیں، صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسند روایات میں سے صحیح روایت میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ ہے ایک میں حضرت

---

(1) الآثار، رقم: 217، 42

صفیہ رضی اللہ عنہا کا اور دوسری میں ایک عورت کا۔ کسی مسند روایت میں، گو وہ ضعیف سند سے ہی کیوں نہ ہو، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام نہیں آیا۔ اس لیے الآثار کی یہ روایت معلق ہونے کے علاوہ اس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر منکر ہے۔ اسے تعددِ واقعہ پر محمول کرنا بھی عبث ہے اس لیے کہ جب یہ سنداً صحیح ثابت ہی نہیں تو تعدد کیسا؟

پانچویں روایت

امام محمد رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

حدثنا شيخ لنا يرفعه إلى النبي ﷺ أنه نهى عن تربيع القبور وتجصيصها. ①

”ہمارے ایک شیخ نے ہمیں حدیث بیان کی رسول اللہ ﷺ نے منع کیا کہ قبر کو چوکور بنایا جائے اور اسے چونا گچ کیا جائے۔“

یہ روایت امام صاحب نے ”شیخ“ مبہم ومجہول سے روایت کی ہے اور مولانا ابوالوفاء افغانی نے اعتراف کیا ہے: «لم أظفر بإسناده في كتب الحديث» کہ کتبِ حدیث میں اس کی سند پانے میں، میں کامیاب نہیں ہوا۔ ②

سند کیا یہ متن بھی ان الفاظ سے غریب ہے۔ البتہ تجصیص کی ممانعت دیگر احادیث سے ثابت ہے اور قبروں پر عمارت بنانا بھی ممنوع ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ مگر الآثار میں جو الفاظ آئے ہیں۔ ان کا ثبوت بہرحال محلِ بحث ہے۔

چھٹی روایت

امام محمد رحمہ اللہ نے الآثار میں «أبو حنيفة اخبرني رجل عن الحسن عن عمر بن الخطاب» کی سند سے حضرت عمر کا یہ قول نقل کیا ہے: «الاب احق بالصلاة على الميت من الزوج» کہ باپ عورت کا جنازہ پڑھانے کا خاوند سے زیادہ حق دار ہے۔“ ③

① الآثار: 52، رقم: 257 ② حاشیہ کتاب الآثار: 201/2 ③ الآثار: 261

مگر قاضی ابو یوسف نے امام صاحب سے اسے «عمن حدثه عن الحسن» حسن بصری کا قول ذکر کیا ہے یہ علامہ الخوارزمی نے جامع المسانید[1] میں اسے امام محمد سے نقل کیا قاضی ابو یوسف کی روایت ذکر نہیں کی۔ المصف لا بن ابی شیبہ[2] میں یہ بواسطہ اسماعیل بن علیہ عن یونس، اور المصنف لعبد الرزاق[3] میں یہ بواسطہ ہشام بن حسان یہ قول حسن بصری سے ہی منقول ہے۔[4] غور طلب بات یہ ہے کہ الآثار لمحمد میں «عن عمر ابن الخطاب» کا اضافہ کس کا ہے؟ جب کہ الآثار لأبی یوسف میں بھی یہ اسی سند سے حسن بصری کا قول ذکر ہوا ہے۔

ساتویں حدیث

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے الآثار میں «ابو حنیفة عن حماد عن ابراهیم» کی سند سے حضرت عمر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نماز صبح کی پہلی رکعت میں ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور دوسری میں ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ﴾ تلاوت کی۔[5]

جبکہ الآثار لأبی یوسف[6] میں اسی سند سے ہے کہ انہوں نے ﴿وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ﴾ اور ﴿قُلْ يَاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ تلاوت فرمائی، امام صاحب الفاظ حدیث کو خوب یاد رکھنے والے تھے مگر یہاں الآثار کے ان ''دونسخوں'' میں یہ اختلاف کس بات کا غماز ہے؟ اگر اسے تکلفاً تعدد پر محمول کیا جائے تب بھی سوال یہ ہے کہ نماز میں خلافِ ترتیب مصحف قراءت کرنے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے[7] مگر امام محمد کی کتاب الآثار میں وارد شدہ الفاظ کی روشنی میں اسے مکروہ قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

آٹھویں حدیث

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ہی نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

حدثنا شیخ لنا یرفعه إلی النبی ﷺ قال: ارحموا الضعیفین

---

[1] جامع المسانید 456/1 [2] المصف لا بن ابی شیبة 363/3 [3] المصنف لعبد الرزاق 472/3 [4] نیز دیکھیے الاوسط لا بن المنذر 437/5 [5] الآثار رقم: 187
[6] الآثار لأبی یوسف، رقم: 235 [7] السعایہ 309/2

المرأة والصبی۔[1]

''ہمیں ہمارے ایک شیخ نے حدیث بیان کی اور وہ اسے نبی ﷺ سے مرفوع بیان کرتے تھے کہ دو کمزوروں پر رحم کرو، عورت اور بچے پر۔''

یہ روایت بھی معلق ہے اور امام صاحب کے شیخ کا نام نہیں ہے۔ علامہ الخوارزمی نے جامع المسانید[2] میں بھی اسے کتاب الآثار سے نقل کیا ہے۔ مگر اس کی سند کیا ہے؟ اور یہ متن بھی، امام صاحب کے علاوہ ہی سہی، کسی اور سند سے کتبِ احادیث میں پایا جاتا ہے؟

«إني أحرّج عليكم حق الضعيفين اليتيم والمرأة» کے الفاظ سے حدیث تو ابن ماجہ، مسند امام احمد، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے۔ شیخ البانی نے گو اسے الصحیحہ[3] میں ذکر کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ ابن عجلان مدلس مختلط ہونے کے علاوہ سعید عن ابی ہریرۃ سے اس کی روایات بالخصوص تخلیط کا شکار ہیں۔ اور یہ بھی ''سعید عن ابی ہریرۃ'' سے ہے۔ پھر اس میں یتیم اور عورت کے حقوق اور مال میں کھیلنے کی حرمت کا بیان ہے مگر کتاب الآثار کی روایت میں بچے اور عورت پر رحم کا حکم ہے۔ رحم کرنا چاہیے، مگر ان الفاظ کا ثابت ہونا محلِ بحث ہے، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اور اس میں فرق واضح ہے۔

یہاں پھر ہم قارئین کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ: ''بہت بعید ہے کہ پہلا مدون غلطی کرے'' کیا تسلیم کر لیا جائے کہ محولہ روایات میں بھی غلطی کا کوئی امکان نہیں؟ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر روایات سے امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کے اس قول کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امام صاحب وہی بیان کرتے ہیں جو انہیں حفظ ہوتی ہے اور جو حفظ نہیں ہوتی بیان نہیں کرتے۔[4] اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: امام صاحب کے نزدیک یہ شرط ہے کہ راوی نے تحمل سے لے کر ادا تک حدیث کو یاد رکھا ہو۔ کیا یہ روایات انہی شروط کے مطابق صحیح ہیں؟

ہم انھی چند روایات پر اکتفا کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ کتاب

---

[1] الآثار: 200، رقم: 913 [2] جامع المسانید: 90/1 [3] الصحیحۃ، رقم: 1050

[4] تاریخ بغداد 419/13

الآثار کی روایات کی پوزیشن کیا ہے۔ بلاشبہ اس میں ثقہ راویوں سے بھی روایات ہیں مگر انھی کی بنیاد پر اس میں جو کذاب، متروک، ضعیف، مجہول اور مبہم راویوں سے روایات ہیں انھیں صحیح باور کرانا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ ان کے علاوہ اس کی مراسیل و منقطع روایات، مدلس اور مختلط راویوں کی احادیث اس پر مستزاد ہیں۔

نعمانی صاحب کا ایک اور دعویٰ

مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

''کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث احکام یعنی سنن ہیں جن سے مسائل فقہ کا استنباط ہوتا ہے۔'' الخ [1]

بڑی خوب صورت بات ہے جو انھوں نے فرمائی مگر افسوس کہ یہ بھی ان کے دیگر دعاوی کی طرح صحیح ثابت نہیں ہو پاتی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار، جسے وہ امام صاحب کی کتاب الآثار کا نسخہ قرار دیتے ہیں، میں تو بہت سی احادیث کا تعلق احکام اور سنن سے قطعاً نہیں۔ مولانا ابو الوفاء افغانی رحمہ اللہ نے اس کی جو فہرست موضوعات کے مطابق بنائی ہے اگر نعمانی مرحوم ایک نظر اسے ہی دیکھ لیتے تو یہ بوگس دعویٰ قطعاً نہ کرتے۔ چنانچہ مولانا افغانی مرحوم نے کتاب الایمان کے تحت اکیس، کتاب العلم کے تحت دس، کتاب الآداب کے تحت پچیس، کتاب الفتن کے تحت تیرہ، کتاب شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت سولہ، کتاب المناقب میں ستائیس احادیث و آثار ذکر کیے ہیں۔ یوں کتاب الآثار کی کل روایات ۱۰۶۷ میں سے ۱۱۳ روایات کا تعلق احکام و سنن سے قطعاً نہیں۔

اسی طرح کتاب الآثار امام محمد میں باب الجهاد في سبيل الله، باب فضائل الصحابة، باب الصدق والكذب والغيبة والبهتان، باب تقييد العلم، باب ليلة القدر، باب من عمل عملًا ألبسه الله رداءه وارحموا الضعيفين، باب من دل على خير كمن فعله، باب الزهد، باب الرفق

[1] ابن ماجه اور علم حديث: 169

والخرق، باب الرقية من العين بھی کیا احکام اور سنن سے متعلق ہیں؟ نعمانی صاحب تو کتاب الآثار پر تخصص کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان ابواب کو دیکھتے ہوئے بھی وہ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث احکام یعنی سنن قرار دینے پر بے جا اصرار فرماتے ہیں۔

کتاب الآثار کیا چالیس ہزار احادیث سے انتخاب ہے؟

مولانا نعمانی رقم طراز ہیں:

اسناد و روایت کے اعتبار سے کتاب الآثار کی مرویات کا کیا درجہ ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نظرِ انتخاب نے چالیس ہزار احادیث کے مجموعہ سے چن کر ان کو روایت کیا ہے۔ صدر الائمہ موفق مکی تحریر فرماتے ہیں کہ ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار احادیث سے کیا ہے۔''[1]

اولاً تو موفق مکی کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ثانیاً: چالیس ہزار احادیث سے منتخب روایات کا جائزہ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں، اس تناظر میں تو یہ دعویٰ محض دیوانے کے بڑ کے مترادف ہے۔ ثالثاً: خود نعمانی صاحب نے ہی لکھا ہے کہ ''امام حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی احادیث کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے۔ دو ہزار حماد سے دو ہزار باقی مشائخ سے۔''[2]

لہٰذا جب امام صاحب کی مرویات کی تعداد بقول حسن اللؤلؤی چار ہزار ہے تو پھر چالیس ہزار سے انتخاب کے دعویٰ کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ علامہ الخوارزمی رحمہ اللہ نے «الحسن بن زیاد عن ابی حنیفة» کی مرویات کو «مسند ابی حنیفة الذی رواہ الحسن» سے نقل کر کے جامع المسانید میں جمع کر دیا ہے۔ تو کیا اس سند سے مروی روایات کی تعداد جامع المسانید میں چار ہزار ہے؟ حالانکہ جامع المسانید میں کل روایات ۱۷۷۸ ہیں[3] ان میں وہ روایات بھی ہیں جو حسن

---

[1] ابن ماجه اور علم حديث:164 [2] ابن ماجه اور علم حديث:175

[3] جامع المسانيد مطبوعه مكتبه حنفيه كوئٹه

لؤلؤی کی سند سے نہیں ہیں۔ تو یوں وہ چار ہزار احادیث کیا ہوئیں؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ہم یہاں امام صاحب کی مرویات کے حوالے سے دیگر بیانات، جن کا تذکرہ نعمانی صاحب نے بھی کیا ہے، کی تفصیلی وضاحت میں جانا نہیں چاہتے کہ ہمارا موضوع نہیں۔

کتاب الآثار کی خدمت

کسی کتاب کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس کی کس قدر شروح وحواشی لکھے گئے؟ غریب الفاظ کی کس حد تک وضاحت کی گئی؟ اور کہاں تک مشکلات اور ان کا حل پیش کیا گیا؟ اور اسانید ورجال کے تتبع میں کہاں تک کوشش ہوئی؟ کس کس نے اس پر استدراک، اس کے شواہد اور متابعات لکھے؟ کس کس نے اس پر اعتراضات والزامات اور کس کس نے ان کا دفاع کیا؟ اس حوالے سے ہم جب دیکھتے ہیں تو کتاب الآثار، جسے ''ام الأم'' اور حدیث کا پہلا صحیح مجموعہ قرار دینے پر اصرار ہو رہا ہے، کو وہ مقام نہیں ملا جو موطأ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حاصل ہے۔ محدثِ ہند شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اسی حوالے سے رقم طراز ہیں:

إن شئت الحق الصراح فقس كتاب الموطأ بكتاب الآثار لمحمد والأمالي لأبي يوسف تجد بينه وبينهما بعد المشرقين، فهل سمعت أحداً من المحدثين والفقهاء تعرض لهما واعتنى بهما؟ [1]

''اگر تم واضح حق چاہتے ہو تو موطأ کا کتاب الآثار امام محمد رحمہ اللہ اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی الامالی سے تقابل کرو، تو تم موطأ اور دوسری دونوں کتابوں کے مابین بعد المشرقین پاؤ گے۔ کیا محدثین اور فقہاء میں سے کسی سے سنا ہے کہ وہ ان دونوں کی طلب کے درپے ہوئے ہوں، اور ان کا اعتنا اور اہتمام کیا ہو؟''

قاضی عیاض نے تو کہا ہے کہ

لم يعتن بكتاب من كتب الحديث والعلم اعتناء الناس بالموطأ. [2]

---

[1] حجة الله: 1/134 [2] مقدمه تحفة الاحوذي: 85

''لوگوں نے جس قدر موطا کا اعتنا کیا ہے اس قدر حدیث اور علم کی کسی کتاب کا نہیں کیا۔''

قاضی عیاض نے نوے اہلِ علم کا ذکر کیا ہے جنھوں نے موطأ کی احادیث اور رجال پر بحث کی ہے۔ ان کے بعد اس کتاب کی خدمت کرنے والے کون کون ہیں ان کا شمار مشکل ہے۔ اس کے برعکس کتاب الآثار کے بارے میں مولانا نعمانی مرحوم نے ہی لکھا ہے کہ ''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور حافظ قاسم رحمہ اللہ قطلو بغا نے اس کے رجال پر کتابیں تصنیف کی ہیں، صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ کتاب الآثار امام محمد رحمہ اللہ پر امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح لکھی، علامہ مرادی نے بھی سلك الدرفي أعيان القرن الثاني عشر میں شیخ ابوالفضل نورالدین علی بن مراد موصلی شافعی المتوفی ۱۱۴۷ھ کے ترجمہ میں ان کی شرح الآثار للامام محمد کا ذکر کیا ہے۔''[1]

یہ ہے کل جمع پونجی جس کا ذکر کتاب الآثار کے حوالے سے مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علمائے امت نے اس سے کس قدر اعتنا کیا ہے۔ بلکہ خود علمائے احناف نے اس کی کیا قدر افزائی کی ہے۔ بس یہی دو نام، ایک علامہ طحاوی رحمہ اللہ اور دوسرا علامہ قاسم رحمہ اللہ کا۔

آخری دور میں مولانا ابوالوفا افغانی مرحوم نے اس کی مفصل شرح لکھی لیکن وہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پائی۔ نوسوسولہ روایات میں سے صرف ۲۶۹ روایات کی شرح وحواشی لکھ پائے تھے کہ پیامِ اجل آپہنچا اور یوں یہ شرح ادھوری رہ گئی۔ اس حقیقت کے باوجود یہ کہنا کہ کتاب الآثار ''ام الام'' اور یہ پہلا صحیح مجموعہ احادیث ہے'' بلکہ ''موطا کی کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے'' محض دل کے بہلانے کا ذریعہ اور احساسِ محرومی کے ازالے کی گھٹیا کوشش ہے۔

---

[1] ابن ماجہ اور علم حدیث: 174

ہماری ان گزارشات سے یہ حقیقت نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب الآثار اپنی روایات کے آئینہ میں قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کی تمام یا اکثر روایات کو صحیح اور اسے صحیح احادیث پر مشتمل پہلی کتاب قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس میں کذاب، متروک، ضعیف، مجہول اور مبہم راویوں کی روایات پائی جاتی ہیں۔ مدلس اور مختلط راویوں کے علاوہ منقطع اور مرسل، معلق اور بلاغات بھی ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایسے راویوں کی روایات سے استدلال بھی کیا ہے۔ اس لیے اس کی منقطع اور معلق روایات کو صحیح بخاری کی معلقات کے تناظر میں سمجھنا کوئی عقل مندی نہیں۔ اس کی بعض روایات میں متن کے اعتبار سے سخت نکارت پائی جاتی ہے اور کئی روایات صحیح احادیث اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متواتر عمل کے بھی خلاف ہیں۔ لہٰذا اس کی روایات و آثار کے بارے میں تلقی بالقبول کا دعویٰ بھی حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسند الإمام أبی حنیفة للحارثی

ایک تجزیہ وتبصرہ

الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد:

انواع واقسامِ کتبِ حدیث میں ایک نوع ''مسند'' ہے جس میں عموماً فقہی ترتیب کی بجائے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی روایات کو جمع کیا جاتا ہے۔ اور علیحدہ علیحدہ ہر صحابی کی مرویات کو ایک ہی جگہ ذکر کیا جاتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ مرویات کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولیت وسابقیت کی بنا پر اور کبھی حروفِ تہجی کے مطابق بالترتیب جمع کی جاتی ہیں۔ ایسی کتب مسانید میں اہم ترین کتب کے نام یہ ہیں: مسند الإمام أبی داود سلیمان ابن داود الطیالسی (المتوفی: ۲۰۴ھ) مسند الإمام أحمد بن حنبل (المتوفی: ۲۴۱ھ) مسند الإمام إسحاق بن إبراهيم المعروف بابن راهويه (المتوفی: ۲۳۸ھ) مسند الإمام أبی یعلی أحمد بن علی الموصلی (المتوفی ۳۰۷ھ) مسند الإمام أبی بکر أحمد بن عمرو البزار (المتوفی: ۲۵۲ھ) علامہ محمد بن جعفر کتانی نے ایسی ۸۲ مسانید کا ذکر کیا ہے اور فرمایا

ہے کہ اس کے علاوہ بھی بہت سی مسانید ہیں۔[1]

''مسند'' کا اطلاق ایسی کتب پر بھی ہوتا ہے جن میں فقہی ترتیب سے مرفوع روایات کو جمع کیا گیا ہو، جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کی «الجامع المسند الصحیح» اور امام مسلم رحمہ اللہ کی «المسند الصحیح المختصر» ہے۔ اسی طرح امام بقی بن مخلد (المتوفی ۲۷۶ھ) کی «المسند»، امام محمد بن اسحاق السراج کی «المسند» امام ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق (المتوفی ۳۱۶ھ) کی «المسند» بھی فقہی ترتیب پر ہے۔

بعض حضرات نے بعض خاص صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات کو مسند کی صورت میں جمع کیا ہے، جیسے امام ابوبکر احمد بن علی المروزی (المتوفی ۲۹۲ھ) کی ''مسند ابی بکر الصدیق''۔ اسی طرح امام ابوبکر احمد بن سلیمان النجار (المتوفی ۳۴۸ھ) کی ''مسند امیر المومنین عمر بن الخطاب''۔ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے بھی ''مسند الفاروق'' مرتب کی تھی، جس میں امیر المومنین کے اقوال بھی شامل تھے اور فقہی ترتیب پر مشتمل تھے۔ اسی طرح امام ابن ابی داود عبداللہ بن سلیمان (المتوفی ۳۱۶ھ) کی ''مسند عائشہ ام المومنین''، امام ابو عبداللہ احمد بن ابراہیم بن کثیر (المتوفی ۲۴۶ھ) کی ''مسند سعد بن ابی وقاص''، شیخ ابو امیہ محمد بن ابراہیم الطرسوسی (المتوفی ۲۷۳ھ) کی ''مسند عبداللہ بن عمر'' ہے۔

بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو مسانید کی ترتیب پر ہیں مگر ان کا نام مسند نہیں ہے، جیسے حافظ ضیاء المقدسی رحمہ اللہ کی ''المختارۃ'' ہے۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ کی ''العلل'' بھی مسند کی ترتیب پر ہے۔ اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی ''جامع المسانید'' ہے اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ کی ''الجامع الکبیر'' میں ''قسم الافعال'' مسند کی ترتیب پر مرتب ہے۔ ائمہ فقہائے اربعہ رحمہم اللہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ کی کتاب الموطأ کے نام سے مشہور ومتداول ہے۔ اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ کی ''المسند'' بھی مشہور ومعروف ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی ''مسند'' بھی مشہور ہے، مگر اس کے مرتب ابو عمرو محمد بن جعفر رحمہ اللہ (المتوفی ۳۶۰ھ) ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ

---

[1] الرسالة المستطرفة: 63

امام ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم رحمہ اللہ (المتوفی ۳۴۶ھ) اس کے مرتب ہیں۔ مگر یہ مسند نہ ابواب پر اور نہ ہی مسانید کے اسلوب پر مرتب تھی۔ علامہ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ نے فقہی ابواب پر اسے مرتب کیا بلکہ «مصعد الألمعي المهذب في حل مسند الإمام الشافعي المرتب» کے نام سے اس کی شرح بھی لکھی جس کا آخری کچھ حصہ مکتبہ محمودیہ (مدینہ منورہ) میں بتلایا جاتا ہے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ''مسانید'' ہیں ان میں سے مسند کے نام سے کوئی کتاب بھی امام صاحب کی نہیں، البتہ متاخرین نے ان کی مرویات کو مسند کے نام سے جمع کیا ہے۔ جن کی تعداد اٹھائیس تک ذکر کی جاتی ہے۔ انھی مسانید میں سے پندرہ مسانید کو علامہ ابوالمؤید محمد بن محمود الخوارزمی (المتوفی ۶۶۵ھ) نے ''جامع المسانید'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ انھی مسانید میں سے ایک مسند حافظ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن حارث بن خلیل الحارثی البخاری (المتوفی ۳۴۰ھ) کی ہے۔

المسند بروایۃ أبي محمد الحارثي

اس مسند کا اختصار قاضی صدرالدین موسیٰ بن زکریا الحصکفی (المتوفی ۶۵۰ھ) نے کیا جو مسند ابی حنیفۃ للحصکفی کے نام سے معروف ہے۔ علامہ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ نے اسے فقہی ترتیب پر مرتب کیا اور «المواهب اللطيفة فى الحرم المكى على مسند أبي حنيفة للحصكفي» کے نام سے ایک ضخیم شرح لکھی، جس کا خطی نسخہ المکتبۃ العالیہ پیر جھنڈا میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی ایک شرح علامہ علی قاری (المتوفی ۱۰۱۴ھ) نے بھی لکھی جو ایک جلد میں مطبوع اور متداول ہے۔ اسی طرح مولانا محمد حسن سنبھلی لکھنوی المتوفی (۱۳۰۵ھ) نے «تنسیق النظام» کے نام سے اس کی مفصل شرح لکھی۔ اور وہ بھی مطبوع ہے۔

حافظ ابومحمد حارثی کی یہ مسند بالاسناد پہلی بار المکتبۃ الامدادیۃ، مکہ مکرمہ سے دو جلدوں

میں ''فضیلۃ العلامۃ المحدث المحقق الشیخ لطیف الرحمٰن البہرائجی القاسمی'' کی تحقیق وتخریج سے آراستہ ہو کر شائع ہوئی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں جب ہیچ مداں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عمرے کی سعادت عطا فرمائی تو فضیلۃ الشیخ الاخ العلامۃ عزیر شمس حفظہ اللہ نے اس مسند کا نسخہ عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس پر تبصرہ آنا چاہیے۔ آج اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے ان کے اسی حکم کی تعمیل میں اپنی گزارشات قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وما توفیقی إلا باللہ العلی العظیم

حافظ ابو محمد الحارثی کا تعارف

حافظ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن حارث بن خلیل الحارثی السبذمونی الکلاباذی البخاری، جو عبداللہ الاستاذ کے لقب سے مشہور ہیں۔

''الکلاباذی'' نسبت خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ذکر کی ہے۔ یہ ''کلاباذ'' بخاریٰ کے ایک محلے کا نام ہے۔[1] ''السبذمون'' بخاریٰ کی ایک بستی کا نام ہے جو بخاریٰ سے نصف فرسخ پر تھی۔ علامہ سمعانی رحمہ اللہ نے اسی نسبت میں حافظ الحارثی کا ذکر کیا ہے اور ''الاستاذ'' نسبت میں بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے اور فرمایا ہے کہ انھیں ''الاستاذ'' کے لقب سے اس لیے یاد کیا جاتا ہے کہ وہ امیر بخاریٰ اسماعیل بن احمد السامانی کے گھر میں رہتے تھے اور وہ ان سے مسائل پوچھتے اور یہ ان کا جواب دیتے تھے اس وجہ سے دربارِ شاہی میں وہ ''الاستاذ'' کے لقب سے ملقب تھے۔

استاذ حارثی ۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ حافظ موسیٰ بن ہارون، ابوالموجہ محمد بن الموجہ المروزی، یحییٰ بن ساسویہ المروزی، محمد بن فضل البلخی، فضل بن محمد الشعرانی، الحسین بن فضل البلخی، محمد بن یزید الکلاباذی، عبداللہ بن واصل، سہل بن المتوکل، حمدویہ بن الخطاب، علی بن

---

[1] معجم البلدان: 472/4

الحسینی بن الجنید الرازی اور محمد بن علی بن زید الصائغ وغیرہ سے استفادہ کیا۔

اور الحافظ ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید بن عقدہ الہمذانی، ابوبکر احمد بن محمد بن السری ابن ابی حازم، ابوبکر محمد بن عمر الجعابی، امام علی بن موسیٰ القمی نیشاپوری شیخ الحنفیہ، حافظ ابوعبداللہ محمد بن اسحاق بن مندہ الاصبہانی، احمد بن محمد بن یعقوب الکاغذی البغدادی اور بہت سے دیگر حضرات نے ان سے روایت کی ہے۔ ۸۲،۸۱ سال عمر پائی اور ۳۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ بعض نے ان کی وفات ۳۴۵ھ میں ذکر کی ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انھیں العلامة، الفقيه، شيخ الحنفية بما وراء النهر اور كان محدثا، جوالا، رأسا في الفقه کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ [1]

اسی طرح حافظ قاسم بن اصبغ قرطبی کے ترجمے میں بھی ان کا ذکر «عالم ماوراء النهر ومحدثه، الإمام، العلامة» کے القاب سے کیا ہے۔ [2]

بلاشبہ وہ ماوراء النہر میں شیخ الحنفیہ تھے حتی کہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے انھیں ''الحافظ'' کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ [3]

مگر حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ہی ذکر کیا ہے کہ استاذ الحارثی کے تلمیذ حافظ احمد بن الحسین ابوزرعہ رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

هو صاحب عجائب وأفراد عن الثقات.

''وہ ثقات سے ایسی روایات بیان کرتا ہے جن میں وہ منفرد ہے اور عجیب روایات بیان کرتا ہے۔''

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوسعید الرواس نے کہا: وہ حدیث گھڑنے میں متہم ہے۔'' احمد السلیمانی کہتے ہیں: ''وہ یہ سند اُس متن کے لیے اور اِس متن کے لیے وہ سند گھڑتا تھا۔'' اور یہ وضعِ حدیث کی قسم ہے۔ خطیب بغدادی نے کہا ہے: ''یہ اس درجے کا

[1] العبر 253/2 [2] تذكرة الحفاظ: 853/3 [3] تعجيل المنفعة: 239/1

نہیں کہ اس سے استدلال کیا جائے۔ وہ صاحبِ عجائب ومناکیر ہے۔ البتہ ابن مندہ اس کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ کتاب القراءۃ میں فرماتے ہیں: میں نے حافظ ابواحمد سے سنا، فرماتے تھے:

كان عبد الله بن محمد بن يعقوب الأستاذ ينسج الحديث، قال: ولست أرتاب فيما ذكره أبو أحمد من حاله فقد رأيت في حديثه عن الثقات من الأحاديث الموضوعة ما يطول بذكره الكتاب وليس يخفى حاله على أهل الصنعة. (1)

عبداللہ بن محمد بن یعقوب الاستاذ حدیث بناتا تھا اور حافظ ابواحمد رحمہ اللہ نے اس کا جو حال ذکر کیا ہے اس کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں، میں نے اس کی حدیث میں ثقہ راویوں سے موضوع احادیث دیکھی ہیں جن کا ذکر کتاب کی تطویل کا باعث ہے۔ اس کا حال اہلِ فن سے مخفی نہیں۔"

حافظ الخلیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"اس کو حدیث کی معرفت تھی مگر وہ کمزور ہے اور محدثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔"

علامہ السمعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ کثیر الحدیث ہے مگر روایت میں ضعیف ہے۔ جو وہ نقل کرتا ہے اس میں ثقہ نہیں ہے۔ حفاظ نے کہا کہ وہ مناکیر اور اباطیل روایت کرتا ہے۔ (2)

---

(1) كتاب القراءة: 178 (2) تاريخ بغداد: 126/10، الأنساب: 129/1,213/3، ميزان الاعتدال: 496/2، لسان الميزان: 348,349/3، العبر: 253/7، الإرشاد للخليلي: 972/3، سير أعلام النبلاء: 424,425/15، تاريخ الإسلام: 190/23، المغني: 355/1، الضعفاء لابن الجوزي: 141/2، الجواهر المضية: 289,290/1، شذرات: 357/2، الفوائد البهية: 105,106، الكشف الحثيث عمن رمى بوضع الحديث للحلبي: 248، اللباب: 50/1,100/2

نیچے دیئے گئے تمام مراجع میں ابو محمد الحارثی کو ضعیف اور نا قابل استدلال قرار دیا گیا ہے حتی کہ علامہ حلبی نے «الکشف الحثیث» میں ذکر کر کے گویا صراحت کر دی ہے کہ یہ وضاع ہے اور من گھڑت روایات بیان کرتا تھا۔ یہی بات حافظ ابو احمد، امام بیہقی، حافظ احمد السلیمانی اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ بلکہ انھوں نے تو اس کی مرتب کردہ مسند ابی حنیفہ کے بارے میں بھی فرمایا ہے:

قد ألف مسنداً لأبی حنیفة الإمام وتعب علیه لکن فیه أوابد ماتفوه بها الإمام،راجت علی أبی محمد. ①

''اس نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مسند تالیف کی ہے، اس پر بڑی مشقت اٹھائی مگر اس میں بڑی منکر و متروک روایات ہیں جو امام صاحب نے روایت نہیں کیں، ابو محمد کی وجہ سے وہ عام ہو گئی ہیں۔'' ②

استاد حارثی کی طرح عبداللہ بن محمد بن جعفر القزوینی شافعی فقیہ اور قاضی نے بھی مسند الشافعی لکھی تو اس میں اس نے دو سو احادیث ایسی داخل کر دیں جنھیں امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان نہیں کیا۔ ③ ائمہ کرام کے نام سے ایسی کارستانی بھی کی گئی۔ ان فی ذلک لعبرۃ جس سے مسند ابی حنیفہ اور اس کے مصنف کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ آپ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے اس تبصرے کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

دفاع کی ناکام کوشش

اس حقیقت کے برعکس شیخ ابو محمد الحارثی کے دفاع میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے، چنانچہ علامہ عبدالقادر قرشی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال سے بحوالہ ابن الجوزی

---

① السیر: 425/15 ② لسان المیزان میں محمد بن قاسم کے ترجمے میں اسی مسند کا ذکر ہے، جس کے حاشیہ میں شیخ ابو غدہ نے السیر سے حافظ ذہبی '' کا مسند ابی امام حنیفہ پر یہ تبصرہ نقل کر کے گویا اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ (لسان المیزان: 444/7) ③ میزان: 495/2

ابو سعید الرواس کا قول «متهم بوضع الحديث» نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

عبد الله بن محمد أكبر وأجل من ابن الجوزي ومن أبي سعيد الرواس.[1]

''عبد اللہ بن محمد، ابن جوزی اور ابو سعید الرواس سے بڑے اور زیادہ جلیل القدر ہیں۔''

چلیے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عبد اللہ الحارثی، ابن جوزی رحمہ اللہ اور ابو سعید رحمہ اللہ سے زیادہ عظمت وشان رکھتے تھے۔ مگر یہ بھی دیانت کی کون سی معراج ہے کہ میزان الاعتدال سے ابن جوزی کے حوالے سے ابو سعید کا قول نقل کر کے ضمیر کا بوجھ کم کرنے کے لیے کہہ دیا جائے کہ عبد اللہ الحارثی، ابن جوزی اور ابو سعید سے زیادہ عظمت والے تھے۔ مگر اسی میزان میں حافظ احمد السلیمانی، حافظ ابو زرعہ احمد بن الحسین، امام حاکم، خطیب بغدادی اور حافظ الخلیلی رحمہم اللہ کے اقوال سے صرفِ نظر کر لی جائے! کیا یہ سبھی حضرات بھی عبد اللہ الحارثی سے کم تر مرتبہ رکھتے ہیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ ''الجواہر المضیہ'' کے حنفی مصحح جناب حسن نعمانی صاحب نے علامہ قرشی کے اس قول پر حاشیے میں دیگر ائمہ حدیث کی جرح نقل کر کے اس کی کمزوری واضح کر دی ہے۔ عبد اللہ الحارثی کے فقیہ، کثیر الحدیث اور مفتی ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ بلکہ ان پر راویِ حدیث اور ایک محدث ہونے کے اعتبار سے جرح ہے کہ وہ استدلال واحتجاج کے قابل نہیں اس لیے کہ ان پر تو وضعِ حدیث کا الزام ہے اور وضاعین میں انھیں شمار کیا گیا ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ مسند الامام الاعظم کے ''محقق، علامہ، محدث'' قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ ابو محمد الحارثی پر رد وقدح کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ضعفاء سے روایت کرتے ہیں، پھر بعض ضعفاء ومتروکین کا ذکر کرتے ہیں کہ ان سے فلاں فلاں محدثین نے

---

[1] الجواهر المضية: 290/1

روایت کی ہے۔ لہٰذا ضعفاء سے روایت کرنا باعثِ قدح نہیں۔ ①

اولاً: عرض ہے کہ ثقات کا ضعفاء و متروکین سے روایت کرنا ثقات پر قدح کا باعث نہیں تو کیا یہ ان ضعفاء کے ثقہ ہونے کی بھی دلیل ہے؟ اگر نہیں تو ابو محمد الحارثی کی توثیق کے حوالے سے یہ کہنا کہ اس سے حافظ ابن مندہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ حارثی کی توثیق کی دلیل کیسے ہے؟ ②

ثانیاً: ابو محمد الحارثی کے بارے میں اعتراض ضعفاء و متروکین سے روایت کرنے پر ہی نہیں بلکہ وہ ثقات سے بھی عجائبات روایت کرتے ہیں، چنانچہ امام حاکم رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

ھو صاحب عجائب وأفراد عن الثقات.

ثالثاً: اس کا ''صاحبِ عجائب'' ہونا اور بواطیل روایت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ضعفاء و ثقات کے نام پر وہ موضوع روایات بیان کرتا ہے۔ حسین بن داود بن معاذ بلخی کے بارے میں بھی امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے:

له عجائب یستدل بھا علی حاله. ③

''ہمارے پاس اس کے عجائبات ہیں جن سے اس کے حال پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔''

خطیب بغدادی نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ اس کی حدیث موضوع ہے۔ مزید تفصیل کے لیے شیخ سید عبدالماجد الغوری کی معجم المصطلحات الحدیثیة ④ ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح ''باطل'' کا اطلاق موضوع حدیث پر بھی ہوتا ہے۔ ⑤ اس لیے ابو محمد حارثی ضعفاء و متروکین اور مجاہیل سے ہی روایت نہیں کرتا بلکہ ثقات سے موضوعات بھی بیان کرتا

---

① مقدمہ: 37-33 ② مقدمہ: 52 ③ لسان: 283/2 ④ معجم المصطلحات الحدیثیة: 483,484 ⑤ معجم المصطلحات: 189

ہے۔ جس کی مثالیں آئندہ ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئیں گی۔

رابعاً: ضعفاء ومتروکین سے روایت اگرچہ بعض ائمہ کے نزدیک درست ہے مگر اکثر ائمہ جرح وتعدیل کے نزدیک جائز نہیں، چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فكل من كان متهماً في الحديث في الكذب أو كان مغفلا يخطىء الكثير فالذي اختاره أكثر أهل الحديث من الأئمة أن لا يشتغل بالرواية عنه.[1]

''جو حدیث میں جھوٹ بولنے سے متہم ہو یا مغفل کثیر الخطأ ہو اکثر ائمۂ محدثین کا موقف ہے کہ اس کی روایت سے شغل نہ رکھا جائے۔''

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ اسی مسئلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

أنه يجوز رواية حديث من كثرت غفلته في غير الأحكام، وأما رواية أهل التهمة بالكذب فلا تجوز إلّا مع بيان حاله، وهذا هو الصحيح.[2]

''جو راوی کثرتِ غفلت کا شکار ہو اس کی روایت احکام کے علاوہ (زہد، ترغیب اور آداب میں) بیان کرنا جائز ہے مگر متہم بالکذب کی روایت اس کی حالت بیان کیے بغیر جائز نہیں اور یہی موقف صحیح ہے۔''

اس لیے محدثین کا راجح اور صحیح موقف یہی ہے کہ کثیر الخطا اور متہم بالکذب کی روایت بیان کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی محدث اور ثقہ راوی ایسے راوی کی حدیث بیان کرتا ہے تو یہ اس کی توثیق نہیں، اور نہ ہی یہ ثقہ راوی کی تضعیف کا موجب ہے۔ ابو محمد حارثی تو خود ثقہ راوی نہیں ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ کذابین سے بہ کثرت روایات لیتے ہیں بلکہ ثقات سے بھی

[1] العلل مع التحفة: 390/4 [2] شرح العلل: 387/1

ایسی احادیث بیان کرتے ہیں جو باطل ہیں۔ لہٰذا علامہ قاسمی کا ان کے دفاع میں یہ سہارا محض طفل تسلی ہے کہ ضعفاء ومتروکین اور کذابین سے روایت موجب قدح نہیں۔

ابوسعید الرواس رحمۃ اللہ علیہ کی جرح

حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، ابوسعید الرواس رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''ابو محمد حارثی وضع حدیث سے متہم ہے۔''

اس جرح کے جواب میں علامہ قاسمی صاحب فرماتے ہیں:

''ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ جرح وتعدیل میں معروف نہیں۔ میں نے اس کا ترجمہ بھی نہیں پایا۔ بلکہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ شاذ آراء واقوال بیان کرنے میں معروف ہیں اور نقل میں قابلِ اعتبار نہیں۔''[1]

عرض ہے ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ الرواس اگرچہ ائمۂ جرح وتعدیل میں معروف نہیں مگر ان کا یہ قول حافظ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ سے متعدد حضرات نے نقل کیا ہے اور کسی نے بھی ابوسعید الرواس رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا، چنانچہ یہ قول حافظ ذہبی، حافظ ابنِ حجر، حافظ عجمی رحمہم اللہ کے علاوہ حافظ قاسم قطلو بغا رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عبد القادر قرشی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے، لہٰذا ابوسعید الرواس رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر عدمِ اعتماد بجائے خود ناقابلِ اعتبار ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے تسامحات بجا مگر یہاں تو متاخرین نے ان پر اعتماد کیا ہے اور ان کی نقل پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ علامہ قرشی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے اس کی پوزیشن ہم پہلے واضح کر آئے ہیں۔

رہے ابوسعید الرواس رحمۃ اللہ علیہ تو ان کا نام بندار بن علی بن حسن ہے۔ ان سے ابوطالب نصر بن حسین القاضی الدینوری، ابوالقاسم کمار بن عمر بن عبدالرحمٰن المقرئ البزار، عمر بن علی

---

[1] مقدمہ المسند: 48,49/1

ابونصر الدینوری جیسے اعیان روایت کرتے ہیں بلکہ ان کی مجلس املا قائم تھی، جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی بغیۃ الوعاۃ [1]، حافظ ابوطاہر سلفی کی معجم السفر [2]، علامہ ابن طولون کی الاحادیث المئة المشتملة على مئة نسبة إلى الصنائع [3] اور امام ابن عساکر رحمہ اللہ کی تاریخ دمشق [4] سے عیاں ہوتا ہے۔

علامہ ذہبی، حافظ ابن حجر اور علامہ عجمی رحمہم اللہ وغیرہ کا اس حوالے سے ابوسعید الرواس رحمہ اللہ پر اعتماد بھی اس کا مؤید ہے کہ وہ نا قابلِ اعتماد نہیں بلکہ شیخ ابوغدہ رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ ایسے حاملینِ علم کے بارے میں تعدیل وتوثیق تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ان پر جرح نہ ہونا ہی کافی ہے، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

إن الأصل في حملة العلم هي العدالة مالم يتبين خلاف ذلك،فلا حاجة لقبول خبر حامل العلم معروف العناية به إلى وجود توثيق أو تعديل فيه،بل يكفي عدم ثبوت الجرح في دينه أو ضبطه.[5]

جناب علامہ قاسمی صاحب کو اپنے مہربان شیخ ابوغدہ کی یہ وضاحت پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور ابوسعید الرواس رحمہ اللہ پر بے جا اعتراض سے گریز کرنا چاہیے۔

حافظ احمد بن علی سلیمانی کی جرح کے جواب میں علامہ قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حافظ سلیمانی وہی ہیں جنھوں نے امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ پر بے جا تنقید کی ہے اور کہا ہے: «كان يضع للروافض» وہ روافض کے لیے احادیث گھڑتے تھے۔"

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کبار ائمۂ اسلام میں سے ہیں۔ جس طرح حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام ابن جریر رحمہ اللہ

---

(1) بغية الوعاة: 444 (2) معجم السفر،رقم: 1143 (3) الأحاديث المئة المشتملة على مئة نسبة إلى الصنائع،رقم: 43 (4) تاريخ دمشق: 351/53 (5) حواشي خمس رسائل في علوم الحديث: 88

کا دفاع کیا ہے اسی طرح ہم حافظ عبداللہ بن محمد بن یعقوب حارثی پر حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کی بے جا جرح کا جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی رجم بالظن الکاذب کے قبیل سے ہے۔ ملخصاً۔ (1)

عرض ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بلاشبہ امام ابن جریر رحمہ اللہ پر حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کے کلام کو رجم بالظن الکاذب کہا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے:

فلعل السليماني أراد الآتي. (2)

''شاید حافظ سلیمانی کے کلام کا مصداق آئندہ ذکر ہونے والے محمد بن جریر ہیں۔''

بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو کہا ہے۔

لو حلفت أن السليماني ما أراد إلا الآتي لبررت، والسليماني حافظ متقن كان يدري ما يخرج من رأسه فلا أعتقد أنه يطعن في مثل هذا الإمام بهذا الباطل. (3)

''اگر میں قسم اٹھاؤں کہ اس کلام میں حافظ سلیمانی کا ارادہ آئندہ ذکر ہونے والے محمد بن جریر کے بارے میں ہی ہے تو میں بری الذمہ ہوں گا۔ سلیمانی حافظ متقن ہیں وہ جانتے تھے کہ ان کے سر سے کیا نکل رہا ہے۔ میں یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ انھوں نے یہ باطل بات امام ابن جریر رحمہ اللہ جیسے امام کے بارے میں کہی ہو۔''

مگر افسوس ہے حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ وضاحتی بیان جناب علامہ قاسمی صاحب نے نظر انداز کر کے عبداللہ حارثی کے دفاع کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں علامہ ذہبی رحمہ اللہ یا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کی امام ابن جریر رحمہ اللہ پر جرح کو اگر باطل قرار دیا ہے تو اس سے یہ کس طرح لازم آتا ہے کہ عبداللہ حارثی پر بھی ان کی جرح باطل ہے؟ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی حارثی پر جرح اور اس کی جمع کی ہوئی مسند امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر

(1) مقدمہ: 49,50 (2) میزان: 499/3 (3) لسان: 100/5

تبصرہ پہلے گزر چکا ہے۔ حافظ ابوزرعہ احمد بن حسین رازی، امام حاکم، خطیب بغدادی، حافظ خلیلی، حافظ ابواحمد اور امام بیہقی رحمہ اللہ کا کلام اس پر مستزاد ہے۔ اس لیے علامہ قاسمی صاحب کا عبداللہ حارثی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ کے تقابل و تناظر میں ذکر کرنا بجائے خود غلط ہے اور ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' کا مصداق ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ پر اگر حافظ سلیمانی رحمہ اللہ نے جرح کی ہے تو وہ اس میں تنہا ہیں۔ مگر یہاں معاملہ یوں نہیں استاذ ابومحمد رحمہ اللہ کی توثیق ثابت نہیں جبکہ متعدد حضرات نے ان پر جرح کی ہے اس لیے حافظ سلیمانی رحمہ اللہ جرح میں منفرد نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی جرح کی یہاں تردید بلا جواز مدافعانہ کارروائی ہے۔

بلکہ عبداللہ حارثی نے جن اسانید سے متونِ احادیث بیان کیے ہیں، بجائے خود ان سے حافظ سلیمانی رحمہ اللہ کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ (ان شاء اللہ) اس کی وضاحت آئندہ آئے گی۔ عبداللہ حارثی کی اسی کمزوری کے باعث ہی تو علامہ حلبی رحمہ اللہ نے اسے «الکشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث» میں اور علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی نے «تنزیہ الشریعۃ» کے مقدمے [1] میں وضاعین کا ذکر کرتے ہوئے استاذ عبداللہ حارثی کا بھی ذکر کر کے اس کے وضاع ہونے کو ثابت کیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ علامہ قاسمی نے ''العمر'' وغیرہ میں استاذ حارثی کے بارے میں «الشیخ، الفقیہ، العلامۃ، المحدث، الحافظ، شیخ الحنفیۃ» جیسے الفاظ کو الفاظِ تعدیل میں شمار کیا ہے، حالانکہ انھی کتابوں میں اس پر جو جرح ہے اور خود علامہ ذہبی رحمہ اللہ وغیرہ کا جو فیصلہ ہے اس سے ان کلمات کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ الفاظ عدالت و ضبط میں بھی صریح نہیں ہیں۔ ''حافظ'' کا لفظ اس کے کثیر الروایۃ ہونے اور اس کے حفظ و ضبط پر تو دلالت کرتا ہے مگر عدالت کے لیے یہ قطعاً صریح نہیں۔ ابوایوب سلیمان بن داود شاذ کونی، محمد بن عمر واقدی، ہشام بن محمد بن سائب کلبی جیسے کذابین کو بھی حافظ کہا گیا ہے۔

[1] مقدمہ: 75

فقہ وفتاویٰ کا دائرہ اور ہے جبکہ حدیث کا میدان اس سے مختلف ہے۔ استاذ حارثی بلاشبہ شیخ الحنفیہ تھے، اس اعتبار سے ان کے مقام ومرتبے کا کسی کو انکار نہیں۔ اعتراض ہے تو اس پر کہ روایتِ حدیث میں ان کا مقام اور مرتبہ کیا اور کیسا ہے؟ علامہ قاسمی ہوں یا ان کے دیگر ہمنوا، وہ ان کے بارے میں کسی سے بھی ثقہ یا صدوق کا کلمہ ذکر نہیں کر پائے۔ ان کی تشفی صرف اس سے ہوتی ہے کہ اگر وہ متہم ومتروک ہوتے تو حافظ ابن مندہ یا حافظ ابن عقدہ اس سے روایت نہ لیتے۔ حالانکہ خود علامہ قاسمی فرماتے ہیں متروکین، کذابین اور ضعفاء سے ثقات نے روایت لی ہے۔ اور اس کی انھوں نے متعدد مثالیں ذکر کی ہیں۔ ①

اگر ان متروکین وکذابین سے ثقات کی روایت ان کے ثقہ ہونے کی دلیل نہیں تو حافظ ابن عقدہ یا حافظ ابن مندہ وغیرہ کا استاذ حارثی سے روایت لینا اس کی توثیق کی دلیل کیونکر ہے؟

یہاں یہ بات بھی پیشِ نگاہ رہے کہ بعض علمائے احناف نے استاذ حارثی کے تعارف میں یہ بات بڑی شدومد سے کہی ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمے میں انھیں امام، العالم، العلامۃ اور عالم ماوراء النہر کے القاب سے نوازا ہے۔ ②

حالانکہ تقریباً یہی القاب العبر، سیر أعلام النبلاء اور تاریخ اسلام میں بھی ہیں۔ بالخصوص جبکہ انھوں نے تذکرۃ الحفاظ میں اس کا ترجمہ ذکر نہیں کیا۔ صرف تذکرۃ الحفاظ میں ضمنی حوالے سے استاذ حارثی کا تعارف امانتِ علمی کے بالکل منافی ہے۔ تعجب ہے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان، العبر اور السیر وغیرہ میں جو سخت ترین جرح کی ہے اس سے اغماض کیوں کیا جاتا ہے؟ اور اس جرح کے جواب کی جو کوشش کی گئی ہے اس کی پوزیشن بھی قارئین کے سامنے ہے۔

---

① مقدمہ: 43-34 ② حاشیۃ دراسات اللبیب: 205، حاشیۃ الأجوبۃ الفاضلۃ: 214، حاشیۃ "الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن": 58، ومقدمۃ مسند الإمام أبی حنیفۃ وغیرہ

استاذ حارثی کی موضوع روایات

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے باسناد امام دیلمی رحمہ اللہ استاذ حارثی کے واسطے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بایں الفاظ ذکر کی ہے:

كان رسول الله ﷺ إذا استاك قال: «اللهم اجعل سواكي رضاك عني واجعله طهوراً....الخ

اس کے بعد کہا ہے:

فيه عبد الله بن محمد بن يعقوب البخاري قال في الميزان: متهم بوضع الحديث، وقال في المغني: يأتي بعجائب واهية، وقال الخليلي: حدثونا عنه بعجائب. ①

''اس میں عبداللہ بن محمد بن یعقوب البخاری ہے، ذہبی رحمہ اللہ نے ''میزان'' میں کہا ہے: وہ وضعِ حدیث سے متہم ہے۔ اور ''المغنی'' میں کہا ہے: وہ واہی عجائبات بیان کرتا ہے، اور حافظ خلیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ہمیں اس کے واسطے سے عجائبات بیان کی گئی ہیں۔''

یہی روایت علامہ محمد طاہر پٹنی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الموضوعات ② میں ذکر کی ہے اور فرمایا ہے: «فيه متهم بالوضع» ''اس میں راوی وضعِ حدیث سے متہم ہے۔'' تذکرہ کے حوالے سے یہی روایت الفوائد المجموعۃ ③ میں بھی ذکر کی ہے اور کہا ہے:

قال في التذكرة: فيه متهم بالوضع

''التذکرہ میں ہے کہ اس میں راوی متہم بالوضع ہے۔''

علامہ ابن عراق رحمہ اللہ نے بھی تنزیہ الشریعہ ④ میں اسے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں

---

① ذيل اللآلئ المصنوعة: 99 ② تذكرة الموضوعات: 32 ③ الفوائد المجموعة: 11، رقم: 36 ④ تنزيه الشريعة: 74/2

عبداللہ بن محمد البخاری ہے۔

جس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ استاذ حارثی کی روایات کو موضوع کہا گیا ہے۔ اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے جو "السیر" میں کہا کہ اس کی تالیف کی ہوئی مسند میں ایسی روایات ہیں جو امام صاحب نے روایت نہیں کیں۔ اس سے بھی اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ علامہ عبدالرحمن المعلمی رحمہ اللہ نے الفوائد المجموعہ کے حاشیے میں فرمایا ہے:

فی سنده عبد الله بن محمد بن يعقوب البخاری الحارثی الملقب بالأستاذ، ترجمته فی لسان الميزان وهو مرمي بالوضع وقد وقفت له على أشياء أجزم بأنها من وضعه كوصية أبی حنيفة للسمتی، ومناظرة الأوزاعی مع أبی حنيفة وأشياء لاريب فی وضعها، ولكنه يسمی شيوخاً لا يعرفون ثم يصنع تلك البلايا، ويحدث بها عنهم، وقد كانت له معرفة وعلم، ونعوذبالله من علم لا ينفع.[1]

"اس کی سند میں عبداللہ بن محمد بن یعقوب البخاری الحارثی ہے جسے "الاستاذ" کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ لسان المیزان[2] میں ہے اور اس کی طرف وضع کی نسبت کی گئی ہے۔ میں اس کی کئی اشیاء پر مطلع ہوا ہوں جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اسی کی گھڑی اور بنائی ہوئی ہیں، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سمتی کے نام وصیت ہے اور امام اوزاعی رحمہ اللہ کا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مناظرہ ہے اور مزید دیگر روایات جن کے وضعی ہونے میں کوئی ریب نہیں۔ وہ ایسے شیوخ کا نام لیتا ہے جو مجہول ہیں، پھر وہ ایسی بلایا کو ان سے روایت کرتا ہے۔ بے شک وہ صاحب معرفت وعلم تھا اور ہم ایسے علم سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں جس سے کوئی نفع نہ ہو۔"

---

[1] حاشية الفوائد: 14 [2] لسان الميزان: 348/3

امام اوزاعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مابین مناظرے کی روداد پر تبصرہ تو آئندہ اپنے مقام پر آئے گا۔ رہا وصیت نامہ جو یوسف بن خالد سمتی کے نام ہے اس کی دلچسپ تفصیل شائقین المناقب للموفق میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ جس کے آخر میں یہ جھوٹ بھی گھڑا گیا ہے کہ بصرہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب غالب آگیا اور امام حسن بصری اور ابن سیرین کا مذہب ساقط ہوگیا۔[1]

امام دیلمی رحمہ اللہ ہی نے ایک اور روایت استاذ عبداللہ حارثی کی سند سے ذکر کی ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

الحاج في ضمان الله مقبلاً ومدبراً، فإن أصابه في سفره تعب أو نصب غفر الله له بذلك سيئاته، وكان له بكل قدم يرفعه ألف درجة وبكل قطرة تصيبه من مطر أجر شهيد.

علامہ البانی رحمہ اللہ یہی روایت ذکر کر کے فرماتے ہیں:

هذا موضوع، آفته عبد الله بن محمد بن يعقوب وهو الحارثي، قال أبو سعيد الرواس: يتهم بوضع الحديث، وهو الذي جمع مسنداً لأبي حنيفة رحمه الله تعالى...والحديث لوائح الوضع ظاهرة عليه.[2]

''یہ موضوع ہے۔ اس کی آفت عبداللہ بن محمد بن یعقوب حارثی ہے۔ ابوسعید رواس نے کہا ہے: وہ وضع حدیث سے متہم ہے۔ اسی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مسند جمع کی ہے.... اور حدیث پر وضع کے آثار ظاہر ہیں۔''

پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ امام ابوزرعہ احمد بن حسین رازی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ حارثی کو ضعیف کہا ہے۔ مزید عرض ہے کہ انھوں نے اسی کی سند سے مرفوعاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی

[1] المناقب للموفق: 2/109-101 [2] الضعيفة: 3500

یہ حدیث بھی روایت کی ہے:

طالب العلم بين الجهال كالحي بين الأموات.

حالانکہ یہ روایت مرسل ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کے ارسال کے ساتھ ساتھ ضعف کا اشارہ کیا ہے۔[1] مگر حارثی نے اسے مجہول سند کے ساتھ متصل بنا دیا، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سؤالات السهمي[2]۔ ظاہر ہے کہ اسے متصل بنانے کی کارستانی بھی اسی حارثی کی ہے۔

اس سے بھی ہمارے سابقہ موقف کی تائید ہوتی ہے کہ استاذ حارثی وضعِ حدیث سے متہم ہے اور اس کی روایات کو موضوع، باطل اور منکر قرار دیا گیا ہے۔

ایک حدیث اور استاذ حارثی کا تبصرہ

مسند الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ میں مذکورہ احادیث اور ان کی تخریج کے حوالے سے قبل یہ دیکھیے کہ بعض روایات پر خود استاذ حارثی نے تبصرہ فرمایا ہے۔ ان کے الفاظ اور مفہوم و معانی کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ کیسی ہے؟ اور ان کا اسلوبِ بیان کیا ہے؟ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بواسطہ خالد بن علقمہ عن عبد بن خیر، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے وضو کا طریقہ بیان کیا جس میں سر کا مسح تین بار کرنا ذکر کیا ہے۔ اس روایت کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثقات حفاظ کی ایک جماعت نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مخالفت کی ہے اور وہ خالد بن علقمہ سے ایک بار سر کے مسح کا ذکر کرتے ہیں۔[3]

یہ روایت استاذ حارثی نے متعدد طرق سے یوں ہی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، چنانچہ مکی بن ابراہیم، حکم بن عبد اللہ، معافی بن عمران، سعید بن مسلمۃ، عبد اللہ بن ولید العدنی، ابراہیم بن مختار، قاسم بن حکم، اسحاق بن یوسف، عبد الحمید الحمانی، ابو یوسف، حسن بن

---

[1] فيض القدير: 264/4 [2] سوالات السهمي، رقم: 318 [3] السنن للدارقطني: 88,89/1، العلل: 51/4، بيهقي: 63/1، نصب الراية: 32/1

زیاد، حسن بن فرات، سعید بن ابی الجہم اور ایوب بن ہانی اس روایت میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تین بار سر کے مسح کا ذکر کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے تو ذکر کیا ہے کہ حماد بن ابی حنیفہ بھی اپنے والد سے یہی روایت «توضأ ثلاثاً ثلاثاً» کے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں۔ (1)

استاذ حارثی فرماتے ہیں کہ تین بار مسح کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے ہاتھ سر کے اوپر کے حصے پر رکھے، پھر سر کے آخر تک لے گئے، پھر انھیں سر کے ابتدائی حصے کی طرف لے آئے۔ یوں یہ تین بار مسح ہوا مگر حقیقتاً یہ ایک ہی بار مسح ہے۔ اس کی تائید جارود بن یزید، خارجہ بن مصعب اور اسد بن عمرو کی روایت سے ہوتی ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ایک ہی بار مسح کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

أنه وضع يده على يافوخه، ثم مد يده إلى مؤخر رأسه، ثم إلى مقدم رأسه فجعل ذلك ثلاث مرات، وهو في الحقيقة مرة. (2)

''انھوں نے اپنا ہاتھ سر کے اوپر کے حصے پر رکھا، پھر اپنے ہاتھ کو سر کے آخر تک لے گئے، پھر سر کے ابتدائی حصے کی طرف لے گئے تو یوں یہ تین بار ہوا مگر حقیقتاً ایک ہی بار ہے۔''

اسی ضمن میں مزید انھوں نے فرمایا ہے کہ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جارود بن یزید، خارجہ بن مصعب اور اسد بن عمرو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس روایت میں ایک بار مسح کا ذکر کرتے ہیں۔

ہم یہاں اس توجیہ کے حوالے سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے جو انھوں نے اس روایت کے بارے میں فرمائی ہے۔ صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ ایک طرف تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تین بار مسح کا لفظ ذکر کرنے والے چودہ حضرات ہیں جن کی روایات استاذ

---

(1) مسند الحارثی، رقم: 1296،1301،1206،1313 (2) مسند الحارثی: 767/2

حارثی نے ذکر کی ہیں۔ انھی میں سے ایک قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی روایت ہے جو ان کی "کتاب الآثار"[1] میں دیکھی جا سکتی ہے۔ امام ابو نعیم رحمہ اللہ نے مسند الامام ابی حنیفہ[2] میں اسے ان کے تلمیذ امام زفر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اس میں بھی تین بار مسح کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حسن بن فرات، المقری، خارجہ بن مصعب، حماد بن ابی حنیفہ، حسن بن زیاد اور اسحاق بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ ان حضرات کے مقابلے میں استاذ حارثی کا فرمان ہے کہ جارود، خارجہ اور اسد بن عمرو امام صاحب سے ایک بار مسح کا ذکر کرتے ہیں۔

انصاف شرط ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ثقہ شاگردوں کے مقابلے میں ان تینوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ استاذ حارثی اگر نقدِ روایت کے اصول کو پیشِ نظر رکھتے یا ایک حافظ اور محدث کی شان کے مطابق اصولِ نقد کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے تو شاید اس تقابل کا تکلف نہ کرتے۔

جارود بن یزید

اس کی کنیت ابو علی ہے، اور بعض نے ابو ضحاک بھی ذکر کی ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ اور دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے "متروک" کہا ہے اور امام نسائی رحمہ اللہ نے اسے «ليس بثقة» کہا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے «غير ثقة» امام یحییٰ رحمہ اللہ نے «ليس بشيء» امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے "کذاب" اور ابو اسامہ نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔ امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے «متروك الحديث، يكذب ويضع الحديث» کہا ہے۔ حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس نے امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے موضوع احادیث روایت کی ہیں۔ کوئی ادنیٰ کلمہ بھی اس کی توثیق و توصیف میں منقول نہیں۔[3]

علامہ حلبی نے الکشف الحثیث[4] میں ذکر کر کے اس کے "وضاع" ہونے کی

---

[1] كتاب الآثار، رقم: 4 [2] مسند الإمام أبوحنيفة: 273,274 [3] ميزان: 384/1، لسان: 90,91/2، الكامل: 295/2، الضعفاء للعقيلي: 202/1 وغيره [4] الكشف الحثيث: 120,121

طرف اشارہ کیا ہے۔حتی کہ علامہ خوارزمی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اسے "منکر الحدیث" اور ابو اسامہ اسے جھوٹا کہتے تھے۔ (1)

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ننگ و عار ہے

ایسے راوی کی روایت ثقات کی ایک جماعت کے مقابلے میں پیش کرنا کسی "فقیہ" کا شغل تو ہو سکتا ہے کسی محدث کا ہرگز نہیں۔

خارجہ بن مصعب

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لا یکتب حدیثه» "اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔" عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے میرے باپ نے منع فرمایا کہ میں اس سے کچھ لکھوں۔ ابن نمیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لیس بثقة، لیس بشیء» نیز انھوں نے "کذاب" بھی کہا ہے۔ ابن معین رحمہ اللہ اور ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لیس بشیء»، ابو معمر الہذلی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہل الرائے مسائل ابی حنیفہ کے لیے اسانید بنا کر خارجہ کی کتابوں میں رکھ دیتے تھے اور وہ انھیں روایت کرتا تھا۔ امام ابن مبارک رحمہ اللہ اور وکیع رحمہ اللہ نے اسے ترک کر دیا تھا۔ امام نسائی رحمہ اللہ، ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ نے متروك، لیس بثقة کہا ہے۔ ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ «مضطرب الحدیث، لیس بقوی» ہے۔ اس کی حدیث لکھی جائے مگر استدلال کے قابل نہیں، وہ جھوٹا نہیں تھا۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ وہ غلطی کرتا تھا قصداً جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ امام یعقوب بن شیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ہمارے تمام اصحاب کے نزدیک ضعیف ہے۔ وہ مدلس بھی تھا، حتی کہ غیاث بن ابراہیم وغیرہ جیسے متروک، کذاب اور وضاع سے تدلیس کرتا تھا۔ ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی بنا پر اس کی حدیث میں موضوع روایات پائی جاتی ہیں۔ ابن جارود، عقیلی، ابن السکن، ابو زرعہ دمشقی، ابو العرب الصقلی وغیرہ رحمہم اللہ نے اسے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ (2)

---

(1) جامع المسانید: 420/2 (2) تہذیب: 3/78-76 وغیرہ

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

متروك وكان يدلس عن الكذابين، ويقال إن ابن معين كذبه. [1]

خارجہ یہ روایت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے معنعن روایت کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی روایت قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے؟ بالخصوص جبکہ خارجہ سے تین بار مسح کی روایت بھی ہے، جیسا کہ امام ابونعیم نے مسند ابی حنیفہ میں کہا ہے۔

اسد بن عمرو البجلی

اولاً: عرض ہے کہ اسد بن عمرو نے خارجہ اور جارود کی طرح «مسح برأسه مرة واحدة» کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ ان کے الفاظ ہیں:

ثم أخذماء فی کفه فصبه فی صلعته فتحدر عنه.

''پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلی میں پانی لیا تو اسے اپنے سر کے اس حصے پر جہاں بال نہیں تھے، ڈالا تو وہاں سے نیچے بہہ گیا۔''

یہ مسح کی معروف کیفیت نہیں بلکہ ایک اور صورت ہے، اس لیے اسے خارجہ اور جارود کی روایت کی تائید میں پیش کرنا ہی درست نہیں۔

ثانیاً: اسد بن عمرو متکلم فیہ راوی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے «صدوق، صالح الحدیث» امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عمار رحمۃ اللہ علیہ نے «لا بأس به» جبکہ امام یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے «صدوق» بھی کہا ہے۔ ابن سعد نے ''ثقہ''، ابن عدی نے کہا: «لا بأس به»، نیز فرمایا ہے کہ میں نے اس کی احادیث میں کوئی منکر حدیث نہیں دیکھی، وہ ''مستقیم الحدیث'' ہے۔ امام ابوداود نے «لیس به بأس» کہا ہے۔

اس کے برعکس امام یحییٰ بن معین ہی کا ایک قول احمد بن سعد بن ابی مریم کی روایت میں

---

[1] تقریب: 87

یہ بھی ہے کہ وہ «لیس بشيء» اور جھوٹا ہے۔ یزید بن ہارون فرماتے ہیں: اس سے روایت لینا حلال نہیں۔ امام علی بن مدینی رحمہ اللہ اور بخاری رحمہ اللہ نے ''ضعیف'' کہا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے: مذہب ابی حنیفہ کے موافق احادیث گھڑتا تھا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے «لیس بثقة» اور «لیس بالقوی» کہا ہے۔ محدث ساجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «عندہ مناکیر» یعنی اس کے پاس منکر روایات ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہ نے کہا ہے: «ھو والریح عندھم سواء.» یعنی محدثین کے ہاں ہوا اور وہ برابر ہے۔ ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ''ضعیف ہے، مجھے اس کی حدیث پسند نہیں۔'' حافظ جوز جانی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اللہ نے اس سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ابن شاہین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حافظ ابن عمار کا قول کہ اسد بن عمرو «لا بأس بہ» ہے، ان کا یہ تزکیہ امام یزید بن ہارون رحمہ اللہ اور امام عثمان رحمہ اللہ کے قول کے مقابلے میں حجت نہیں کیونکہ یزید واسطی، یعنی اس کے ہم وطن ہیں، اور عثمان کوفی ہیں جبکہ ابن عمار موصلی ہے، لہٰذا یہ دونوں اسد بن عمرو کو ابن عمار سے زیادہ جانتے ہیں۔ ابن عمار سے یہ قول بھی منقول ہے کہ اسد «ضعیف الحدیث» ہے۔ ان دونوں اقوال میں تطبیق یوں ہے کہ «لا بأس بہ» سے ان کی مراد ہے کہ وہ قصداً جھوٹ نہیں بولتا۔ جب نظر کمزور ہوئی تو تغیر لاحق ہو گیا اور حافظہ ضعیف ہو گیا۔ [1]

حافظ ابن شاہین نے حافظ ابن عمار کے قول پر امام یزید بن ہارون رحمہ اللہ اور امام عثمان رحمہ اللہ کی جرح کو جو مقدم سمجھا ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ بغدادی ہیں اور اسد بن عمرو بغداد کا قاضی تھا، اس لیے امام احمد رحمہ اللہ اسے خوب جانتے تھے اور وہ اسے ''صدوق، صالح الحدیث'' کہتے ہیں اور اس سے انھوں نے روایت بھی لی ہے۔ صرف امام احمد نے ہی نہیں بلکہ بعض دیگر محدثین نے بھی اسے «صدوق، لا بأس بہ» کہا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ ''ضعیف'' ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کی حدیث

---

[1] میزان: 206/1، لسان: 383/1، الکامل: 389/1، تعجیل المنفعة: 295/1، المجروحین: 180/1، الجرح والتعدیل: 337/2 وغیرہ

قابلِ اعتبار ہے، جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے: «یعتبر به» تو اس کی روایت قابلِ استدلال قطعاً نہیں۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ کا فرمانا کہ اس کی روایات میں مَیں نے کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ یہ ان کی حد تک درست ہے جبکہ امام ساجی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: «عنده مناكير» یعنی اس کے پاس منکر روایات ہیں۔ امام عقیلی رحمہ اللہ اس کی اسی نوعیت کی منکر حدیث ذکر کر کے لکھتے ہیں:

هكذا حدث أسد بهذا الحديث..وقد رواه هشيم بن بشير، وخالد بن عبد الله عن حصين، ولم يذكروا هذا التفسير كله، وهؤلاء القوم يتهاونون بالحديث ولا يقومون به، ويصلونه بما ليس منه فيفسدون الرواية. (1)

''یہ حدیث اسد بن عمرو نے اسی طرح بیان کی ہے... جب کہ ہشیم بن بشیر اور خالد ابن عبداللہ یہ حدیث حصین سے روایت کرتے ہیں اور یہ تمام تفسیر ذکر نہیں کرتے۔ یہ لوگ حدیث میں تساہل برتتے ہیں، صحیح طور پر بیان نہیں کرتے، ایسی چیز اس میں شامل کر دیتے ہیں جو اس میں سے نہیں ہوتی، یوں وہ روایت کو فاسد کر دیتے ہیں۔''

اتنی واضح اور صاف بات کے بعد اس کی روایات میں نکارت کا انکار کیونکر درست ہے؟

اس کی اسی روایت کو لیجیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے سبھی روایت کرنے والے سر کے مسح کا ذکر کرتے ہیں مگر اسد بن عمرو چلو پانی لے کر سر پر ڈالنے کا ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ ہم پہلے ذکر آئے ہیں، اس لیے

اولاً: اسد کی روایت معناً خارجہ اور جارود کی روایت کے موافق نہیں۔

(1) الضعفاء الكبير: 24/1

ثانیاً: اسد بن عمرو اس قابل نہیں کہ اس کی روایت قابلِ استدلال ہو، لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس حدیث میں ایک بارِ مسحِ راس کی کوئی روایت صحیح یا حسن نہیں بلکہ ان سے تین بار مسح کی روایت ہی منقول ہے اور اسے روایت کرنے میں وہ متفرد ہیں جبکہ ثقات کی جماعت اس میں ایک بار مسح کا ہی ذکر کرتی ہے۔

استاذ حارثی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایت میں تین بار مسح کی تائید میں یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ کی احادیث میں بھی تین بار مسح کا ذکر ہوا ہے اور ان کا بھی وہی مفہوم ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔[1]

بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی بعض روایات میں تین بار سر کے مسح کا ذکر آیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات میں بھی۔ حیرت کی بات ہے کہ احناف کے نزدیک سر کا مسح ایک بار ہے جبکہ شوافع تین بار کو مستحب کہتے ہیں۔ علمائے احناف تین بار مسح کی احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، چنانچہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

والذي يروى فيه من التثليث محمول عليه بماء واحد.

''تین بار مسح کی روایات اس پر محمول ہیں کہ ایک ہی بار پانی سے مسح ہو۔''

علامہ ابن ہمام «والذي يروى» کے الفاظ کی شرح میں لکھتے ہیں: «بالتمريض يشعر بضعفه»[2]

یعنی صاحبِ ہدایہ نے صیغۂ تمریض سے ان روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں:

أجاب أصحابنا عن هذه الأخبار بضعف هذه الأخبار.[3]

''ہمارے اصحاب نے ان احادیث کا جواب اس طرح دیا ہے کہ یہ احادیث

---

(1) مسند الحارثي: 767/2 (2) فتح القدير: 22/1 (3) السعاية: 133/1

ضعیف ہیں۔"

علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات کے بارے میں امام ابوداود رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صحیح احادیث میں ایک ہی بار مسح کا ذکر ہے۔[1] نیز امام بیہقی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو «توضأ ثلاثا ثلاثا» کے الفاظ ہیں، ان سے امام شافعی رحمہ اللہ نے تکرارِ مسح پر استدلال کیا ہے۔ یہ روایات مطلق ہیں جبکہ مفسر روایات میں ثابت ہے کہ تکرار، مسحِ راس کے علاوہ باقی اعضاء میں ہے۔ اور غریب اسناد سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تکرارِ مسح کا ذکر ہے، مگر وہ حفاظ کی روایات کے خلاف ہونے کے علاوہ اس درجے کی نہیں کہ ان سے استدلال کیا جائے اگرچہ ہمارے بعض اصحاب نے ان سے استدلال کیا ہے۔[2] اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات پر نقد کی تفصیل آپ البنایہ میں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔[3]

سر کے ایک بار مسح کے بارے میں علامہ حلبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لما روى أصحاب السنن الأربعة عن علي رضي الله عنه في حكاية وضوئه عليه الصلاة والسلام أنه مسح مرة واحدة، وأحاديث عثمان الصحاح تدل على ذلك...الخ[4]

"ایک بار مسح اس لیے کہ اصحابِ سنن اربعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مسح کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صحیح احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔"

علامہ حلبی رحمہ اللہ کا یہ بیان بھی علامہ ابن ہمام وغیرہ کا مؤید ہے کہ احناف کے نزدیک اعتبار صرف ایک بار سر کا مسح کرنے کی احادیث کا ہے اور جن روایات میں تین بار مسح کا ذکر ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا وہ ایک ہی پانی سے ایک ہی بار پورے سر کا مسح کرنے پر محمول ہیں۔

---

[1] نصب الراية: 31,32/1 [2] نصب الراية: 34/1 [3] البناية: 242/1 [4] غنية المتملي: 23

استاذ حارثی کا بھی یہی خیال ہے، جیسا کہ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے ایک بار مسح کے لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ علامہ زیلعی نے فرمایا: کہ یہ غریب ہے اور مجھے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک بار مسح کی حدیث نہیں ملی بلکہ اس کی تضعیف اس سے ہوتی ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ [1] میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

كان يمسح على الرأس ثلاثاً، يأخذ لكل مسحة ماء جديداً. [2]

”وہ سر کا مسح تین بار کرتے، ہر مسح کے لیے نیا پانی لیتے۔“

اس لیے تین بار مسح کی روایات کی تاویل میں ایک ہی پانی سے تین بار مسح مراد لینا محل نظر ہے۔

ہمارا مقصود یہاں سر کے مسح کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ عموماً علمائے احناف تین بار مسح کی روایت کی تضعیف وتاویل کرتے ہیں جبکہ استاذ حارثی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت میں تین بار مسح کے الفاظ کو درست سمجھتے ہیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تین بار مسح والی احادیث کو اس کا مؤید بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

فمن جعل أبا حنيفة غالطاً في روايته المسح ثلاثا فهو واهم وكان هو بالغلط أولى وأحق. [3]

”لہٰذا جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو تین بار مسح کی روایت میں قصوروار ٹھہراتا ہے وہ خود وہم میں مبتلا ہے اور وہی بالاولیٰ غلطی پر ہے اور غلطی پر ہونے کا زیادہ مستحق ہے۔“

حالانکہ استاذ حارثی نے جن کذاب اور وضاع راویوں کی روایات کی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 16/1 [2] نصب الرايه: 30/1 [3] مسند: 767,768/2

کی روایت میں ایک بار مسح کا ذکر کیا اور تین بار مسح کی جو تاویل کی ہے اس کی پوزیشن آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ حدیث دانی صرف روایات بیان کرنے کا نام نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک درجن سے زائد تلامذہ کی روایات کے مقابلے میں جارود بن یزید وغیرہ جیسے راویوں پر اعتماد حدیث کی کون سی خدمت ہے؟ اسی طرح خالد بن علقمہ کے تلامذہ زائدۃ بن قدامہ، سفیان ثوری، شعبہ، ابوعوانہ، شریک، ابوالاشہب، جعفر بن حارث، ہارون بن سعد، جعفر بن محمد، حجاج بن ارطاۃ، ابان بن تغلب، علی بن صالح، حازم بن ابراہیم، حسن بن صالح اور جعفر الاحمر کے مقابلے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایت میں وہم کا انکار محض مجادلہ اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

استاذ حارثی کی یہاں رگِ حمیت کا اندازہ کیجیے کہ اسی روایت میں امام شعبہ رحمہ اللہ سے ''خالد بن علقمہ'' کی جگہ ''مالک بن عرفطہ'' کا نام آیا ہے۔ امام بخاری، امام احمد، ابوحاتم اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یہ امام شعبہ رحمہ اللہ کا وہم ہے، صحیح خالد بن علقمہ ہے۔ استاذ حارثی اسی تناظر میں آپے سے باہر ہوگئے ہیں اور فرماتے ہیں:

ولو كان هذا الغلط من أبي حنيفة لنسبوه إلى الجهالة وقلة المعرفة ولأخرجوه مثلًا من الدين وهذا من قلة الورع واتباع الهوى. ①

''اگر یہ غلطی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ہوتی تو وہ ان کی طرف جہالت اور قلتِ معرفت کی نسبت کرتے اور انھیں دین سے نکال دیتے اور یہ قلتِ ورع اور خواہش پرستی کا نتیجہ ہے۔''

حالانکہ محدثین نے تو تین بار مسح کے ذکر کو بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا وہم ہی کہا ہے اور انھیں نہ جاہل کہا، نہ دین سے نکالا۔ دراصل استاذ حارثی کا یہ تبصرہ «كل إناء يترشح

---

① مسند: 768,769/2

بما فیہ» کا مصداق ہے۔ امام شعبہ رحمہ اللہ سے خطا ہوئی تو اسے محدثین نے چھپایا نہیں، حتی کہ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے ہی فرمایا ہے:

شعبة یخطیء فی أسماء الرجال کثیراً لتشاغله بحفظ المتون.[1]

''حفظ متون میں زیادہ متوجہ ہونے کی وجہ سے امام شعبہ رحمہ اللہ راویوں کے ناموں میں بہ کثرت خطا کرتے ہیں۔''

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا شغل بھی زیادہ فقہ اور قیاس سے تھا۔ ان سے اگر غلطی ہوئی ہے اس میں کوئی اجنبی بات نہیں اور نہ ہی اس پر سیخ پا ہونے کی ضرورت ہے۔

ایں گلِ دیگر شگفت

یہاں یہ بات بھی دیکھیے کہ اس مسند کے محقق علامہ قاسمی صاحب نے بلا تحقیق و تنقیح ان روایات کو جن میں تین بار سر کے مسح کا ذکر ہوا ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت کی تائید میں ذکر کیا، پھر حافظ ابن الجوزی کی ''کشف المشکل'' سے یہ بھی نقل کر دیا کہ تین بار مسح کی روایات اولیٰ ہیں اور ایک بار مسح کی روایات اگر ثابت ہوں تو بیانِ جواز کے لیے ہیں۔[2]

اسے کہتے ہیں

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت، جس میں تین بار مسح کا ذکر آیا ہے، کی تائید میں اس حد تک پیش قدمی کسی اور حنفی عالم کی قسمت میں کہاں کہ تین بار مسح کی روایات کو راجح، امام احمد رحمہ اللہ کے ایک قول اور امام شافعی رحمہ اللہ کے موقف (کہ تین بار مسح مسنون ہے) کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ تین بار مسح نئے پانی سے کرنے کے قائل ہیں اور علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ سے اسی کا راجح ہونا نقل کیا جا رہا ہے تو اس کے بعد استاذ حارثی

---

[1] تہذیب: 4/346 [2] ملخصاً: 2/761

کی توجیہ وتوفیق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ علامہ قاسمی صاحب نے یہ اسلوبِ تحقیق وتائید اختیار کر کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کا تحفظ تو کر لیا مگر ان کے مسلک کی کوئی فکر نہ کی اور نہ ہی استاذ حارثی کی توجیہ سے متفق ہوئے۔

علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اور حدیث ابی حنیفہ

یہی روایت اور یہی بحث مسند حصکفی میں بھی ہے جس کی شرح علامہ علی قاری نے بھی کی ہے۔ اس کا وہ نسخہ جو ''دارالکتب العلمیۃ، بیروت'' سے طبع ہوا ہے ہمارے پیشِ نظر ہے۔

استاذ حارثی نے امام ابوحنیفہ سے ایک بار مسح روایت کرنے والے جارود بن یزید اور خارجہ بن مصعب کے بارے میں جو کچھ فرمایا اور بعد میں مسند کی عبارت کی توضیح میں جو کچھ علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، اس سے ان پر ہمارے اعتماد کو بڑی ٹھیس پہنچی، چنانچہ جارود بن یزید کے بارے میں انھوں نے فرمایا:

أي العبدي قدم على النبي ﷺ سنة تسع وأسلم مع وفد عبدالقيس، ثم أنه سكن البصرة ...الخ [1]

''جارود بن یزید، العبدی ہیں۔ سن نو ہجری میں وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وفد عبد قیس کے ساتھ اسلام لائے، پھر انھوں نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی۔''

اسی طرح خارجہ بن مصعب کے بارے میں لکھتے ہیں:

أي ابن الزبير وهو أحد الفقهاء السبعة من أهل المدينة. [2]

''خارجہ بن مصعب، یہ مصعب حضرت زبیر کے بیٹے ہیں اور خارجہ اہلِ مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ایک ہیں۔''

[1] شرح المسند: 446 [2] شرح المسند: 446

جارود اور خارجہ کے ساتھ استاذ حارثی نے اسد بن عمرو کا نام بھی لیا مگر اس نام کا کوئی صحابی نظر نہیں آیا تو علامہ قاری مرحوم نے اس سے سکوت فرمایا۔ یاد رہے کہ علامہ مرحوم کے نسخے میں اسد بن عمر ہے مگر صحیح اسد بن عمرو ہے۔ اُن کی اِن توضیحات پر ہم انا للہ وانا الیہ راجعون ہی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ حارثی کی بات کو سمجھا ہوتا تو الجارود بن یزید کو صحابی اور خارجہ بن مصعب کو تابعی بنانے کا تکلف نہ فرماتے۔ یہی ایک مقام ایسا نہیں بلکہ اس بحث میں دیگر مقامات پر بھی ایسے بہت سے تسامحات ہیں۔ مگر ہمارا مقصود علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح پر تبصرہ نہیں بلکہ استاذ حارثی کی کاوش سے آگاہی ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے ہی تسامحات کے تناظر میں فرمایا ہے:

وإني أتعجب من العلامة القاري كيف يخطئ خطأ كثيراً في تعيين الرواة في شرحه للموطأ وشرحه لمسند الإمام الأعظم وغيرهما مع جلالته...الخ [1]

"مجھے علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب ہے کہ ان سے ان کی جلالت شان کے باوجود شرح موطا اور شرح مسند امام اعظم وغیرہ کے راویوں کی تعیین میں بہت زیادہ خطائیں کیونکر ہوئی ہیں؟"

شائقین علامہ علی قاری کے مزید تسامحات کے سلسلہ میں التعلیق الممجد کے حسب ذیل صفحات [2] بھی ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ بن حارث یا یزید بن حارث

استاذ حارثی نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک درجن سے زائد تلامذہ کی روایت کے برعکس جارود جیسے راویوں کی بنیاد پر مسحِ راس کے بارے میں جو موقف اپنایا ہے اس کی تفصیل

[1] التعليق الممجد: 90 [2] التعليق الممجد: 84,217,297,336,384

قارئینِ کرام کے علم میں آ گئی ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ یحییٰ بن نصر بن حاجب، محمد بن حسن شیبانی، حمزۃ بن حبیب الزیات، حسن بن فرات، قاضی ابو یوسف، اسد بن عمرو، ابوعبدالرحمٰن المقرئ، ایوب بن ہانئ، حسن، سعید بن ابی الجہم، سابق البربری، یونس ابن بکیر، محمد بن مسروق ان تمام نے امام صاحب سے بواسطہ ''زیاد بن علاقہ عن یزید بن حارث'' حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ استاذ حارثی نے ان کی روایات مسند [1] میں بیان کی ہیں۔ بلکہ امام محمد بن حسن کی روایت ان کی ''الآثار'' [2] میں، اسی طرح قاضی ابو یوسف کی بھی ''الآثار'' [3] میں ہے اور ان میں بھی عبداللہ بن حارث ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک درجن سے زیادہ تلامذہ کی روایت کے برعکس عبدالحمید ابو یحییٰ الحمانی امام صاحب سے عبداللہ بن حارث کی بجائے یزید بن حارث کا نام لیتے ہیں، جیسا کہ استاذ حارثی نے مسند [4] میں ذکر کیا ہے، حالانکہ امام ابونعیم نے مسند الامام ابی حنیفہ [5] میں حمانی سے عبداللہ بن حارث کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے علاوہ محمد بن حسن، شعیب بن اسحاق، امام ابوعبدالرحمٰن المقرئ، امام زفر، سابق وغیرہ کی روایت میں بھی عبداللہ بن حارث ہی ذکر کیا ہے بلکہ امام ابونعیم نے ایک اور حدیث [6] ''حمانی عن ابی حنیفہ'' کی سند سے ذکر کی ہے اور اس میں بھی عبداللہ بن حارث ہی ہے۔ استاذ حارثی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ [7]

یہی سابقہ اوّل الذکر روایت حافظ طلحہ بن محمد رحمہ اللہ نے بھی اپنی مسند میں بیان کی ہے جسے علامہ خوارزمی رحمہ اللہ نے جامع المسانید [8] میں ذکر کیا ہے۔ اور حافظ طلحہ رحمہ اللہ سے یہ بھی نقل کیا ہے:

---

① مسند: 1/336-332، 2/769 ② الآثار: 628 ③ الآثار: 907 ④ مسند: 332، رقم: 431

⑤ مسند الإمام أبي حنيفة، رقم: 142 ⑥ حديث، رقم: 143 ⑦ مسند، رقم: 444,445

⑧ جامع المسانيد: 1/159

المشهور في هذا الحديث رواية عن أبي حنيفة له عن زياد ابن علاقة عن عبد الله بن الحارث...الخ

''اس حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایت میں ''زیاد بن علاقہ عن عبداللہ بن الحارث'' مشہور ہے۔''

مگر استاذ حارثی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یزید بن حارث ہے کیونکہ عبدالحمید حمانی امام صاحب سے اور محمد بن زیاد بن علاقہ اپنے باپ سے یوں ہی روایت کرتے ہیں، حالانکہ عبدالحمید حمانی کی روایت اس بارے میں مختلف ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ رہی محمد ابن زیاد کی روایت تو اوّلاً: اس کی سند کی صحت مطلوب ہے۔ ثبت العرش ثم انقش

مگر اس کے باوجود استاذ حارثی فرماتے ہیں:

وتبين بذلك رجحان أبي حنيفة على غيره من المحدثين في الحفظ والإتقان.[1]

''اس سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حفظ واتقان کا رجحان دوسروں پر ظاہر ہوگیا۔''

یہ رجحان اس پر ہے کہ انھوں نے یزید بن حارث کہا۔ کس روایت کی بنیاد پر؟ محمد بن زیاد کی روایت کی بنیاد پر، جبکہ امام محمد، قاضی ابویوسف، امام زفر، امام ابوعبدالرحمن المقرئ وغیرہ ایک درجن سے زیادہ شاگرد امام صاحب سے ''عبداللہ بن حارث'' نقل کرتے ہیں۔ استاذ حارثی کے برعکس حافظ طلحہ اسی کو مشہور روایت کہتے ہیں۔ یہ مشہور روایت تو استاذ حارثی کے ہاں مرجوح قرار پائے، اور محمد بن زیاد کی روایت میں یزید بن حارث راجح شمار ہو! بلکہ امام صاحب کے حفظ واتقان کا یہ بین ثبوت بھی ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایک درجن سے زائد شاگردوں سے جو امام صاحب نے ''عبداللہ بن حارث'' کہا ہے تو یہ ان کے وہم وخطا پر بین دلیل کیوں نہیں؟ ہم عرض کر آئے ہیں کہ اسی روایت میں نہیں دو اور

[1] مسند: 338/1

روایات میں بھی امام صاحب عبداللہ بن حارث ہی کہتے ہیں۔ اس سے بھی حفظ واتقان کا رجحان ہوتا ہے یا ان کے وہم ونسیان کا؟ اس حوالے سے ہم یہاں مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ صرف یہ عرض کرنا تھا کہ امام صاحب کے ایک درجن تلامذہ کے مقابلے میں جو موقف استاذ الحارثی نے اختیار کیا ہے وہ ان کے اپنے تحفظات کا عکاس ہے اس کی بنیاد کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔

یزید بن حارث اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

یہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں راوی عبداللہ بن الحارث ہے یا یزید بن حارث، اس بحث کے علاوہ یہاں یہ بھی دیکھئے کہ استاذ الحارثی جس روایت کی بنا پر فرماتے ہیں کہ صحیح یزید بن حارث ہے اسی روایت میں ہے کہ محمد بن زیاد بن علاقہ نے اپنے باپ سے کہا:

إن أبا حنيفة روى عنك حديث الطاعون فقال له رجل: من يزيد بن الحارث؟ قال: لا أدري. فقال يا بني! يزيد بن الحارث رجل منافيمن شهد فتح القادسية وهذه داره وأومأ اليها.[1]

یہی روایت ابن خسرو نے بھی اپنی مسند الامام[2] میں ذکر کی ہے کہ ”محمد بن زیاد نے اپنے باپ زیاد بن علاقہ سے کہا کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ سے حدیث طاعون بیان کرتے ہیں۔ ان سے ایک شخص نے پوچھا یہ یزید بن حارث کون ہیں؟ تو انھوں نے کہا: میں نہیں جانتا۔ زیاد نے کہا بیٹا! یزید بن حارث ہم ہی میں سے ایک آدمی تھا جو فتح قادسیہ میں شامل تھا اور یہ اس کا گھر ہے، انھوں نے اس کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔“ جس سے کیا یہ بات مترشح نہیں ہوئی کہ امام صاحب ایسے راویوں سے بھی روایت لیتے ہیں جن کے بارے میں انھیں

[1] مسند الحارثي: 338/1 [2] مسند الامام: 432/1، رقم: 455

کچھ علم نہیں ہوتا۔ اسی سے اس خوبصورت تصور کی حقیقت بھی بکھر جاتی ہے کہ امام احمد اور امام ابوداود کی طرح وہ ضعیف راویوں سے روایت لے لیتے ہیں جب اس باب میں اور کوئی روایت نہیں ہوتی اور بے خبری میں کوئی روایت نہیں لیتے۔

ایک اور حدیث

استاذ حارثی نے بڑی کوشش سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے راوی کے نام میں اور روایت کے الفاظ میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اگر اس میں کوئی وزن ہوتا تو یہ سعی بڑی مبارک ہے مگر اس کی جو حیثیت ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھیے کہ مسند میں استاذ حارثی نے بواسطہ ''وکیع بن محمد عن ابیہ عن بشر بن حرب المروزی عن حفص بن عبدالرحمن عن ابی حنیفہ عن أبی الزبیر عن جابر'' ایک روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

صلی فی ثوب واحد متوشحاً به، فقال بعض القوم لأبی الزبیر: غیر المکتوبة؟ فقال: المکتوبة وغیر المکتوبة.[1]

علامہ قاسمی صاحب نے ذکر کیا ہے کہ مسند احمد[2]، عبد بن حمید[3]، مسلم[4]، ابن خزیمة[5]، ابوعوانہ[6]، شرح الآثار[7] اور بیہقی[8] میں کئی طرق سے یہی روایت ابوالزبیر عن جابر سے مروی ہے اور ان میں ابوزبیر کا قول نہیں ہے۔

عرض ہے کہ یہی روایت مسند امام احمد[9] اور مسند السراج[10] میں زہیر عن ابی الزبیر سے مروی ہے اور مسند احمد میں ابوالزبیر کا قول بھی موجود ہے۔ اور مسند السراج میں یہ قول حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی کا ہے۔ ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ خوارزمی رحمہ اللہ نے یہی

---

[1] مسند الحارثی: 152/1، رقم: 52 [2] مسند احمد: 293,294,300/3 [3] عبد بن حمید: 1051 [4] مسلم: 62/2 [5] ابن خزیمة: 762 [6] ابوعوانہ: 63/2 [7] شرح الآثار: 381/1 [8] بیہقی: 238/2 [9] مسند امام احمد: 386/3 [10] مسند السراج، رقم: 479

روایت جامع المسانید[1] میں پہلے استاذ حارثی سے نقل کی ہے، اس کے بعد انھوں نے حافظ طلحہ بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند سے بھی اسی سند کے حوالے سے اس روایت کا ہونا ذکر کیا ہے، پھر کہا ہے۔

لكن قال الحافظ: الصواب حفص بن عبد الرحمن عن أبي خيثمة زهير بن معاوية، إذ الحديث لزهير، لكن وقع كذلك في أصل وكيع.

''لیکن حافظ طلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صحیح «حفص بن عبدالرحمن عن أبي خيثمة زهير بن معاوية» ہے کیونکہ یہ حدیث زہیر کی ہے۔ مگر وکیع (بن محمد ابن رزمۃ نیشاپوری) کی اصل میں اسی طرح (یہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے) ہے'' ورنہ صحیح «عن الزهير عن أبي الزبير عن جابر» کی سند سے ہے۔''

گویا حافظ طلحہ اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے ہونا درست ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ صحیح ''حفص عن الزھیر عن ابی الزبیر'' قرار دیتے ہیں۔ اس سے خود استاذ حارثی کے بارے میں سمجھا جا سکتا ہے کہ روایات کے جانچنے اور پرکھنے میں ان کا اپنا مقام کیا ہے؟۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مرویات

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مرویات کے بارے میں کبار محدثین کی آرا کے برعکس یہ تأثر دیا گیا ہے کہ وہ کثیر الروایہ تھے، البتہ ان سے احادیث کی روایت کم ہے۔ یوں ان کی قلتِ روایت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے۔ اسی حوالے سے ایک روایت اسی مسند میں ہے جو قابلِ غور ہے، چنانچہ یحییٰ بن نصر بن حاجب کا بیان ہے:

دخلت على أبي حنيفة في بيت مملوء كتباً، فقلت: ما هذه؟

[1] جامع المسانيد: 350/1

قال: هذه أحاديث كلها وما حدثت به إلا اليسير الذي ينتفع به.[1]

''میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے گھر گیا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا، میں نے کہا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: یہ تمام احادیث ہیں مگر میں تھوڑی سی مفید احادیث ہی بیان کرتا ہوں۔''

اس قول کی صحت وضعف سے قطع نظر اس میں امام صاحب کا اعتراف ہے کہ میں نے تھوڑی سی مفید احادیث ہی روایت کی ہیں، اس لیے کسی اور توجیہ کی بجائے امام صاحب کی اس وضاحت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار میں مرفوع روایات تقریباً ۱۰۹ ہیں۔ علامہ طحاوی استاذ حارثی کے معاصر ہیں اور انہوں نے مسلک امام کی تائید میں شرح معانی الآثار لکھی ہے، ہمارے تتبع کے مطابق اس میں وہ امام صاحب سے صرف پانچ مرفوع روایات لاتے ہیں۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار!

مسند ابی حنیفہ اور موضوع احادیث

کہنے کو تو علامہ قاسمی صاحب نے مسند کی احادیث کی تخریج کرنے میں بڑی جانفشانی دکھائی اور روایات کو شواہد ومتابعات سے مقبول بنانے کے لیے بڑی بے جگری کا ثبوت دیا۔ مگر مجال ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تک پہنچنے والی سند کے بارے میں کوئی رائے دی ہو۔ اور ان کے راویوں کا ''ذکر خیر'' کیا ہو۔ جب امام صاحب تک پہنچنے والی سند کذاب، وضاع، متروک اور مجہول راویوں پر مشتمل ہو تو ان کے سہارے امام صاحب کی مرویات کا شمار قطار کس درجہ کا ہو سکتا ہے؟

امام یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں: حدیث کو نہ دیکھو اس کی سند دیکھو۔ اگر سند صحیح ہے تو فبہا، ورنہ جب تک سند صحیح نہ ہو کسی حدیث سے دھوکہ نہ کھاؤ۔[2]

مولانا ظفر احمد عثمانی نے علامہ خوارزمی رحمہ اللہ کی جامع المسانید[3] سے ایک حدیث «إنه كان صلى الله عليه وسلم يقبل نساءه في رمضان وما يجدد الوضوء» نقل کی ہے اور اس کے بارے میں فرمایا ہے:

---

[1] مسند، رقم: 1515 [2] الجامع للخطیب: 102/2 [3] جامع المسانید: 246/1

رجاله ثقات إلا أن سنده إلى أبي حنيفة فيه كلام.[1]

"اس کے راوی ثقہ ہیں مگر ابو حنیفہ رحمہ اللہ تک کی سند میں کلام ہے۔"

علامہ خوارزمی رحمہ اللہ نے یہ روایت استاذ حارثی کی اسی مسند سے نقل کی ہے۔ علامہ خوارزمی رحمہ اللہ کی منقول سند حسبِ ذیل ہے:

كتب إلي أبوسعيد البصري النجيرمي ثنا هانئ بن منصور الجرجاني ثنا الحسن بن زياد ثنا أبوحنيفة.[2]

مگر جامع المسانید میں سند مختلف ہے جو حسبِ ذیل ہے:

عن أبي سعيد البصري عن الحارث عن علي بن منصور الجرجاني عن الحسن بن زياد عن أبي حنيفة.[3]

اولاً: یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ استاذ حارثی نے مذکورہ بالا حدیث سے پہلے اسی سند سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور حدیث ذکر کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج إلى الفجر ورأسه يقطر من جماع غير احتلام ويظل صائما.[4]

یہی حدیث علامہ خوارزمی نے نقل کی ہے مگر اس کی سند یوں ہے:

عن أبي سعيد البصري البخاري عن علي بن منصور الجرجاني عن الحسن بن زياد عن أبي حنيفة.[5]

غور فرمائیے! سند دونوں کی استاذ حارثی کے ہاں ایک ہے مگر علامہ خوارزمی نے پہلی سند میں «عن الحارث عن علي بن منصور» کہا اور دوسری میں "الحارث" بھی نہیں۔ علامہ قاسمی صاحب کے پیشِ نظر جامع المسانید تھی۔ کاش وہ مسند کی تحقیق میں جامع المسانید میں موجود استاذ حارثی کی اسانید سے تقابل ہی کر لیتے! بلاشبہ جامع المسانید کی اسانید میں بڑی گڑ بڑ ہے اور اس کا کوئی صحیح نسخہ زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا مگر استاذ حارثی

[1] إعلاء السنن: 115/1 [2] مسند: 218/1 [3] جامع المسانيد: 246/1 [4] مسند 218/1، رقم: 185 [5] جامع المسانيد: 480/1

کی مسند جن نسخوں کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے ان میں سب سے قدیم نسخہ ۶۰۴ھ کا مکتوبہ ہے، دوسرا ۶۳۶ھ کا، تیسرا ۷۳۳ھ کا اور دیگر نسخے بھی اس کے بعد کے ہیں۔ علامہ خوارزمی ۶۶۵ھ میں فوت ہوئے۔ گویا مسند حارثی کے نسخے علامہ خوارزمی کے دور کے ہیں یا ان سے کچھ بعد کے دور کے، اس لیے بظاہر یہ فیصلہ مشکل ہے کہ استاذ حارثی کے مطبوعہ نسخے میں وارد شدہ اسانید کا اعتبار کیا جائے یا علامہ خوارزمی نے حارثی سے جو اسانید ذکر کی ہیں ان کا اعتبار کیا جائے۔

ثانیاً: مولانا عثمانی نے اس حدیث کی سند کے بارے میں عدمِ اعتماد کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لیے مسند میں امام صاحب سے پہلے کی اسانید جب قابلِ اعتماد نہ ہوں تو ان پر اعتماد کون سی خدمت ہے؟

اسی طرح علامہ ابن الوزیر الیمانی نے امام صاحب کی مرویات میں ضعف کے جواب میں ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ «ان یکون کثیرًا من الاحادیث المنسوبۃ إلی الامام ابی حنیفۃ ضعیفۃ من قبیل من روی عنہ...... الخ»[1] کہ بہت سی ضعیف احادیث جو امام صاحب کی طرف منسوب ہیں وہ ان سے روایت کرنے والوں میں ضعف کی وجہ سے ہیں لہٰذا جب امام صاحب سے پہلے کی اسانید قابل اعتبار راویوں سے مروی نہ ہوں تو انہیں امام صاحب کی مرویات میں شامل کرنا قرینِ انصاف نہیں۔

ثالثاً: افسوس ہے مولانا عثمانی نے اس سند کے بارے میں صرف یہ فرمایا کہ 'فیہ کلام' ''اس میں کلام ہے۔'' حالانکہ ہر کلام باعث قدح نہیں ہوتا۔ اختلاف سند سے قطع نظر سند کا پہلا راوی ابوسعید البصری النجیرمی ہے جس کا نام اباء بن جعفر ہے، بعض نے ابان ابن جعفر کہا ہے مگر صحیح اباء ہے۔

اباء بن جعفر

یہ استاذ حارثی کا استاد ہے۔ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ایک روز میں اس کی حالت معلوم کرنے کے لیے اس کے گھر گیا تو اس نے کچھ

---

[1] الروض الباسم: 165/1

اشیاء مجھے دکھلائیں جن کی اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تخریج کی تھی... میں نے دیکھا کہ اس نے تین سو سے زیادہ احادیث امام صاحب کے نام پر گھڑی ہیں جنہیں امام صاحب نے بالکل روایت نہیں کیا۔ اس کی روایات سے شغل رکھنا حلال نہیں۔ میں نے اسے کہا: اے ''شیخ'' اللہ سے ڈرو اور رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ مت باندھو... میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہمارے نوجوان اس کی بھی احادیث سے شغل رکھتے ہیں۔''①

حسن بن علی بن غلام الزہری کہتے ہیں:

''وہ احادیث گھڑتا تھا۔ وہ ایک نسخہ روایت کرتا جس میں اس نے ایک سو احادیث مجہول شیخ سے بیان کی تھیں اور خیال کرتا تھا کہ اس کا نام احمد بن سعید بن عمرو المطوعی ہے۔ اس میں مناکیر ہیں۔''②

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابومحمد حارثی نے مسند ابی حنیفہ میں اس سے بہ کثرت احادیث لی ہیں۔ علامہ عراقی نے ذیل المیزان③ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ''حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الضعفاء الصغیر'' کے ذیل میں کہا ہے کہ وہ کذاب ہے۔'' علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے المغنی④ اور دیوان الضعفاء⑤ میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح علامہ برہان الدین حلبی نے الکشف الحثیث میں ذکر کر کے اسے وضاعین میں شمار کیا ہے۔⑥

باقی سند سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے، تاہم اباء بن جعفر جیسے وضاع کی بنا پر اس روایت کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بڑی سادگی سے فرماتے ہیں کہ اس میں کلام ہے اور «وإنما ذكرته تأييداً» میں نے اسے تائیداً ذکر کیا ہے۔'' کیا وضاع اور کذاب کی روایت تائیداً قابلِ قبول ہے؟

مولانا عثمانی کی اس وضاحت سے کم از کم یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ مسند الامام ابی حنیفہ میں مروی روایات کی اسانید کو دیکھنا چاہیے کہ وہ امام صاحب تک قابلِ اعتبار سند سے پہنچ

---

① المجروحین: 185/1، میزان: 17/1 ② لسان: 27/1 ③ ذیل المیزان: 49 ④ المغنی: 6
⑤ دیوان الضعفاء: 8 ⑥ الکشف الحثیث: 35

پاتی ہیں یا نہیں۔ یہی بات علامہ ابن الوزیر نے فرمائی ہے جیسا کہ اوپر ہم ان کا کلام نقل کر آئے ہیں انہوں نے مزید فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ ہی نہیں امام جعفر صادق اور دیگر ثقات کی طرف بھی بہت سی روایات منسوب ہیں حافظ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ ابان بن جعفر نے تین سو احادیث امام ابوحنیفہ کے نام پر وضع کی ہیں (1) مگر افسوس ہے کہ علامہ قاسمی صاحب نے امام صاحب سے پہلے کی سند پر توچنداں توجہ نہیں دی۔ وہ عموماً ان روایات کے مؤیدات وشواہد پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ جو وضاع اور کذاب جھوٹا متن بناتا ہے اس سے صحیح متن کے لیے سند بنا لینا بعید کیوں کر ہے؟ اسی اباء بن جعفر نے ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ بنائی:

الوتر أول الليل مسخطة للشيطان وأكل السحور مرضاة للرحمن. (2)

یہ روایت امام ابن حبان رحمہ اللہ نے المجروحین (3) میں، علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے الموضوعات (4) میں، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اللآلی (5) میں، علامہ ابن عراق رحمہ اللہ نے تنزیہ الشریعۃ (6) میں ذکر کی ہے اور اسے موضوع قرار دیا ہے۔ (7)

علامہ خوارزمی نے جامع المسانید (8) میں ذکر کیا ہے، اباء بن جعفر کا مسند میں استاد ابوجعفر محمد بن اسماعیل بن سالم مولی بنی ہاشم ہے۔ مگر جامع المسانید میں ابوجعفر محمد بن اسماعیل عن سالم مولی بنی ہاشم ہے۔

علامہ قاسمی صاحب نے بھی علامہ ابن جوزی سے اس کا من گھڑت ہونا نقل کیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ کارروائی بھی دکھائی کہ اس کے شواہد حضرت علی، ابوہریرہ، رافع بن خدیج، جابر بن عبداللہ، انس اور ابوسعید رضی اللہ عنہم کی احادیث ہیں۔ مگر کیا اباء بن جعفر نے جس سند سے متن کے جو الفاظ ذکر کیے ہیں، ان شواہد سے اس کا موضوع نہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے؟

بلکہ استاذ حارثی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ''عبداللہ بن دینار عن ابن عمر'' سے مروی تمام روایات اسی اباء بن جعفر سے روایت کی ہیں، ملاحظہ ہوں (رقم: ۲۷۲ تا ۲۸۵) ان چودہ

---

(1) الروض الباسم (2) مسند الحارثی، رقم: 273 (3) المجروحین: 1/ 18، (4) الموضوعات: 101/2 (5) اللآلی: 23/2 (6) تنزیہ الشریعۃ: 80/2 (7) میزان: 17/1 لسان: 27/1 (8) جامع المسانید: 303/1

روایات میں روایت نمبر ۲۷۳ وہ روایت ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسی تناظر میں باقی روایات کا فیصلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

انھی روایات میں ایک روایت (۲۸۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی ہے جس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

رئیت النبی صلی اللہ وعلیه وسلم یمسح علی الخفین فی السفر ولم یوقت.

اب یہ روایت بھی اباء بن جعفر کی وجہ سے موضوع ہے۔ علامہ خوارزمی نے بھی اسے جامع المسانید [1] میں ذکر کیا ہے۔ علامہ قاسمی صاحب اس موضوع حدیث کا کوئی اور ماخذ تو ذکر نہ کر پائے، البتہ دارقطنی [2] بیہقی [3] اور عبدالرزاق [4] سے نقل کیا ہے کہ نافع عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً یہی بیان کرتے ہیں کہ خفین پر مسح کا کوئی وقت معین نہیں، مگر اس امر کی نقاب کشائی سے گریز کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بیان کرنے کی کارستانی کس کذاب کی ہے؟ یہ ہے اسلوبِ تخریج علامہ قاسمی کا!

اباء کی اسی 'ابوحنیفہ عن عبداللہ بن دینار عن ابن عمر' سند سے یہ روایت بھی دیکھیے:

إن الله جعل الشفاء فی أربعة: الحبة السوداء، والحجامة والعسل، وماء السماء. [5]

علامہ خوارزمی نے بھی اسے جامع المسانید [6] میں ذکر کیا ہے مگر اس اسلوبِ بیان میں اس روایت کا کوئی شاہد نہیں بلکہ ''ماء السماء'' کا ذکر بطور شافی کسی مرفوع روایت میں نہیں۔ علامہ قاسمی صاحب بھی اس بارے میں کوئی مرفوع شاہد ذکر کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ کارستانی بھی اسی اباء بن جعفر کی ہے۔

مسند الامام کی ابتدائی تین سو روایات میں ان چودہ روایات کے علاوہ احادیث نمبر ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۴۴، ۲۴۲، ۲۴۳ بھی اسی اباء بن جعفر سے منقول ہیں۔ یوں گویا تین سو روایات میں

---

(1) جامع المسانید: 280/1 (2) دارقطنی: 196/1 (3) بیہقی: 280/1 (4) عبد الرزاق: 804

(5) مسند الحارثی: 283 (6) جامع المسانید: 189/1

انیس روایات اباء بن جعفر کی ہیں، جو من گھڑت ہیں۔

علامہ کوثری اور اباء بن جعفر

یادش بخیر امام ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے تین سو روایات سے زیادہ مشاہیر سے روایات کی ہیں جو سب کی سب اسی طرح معلول ہیں۔ علامہ کوثری رحمہ اللہ نے امام ابن عدی رحمہ اللہ کے اس تبصرہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

انما تلك الاحاديث من رواية أباء بن جعفر النجيرمي، و كل ما في تلك الاحاديث من المواخذات كلها بالنظر الى هذا الراوي الذي هو من مشائخ ابن عدي و يحاول ابن عدي ان يلصق ما للنجيرمي إلى ابي حنيفة مباشرة و هذا هو الظلم والعدوان الخ.[1]

"یہ احادیث اباء بن جعفر النجیرمی کی روایت سے ہیں، اور ان احادیث میں جو مواخذات ہیں وہ تمام اس راوی کے تناظر میں ہیں جو ابن عدی کے شیوخ میں سے ہے اور ابن عدی کوشش کرتے ہیں کہ نجیرمی کا جرم براہ راست امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ذمہ لگا دیں اور یہی ظلم و زیادتی ہے۔"

غور فرمایا آپ نے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے جو فرمایا ہے کہ اباء بن جعفر نے تین سو سے زائد احادیث امام صاحب کے نام پر وضع کی ہیں۔ اور امام ابن عدی نے جو علی الاطلاق فرمایا کہ امام صاحب سے تین سو سے زائد معلول روایات مروی ہیں۔ علامہ کوثری ان روایات سے امام ابن حبان کے قول کے تناظر میں اباء بن جعفر کی من گھڑت روایات مراد لیتے ہیں۔ اور ہم نے عرض کیا ہے کہ اس کی مرویات "مسند الامام" کی زینت ہیں۔ اگر اباء ابن جعفر کا جرم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نام لگانا ظلم و زیادتی ہے تو ان روایات کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات قرار دینا اور "مسند الامام" کی زینت بنانا ظلم و زیادتی نہیں؟

یہاں یہ بات بھی بجائے خود غور طلب ہے کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اباء بن جعفر کو نہ تو الکامل میں ذکر کیا اور نہ ہی امام صاحب رحمہ اللہ کے ترجمہ میں اباء کے واسطے سے

---

[1] تقدمة نصب الراية 57/1

امام صاحب رحمہ اللہ کی کوئی روایت ذکر کی ہے۔ بایں صورت علامہ کوثری کا یہ کہنا امام ابن عدی رحمہ اللہ کے کلام کا مصداق اباء بن جعفر کی مرویات ہیں، رجما بالغیب ہے اور بہتان کے زمرے کا مصداق ہے۔

علامہ کوثری بلا دلیل کوئی بات کسی کے نام منسوب کر دینے کے بڑے مشاق ہیں مگر یہ بحث ہمارا موضوع نہیں ہے۔

حدیث سے امام صاحب کا انکار اور مسند میں اس کا اثبات

اباء بن جعفر کی انھی روایات میں سے ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

من لم یکن له إزار فلیلبس سراویل.[1]

"کہ جس (محرم) کے پاس چادر نہ ہو وہ شلوار پہن لے۔"

یہی روایت علامہ الخوارزمی نے بھی جامع المسانید[2] میں صرف استاذ الحارثی سے نقل کی ہے۔ اس کے برعکس یہاں یہ دلچسپ بلکہ حیران کن بات بھی دیکھیے کہ ابن ابی العوام نے فضائل ابی حنیفہ میں ذکر کیا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اگر محرم کے پاس چادر نہ ہو تو کیا وہ شلوار پہن لے؟ تو انھوں نے فرمایا: نہیں، چادر پہنے، ان سے عرض کیا گیا کہ چادر اس کے پاس نہیں۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: شلوار فروخت کر کے چادر خرید لے۔ ان سے عرض کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے: محرم کے پاس چادر نہ ہو تو وہ شلوار پہن لے۔ انھوں نے فرمایا: میرے نزدیک صحیح ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار پہنی ہو کہ میں اس کے مطابق فتویٰ دوں۔"[3]

امام صاحب رحمہ اللہ کی یہی وضاحت تاریخ بغداد[4] اور الانتقاء لابن عبدالبر[5] میں بھی ہے اور جناب قاسمی صاحب نے مسند ابن خسرو کے مقدمہ[6] میں اسے بطور استدلال ذکر کیا

---

[1] مسند الحارثی: 178/1، رقم: 119 [2] جامع المسانید: 538/1 [3] فضائل ابی حنیفہ: 182 [4] تاریخ بغداد: 392/13 [5] الانتقاء لابن عبد البر: 259 [6] مقدمہ: 50

ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام صاحب تو شلوار پہننے کی حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی سند میں اب اس کا وجود کیا اسی اباء بن جعفر کی کارستانی نہیں؟ یا امام صاحب رحمہ اللہ اپنی مروی روایت کو ہی بھول گئے ہیں؟ یا فضائل وغیرہ میں امام صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہی قابلِ اعتنا نہیں کہ اس کا راوی بھی داود بن المحبر متروک ہے۔ اندازہ کیجیے کہ متروک و کذاب راویوں نے امام صاحب کے نام سے کیا کیا گل کھلائے ہیں؟

کس کا یقین کیجیے کس کا یقین نہ کیجیے
آئی ہے بزمِ یار سے خبر الگ الگ

صالح بن احمد بن ابی مقاتل القیراطی البغدادی

یہ بھی استاذ حارثی کا ایک اور استاد ہے۔ جس کے بارے میں امام دارقطنی نے کہا ہے: «متروك، كذاب، دجال» ، ابن عدی کہتے ہیں: «يسرق الحديث» برقانی کہتے ہیں: «ذاهب الحديث» خطیب کہتے ہیں: اس کو ”حافظے کی وجہ“ سے یاد کیا جاتا تھا مگر وہ بکثرت مناکیر بیان کرتا ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں: «يسرق الحديث» ، اس نے دس ہزار احادیث کو اول بدل کر دیا ہے۔ جن شیوخ کو اس نے نہیں دیکھا تھا ان کی احادیث ان شیوخ سے ملا دیتا جنھیں دیکھا ہوتا تھا۔ موقوف کو مرفوع اور مرسل کو متصل بنا دیتا اور مسانید میں اضافہ کرتا تھا۔ اس کا معاملہ بالکل واضح ہے۔ (1)

اسی صالح قیراطی کے انہی ”اوصاف“ کا اعتراف علامہ کوثری نے تانیب الخطیب (2) میں کیا ہے۔ گو انھوں نے اپنی روایتی روش کے تحت حافظ صالح بن احمد کو ”القیراطی“ بنانے کی کوشش کی ہے۔ استاذ حارثی نے ابتدائی تین سو احادیث میں سولہ روایات صالح بن احمد سے روایت کی ہیں۔ انھی میں سے ایک روایت بایں الفاظ منقول ہے:

---

(1) لسان: 164,165/3، تاریخ بغداد: 329/9، الکامل: 1390/4، المجروحین: 373/1، میزان: 287/2، الکشف الحثیث: 207 وغیرہ (2) تانیب: 158

لا يحل لرجل يؤمن بالله واليوم الآخر أن يدخل الحمام إلا بمئزر، ومن لم يستتر عورته من الناس كان في لعنة الله والملائكة والخلق أجمعين. ①

علامہ قاسمی نے اس کی تخریج میں یہ وضاحت کی ہے کہ متعدد طرق سے اس روایت کا پہلا حصہ ''ابوالزبیر عن جابر'' کی سند سے منقول ہے اور ''طاؤس عن جابر'' کے واسطہ سے بھی یہ مروی ہے مگر دوسرا حصہ نہیں۔ یہی دوسرا حصہ «من لم يستتر ...الخ» علامہ خوارزمی نے جامع المسانید ② میں ذکر کیا ہے۔ یہ حصہ بلاشبہ اسی غیر صالح ''صالح'' کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باقی روایات کے لیے دیکھیے مسند الحارثی۔ ③

ایک ضروری وضاحت

تین سو میں سے صالح بن احمد قیراطی کی یہ ۱۶ روایات ہیں۔ ان کے علاوہ یہ بات بجائے خود غور طلب ہے کہ استاذ حارثی صالح بن ابی رمیح سے بھی بکثرت روایات لاتے ہیں، اور وہ مجہول ہے اور اکثر اس کی روایات کو «كتب إلي صالح بن أبي رميح» کے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں، اور کبھی صرف «كتب إلي صالح» کہتے ہیں۔ پس کیا یہاں بھی ابن ابی رمیح ہی مراد ہے؟ قطعاً نہیں بلکہ اس سے یہی صالح بن احمد قیراطی مراد ہوتا ہے، جیسا کہ استاذ حارثی نے حدیث نمبر ۱۴ میں یہی کہا ہے: «كتب إلي صالح» اور اس روایت کے الفاظ ہیں:

بئس البيت الحمام، بيت لا يستر، وماء لا يطهر.

اور یہی وہ روایت ہے جسے حافظ ذہبی نے صالح بن احمد بن ابی مقاتل قیراطی کے ترجمہ

---

① مسند، رقم: 65 ② جامع المسانید: 350/1

③ رقم: 14,30,70,76,115,128,129,139,178, 206,210,215,246,262,265

میں استاذ حارثی کی اسی مسند ابی حنیفہ سے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے:

هذا من اختلاق صالح. ①

''یہ صالح کی گھڑی ہوئی روایت ہے۔''

اس لیے اس مسند میں جہاں 'كتب إلي صالح' سے روایات منقول ہیں ان میں اگر یہی صالح قیراطی مراد لیا جائے تو پھر اس کی تعداد سولہ سے بڑھ جاتی ہے۔ اور یوں یہ تعداد پچیس ہو جاتی ہے۔ ②

محمد بن صالح بن عبداللہ الطبری

یہ بھی استاذ حارثی کے ''استاد محترم'' ہیں۔ ان کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ليس بذاك، اتهم بالكذب.

ابوجعفر الصفار کہتے ہیں: ''رے'' میں اس کا حال منکشف ہوگیا۔ ابن ابی حاتم نے پہلے اس کا اکرام کیا مگر جب اس کی حالت ظاہر ہوگئی تو اسے ''رے'' سے نکال دیا اور اس کی حالت بری ہوگئی۔ ③ علامہ ابن عراق نے اسے وضاعین میں شمار کیا ہے۔ ④

اسی طبری سے استاذ حارثی نے احادیث ⑤ روایت کی ہیں۔ متہم بالکذب اور مکشوف الحال راوی کا حکم کیا ہے؟ اور ایسے راوی کی بیان کی گئی سند وحدیث کا حکم کیا ہے؟ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ ایسے راوی کی بیان کردہ اسانید سے امام صاحب کی روایت ثابت کرنا بہر حال درست نہیں۔

محمد بن ابراہیم بن زیاد الرازی

یہ بھی استاذ حارثی کے شیخ ہیں۔ امام ابواحمد حاکم نے اسے ''ضعیف'' کہا ہے۔ امام

---

① میزان: 287/2 ② مسند الحارثی، رقم: 16, 17,40,41,44,46,61,153,154,181

③ میزان: 581/2 ،لسان: 200/5 ④ تنزیه الشریعة 109/1 ⑤ رقم: 68,69,118,120

دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے "متروک"، نیز اسے «دجال، یضع الحدیث» بھی کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس کے ترجمے میں ایک روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: «ھذا باطل» "یہ باطل ہے۔" خطیب بغدادی نے پہلے اسی کے واسطہ سے ایک حدیث «عبد الرحمن بن یونس الرقی و عبد الکریم بن أبی عمیر، قالا حدثنا الولید بن مسلم، حدثنا الأوزاعی وعیسی بن یونس عن الأعمش عن أبی صالح عن أبی ھریرۃ» کی سند سے ذکر کی ہے جس کے الفاظ ہیں: «الإمام ضامن» پھر یہی روایت اسی محمد بن ابراہیم رازی سے نقل کی ہے کہ اس نے کہا:

حدثنا عبد الرحمن بن یونس عن الولید عن الأوزاعی عن سفیان الثوری عن الأعمش بہ.

خطیب اس حدیث کی یہ سند نقل کر کے لکھتے ہیں:

أما الحدیث الثانی فلا أعرف لہ وجھا، ولم أکتبہ إلا من ھذا الطریق عن محمد بن إبراھیم الرازی، وأراہ مما صنعت یداہ. وأما الحدیث الأول فھو محفوظ من روایۃ أبی عبد اللہ محمد بن موسی النھرتیری وکان النھرتیری قد عرف بہ، وتفرد بروایتہ عن عبد الکریم بن أبی عمیر وحدہ عن الولید. ولا أشک أن محمد بن إبراھیم سرقہ منہ، فرواہ عن عبدالکریم وأضاف إلیہ عبد الرحمن بن یونس.[1]

خلاصۂ کلام یہ کہ «الإمام ضامن» حدیث کی دوسری سند محمد بن ابراہیم رازی کی بناوٹی ہے۔ اس سند میں عبدالکریم بن ابی عمیر ولید سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور

[1] تاریخ بغداد: 306/11

اس سے روایت محمد بن موسیٰ کی معروف ہے۔ محمد بن ابراہیم نے دراصل یہ محمد بن موسیٰ سے چرا کر اس میں عبدالرحمٰن بن یونس کا اضافہ کر دیا ہے۔ خطیب بغدادی نے یہی بات مختلف الفاظ میں تاریخ بغداد جلد ۳ [1] میں بھی کہی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لسان المیزان [2] میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے محمد بن ابراہیم کا وضاع اور متروک ہونا نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتا ہے، علامہ ابن عراق نے بھی اسے وضاعین میں شمار کیا ہے۔ [3] استاذ حارثی نے ابتدائی تین سو احادیث میں سے حدیث نمبر ۳۴ اور ۱۸۹ اسی سے روایت کی ہیں۔ ایسے سارق الحدیث اور وضاع کی بیان کردہ اسانید سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایات ثابت کرنا بڑے جگرے کی بات ہے۔

اسحاق بن بشر ابوحذیفۃ البخاری

استاذ حارثی «إسحاق بن بشر عن أبي حنيفة» سے بھی روایات لائے ہیں۔ مولانا قاسمی ایک جگہ حاشیے میں یہ توضاحت فرماتے ہیں کہ ایک نسخے میں بشر بن اسحاق ہے مگر وہ خطا ہے۔ [4]

مگر مجال ہے کہ یہ بتلائیں کہ یہ اسحاق بن بشر کیسے ''بزرگ'' ہیں؟۔ جب کہ امام علی بن مدینی نے اسے جھوٹا کہا ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ''کذاب اور متروک'' کہا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی حدیث لکھنا حلال نہیں، تعجب کے طور پر ہی حدیث لکھی جا سکتی ہے۔ محمد بن عمر الدار بجردی نے کہا کہ وہ ثقہ ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کسی نے بھی اس کی توثیق کی طرف التفات نہیں کیا کیونکہ ابوحذیفہ کی حالت سے تو اندھے بھی واقف ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے: لوگوں نے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے بھی اسے ''کذاب'' کہا ہے بلکہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے الموضوعات میں کہا ہے: اس کے کذاب ہونے پر اجماع ہے۔ نقاش نے «یضع الحدیث» کہا ہے اور حافظ خلیلی

---

[1] تاریخ بغداد: 242/3 [2] لسان المیزان: 51/4، 22,23/5 [3] تنزیہ الشریعۃ: 99/1

[4] حاشیہ: 554/2، نیز دیکھیے: 222/1

نے بھی کہا ہے کہ وہ وضع حدیث سے متہم ہے۔ ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی احادیث سنداً یا متناً ''منکر'' ہیں۔ خطیب بغدادی نے 'غیر ثقہ' اور ازدی نے «متروک، ساقط، رمی بالکذب» کہا ہے۔[1] علامہ حلبی نے بھی الکشف الحثیث[2] میں اور علامہ ابن عراق نے مقدمہ تنزیہ الشریعہ[3] میں اسے ذکر کر کے اس کے وضاع اور کذاب ہونے کا اظہار کیا ہے۔ ایسے کذاب اور وضاع کے توسط سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات ثابت کرنا استاذ حارثی کا بلاشبہ بڑا کارنامہ ہے۔

محمد بن القاسم البلخی ابوجعفر الطایکانی

استاذ حارثی نے ایک اور دو واسطوں سے اس کی روایات بیان کی ہیں۔[4] امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں کہا ہے:

''وہ اہلِ خراسان سے ایسی چیزیں بیان کرتا ہے جنھیں کتابوں میں ذکر کرنا حلال نہیں تو اس کی روایات سے شغل رکھنا کیونکر حلال ہے؟ وہ ایسی روایات ذکر کرتا ہے جن کے باطل ہونے کی گواہی امت دیتی ہے اور ان کے ثبوت کی نفی کرتی ہے۔''

امام حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔ اس نے نیشاپور اور مکہ جاتے ہوئے موضوع روایات بیان کی ہیں۔ امام ابونعیم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ اس نے نیشاپور اور طریقِ مکہ میں مناکیر بیان کی ہیں۔ جوزقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ جھوٹ بولتا اور حدیثیں گھڑتا تھا۔[5]

بلکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

قال عبد الله الأستاذ في المسند جمعه: حدثنا أحمد بن

---

(1) میزان: 184/1، لسان: 354/1 (2) الکشف الحثیث: 90 (3) تنزیہ الشریعۃ 36/1

(4) مسند الحارثی، رقم: 1389,1387,1386,1385,1384,1383,1382,1381,401,156

(5) المجروحین: 311/2، میزان: 11,12/4، لسان: 343/5، الضعفاء لأبی نعیم 145، الضعفاء لابن الجوزی: 93/3، الکشف الحثیث: 400 وغیرہ

محمد بن سعيد الهمداني حدثنا محمد بن أحمد الطالقاني حدثنا محمد بن القاسم أبو جعفر الطايقاني حدثنا أبو مقاتل عن أبي حنيفة عن إسماعيل بن عبد الملك عن أبي صالح عن أم هانئ قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن لله مدينة من مسك...الخ

حافظ ذہبی رحمہ اللہ استاذ عبداللہ حارثی کی مسند سے اس کے علاوہ مزید آٹھ روایات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فهذا من اختلاق الطايقاني مع أن شيخه حفصاً كذب.

''یہ طایقانی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس کا شیخ حفص (بن سلم ابومقاتل) بھی جھوٹا ہے۔''

یہ وہی روایات ہیں جن کی نشاندہی (احادیث ۱۳۸۱ سے ۱۳۸۹ تک) اوپر ہم نے کی ہے۔ جناب علامہ قاسمی صاحب کی شرافت و دیانت دیکھیے کہ انھوں نے ان احادیث کی حسب روایت تخریج تو کیا کرنا تھی، محمد بن قاسم کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی اس وضاحت پر بھی خاموش ہیں۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی ایک اور موضوع روایت کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ امام ابونعیم نے مسند الامام ابی حنیفہ [1] میں بھی اسی محمد بن قاسم سے اسی سند کے ساتھ ایک حدیث ذکر کی ہے جس کے بارے میں مولانا عبدالشہید نعمانی فرماتے ہیں:

لم أجد فيما لدى من المراجع.

''جو میرے پاس مراجع ہیں ان میں میں نے یہ حدیث نہیں پائی۔''

امام ابونعیم نے فرمایا ہے: محمد بن قاسم «ليس بشيء، متروك» ہے۔

---

[1] مسند الإمام ابی حنیفة، رقم: 54

یہاں یہ لطیفہ بھی دیکھیے کہ اسی الطایقانی سے مسند میں ایک حدیث[1] ہے جس کی تخریج سے علامہ قاسمی خاموش ہیں۔ حدیث نمبر ۱۰۴ بھی اسی سے منقول ہے۔ علامہ قاسمی اس کے بارے میں شیخ محمد عابد سندھی کی «المواهب اللطيفة» سے نقل کرتے ہیں۔

قد تتبعت لكن لم أجد طريق ابن عمر.

''میں نے تتبع کیا مگر ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نہیں ملی۔''

علامہ قاسمی صاحب حسبِ روایت فرماتے ہیں: یہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ہے اور اس باب میں فلاں فلاں صحابی سے بھی روایت ہے۔[2] مگر مجال ہے کہ یہ فرمائیں کہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہاں سے آ گئی؟ یہ تو محمد بن قاسم کی بنائی ہوئی سند سے ہے۔

ابومقاتل حفص بن سلم سمرقندی

ان احادیث میں محمد بن قاسم کا استاد ابومقاتل بھی جھوٹا راوی ہے جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے شاگرد محمد بن قاسم کے ترجمے میں کہا ہے۔ امام وکیع رحمہ اللہ اور عبدالرحمن ابن مہدی رحمہ اللہ نے اسے جھوٹا کہا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ موضوع احادیث بیان کرتا ہے۔ ابواسحاق جوزجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اچھے کلام کے لیے سند بنا لیتا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، میزان اور لسان[3] وغیرہ۔ علامہ حلبی نے بھی اسے الکشف الحثیث[4] میں ذکر کر کے اسے وضاعین میں شمار کیا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔ یہ احادیث محمد بن قاسم یا اس کے اسی استاد کی من گھڑت ہیں کیونکہ دونوں کذاب اور وضاع ہیں۔ ابومقاتل سے ان احادیث کے علاوہ اور احادیث بھی مسند الامام ابی حنیفہ کی ''زینت'' ہیں۔

---

[1] مسند، رقم: 156 [2] حاشیہ مسند: 318/1 [3] میزان: 557/1، لسان: 223,322/2
[4] الکشف الحثیث: 152

اسماعیل بن یحییٰ بن عبیداللہ

یہ بھی امام صاحب کے تلمیذ ہیں جن کے توسط سے استاذ حارثی مسند الامام ابی حنیفہ میں روایات لائے ہیں۔ جس کے بارے میں امام صالح بن محمد جزرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «کان یضع الحدیث» ''وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔'' ازدی کہتے ہیں: وہ ارا کین کذب کا ایک رکن تھا۔ حافظ ابوعلی نیشاپوری رحمہ اللہ اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی اسے کذاب کہا ہے۔ حافظ ابن عدی رحمہ اللہ اس کے ترجمے میں احادیث ذکر کر کے کہتے ہیں: یہ باطل ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ امام مالک، مسعر اور ابن ابی ذئب سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کے ترک پر اجماع ہے۔ [1]

اسی کذاب اور وضاع نے ایک حدیث کی سند یوں ذکر کی ہے:

عن أبي حنيفة عن عمرو بن دينار عن ابن عباس قال: نهينا عن بيع الطعام حتى يقبض. [2]

مولانا قاسمی صاحب نے اس کی تخریج میں ذکر کیا ہے کہ امام شافعی، امام حمیدی، امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ابن جارود، امام طحاوی اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے یہ حدیث «سفیان بن عیینة عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس» کی سند سے ذکر کی ہے۔

عرض ہے: امام سفیان بن عیینہ کے علاوہ امام شعبہ، حماد بن زید، سفیان ثوری اور ہشیم بھی اسے طاؤس کے واسطے سے ہی بیان کرتے ہیں جیسا کہ صحیح ابن حبان [3]، مسند امام احمد اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے۔ اور یہ طاؤس کے واسطے سے ہی کتبِ احادیث میں معروف ہے مگر اسماعیل بن یحییٰ نے امام صاحب سے اسے بغیر واسطہ طاؤس کے بنا دیا جو اس کی نکارت

---

[1] میزان: 253/1، لسان: 441,442/1، الکامل: 297,298/1 [2] مسند، رقم: 11[illegible]

[3] صحیح ابن حبان: 227/7، تحفة الأشراف: 20/5، أطراف المسند: 133/3

لی بین دلیل ہے۔

سلم بن سالم

یہ بھی امام صاحب کے تلمیذ ہیں۔ جناب علامہ قاسمی صاحب نے اس کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ بعض نسخوں میں "سلم بن سلم" ہے، ایک نسخے میں سلم بن سالم ہے اور یہی صحیح ہے۔[1] جو حدیث اس نے بیان کی ہے اس کے دیگر طرق اور شواہد تو انھوں نے بیان فرما دیے مگر مجال ہے اس کے بارے میں ایک حرف بھی لکھا ہو اور بتلایا ہو کہ امام صاحب تک اس کی سند کیسی ہے؟۔

عرض ہے کہ یہ سلم بن سالم گو بڑے عابد زاہد بزرگ تھے مگر محدثین کے نزدیک ضعیف تھے۔ حتی کہ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے «ضعیف، لیس بشیء» کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے «لیس بذاك» اور امام ابوزرعہ رحمہ اللہ نے فرمایا: «لا یکتب حدیثه» یعنی اس کی حدیث نہ لکھی جائے، نیز یہ بھی کہا کہ وہ سچا نہیں۔ امام علی بن مدینی، امام نسائی اور ابن سعد رحمہم اللہ نے بھی ضعیف کہا ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ نے «لیس بشیء» اور جوزجانی رحمہ اللہ نے «غیر ثقة» کہا ہے۔ حافظ خلیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اس کے ضعف پر اجماع ہے۔ اہل بلخ میں سے اسی نے ان لوگوں کی احادیث روایت کی ہیں جن کا حدیث سے شغل نہیں۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے: محدثین اس کی روایات کے ضعف پر متفق ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ «منکر الحدیث» ہے، احادیث الٹ پلٹ کر دیتا تھا۔ ابن مبارک رحمہ اللہ اسے جھوٹا کہتے تھے۔ احمد بن سیار رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی حدیث کی نہ کوئی نکیل ہے، نہ لگام، موضوع حدیث کی مانند ہے۔

انہی سلم بن سالم نے یہ حدیث بیان کی کہ دال مسور کی تعریف ستر انبیائے کرام نے کی ہے۔ اس کے بارے میں امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: بالکل

---

[1] مسند: 1/192، رقم: 135

نہیں، ایک نبی نے بھی دال مسور کی تعریف نہیں کی۔ انھوں نے فرمایا: یہ کس نے بیان کی ہے؟ تو انھیں بتایا گیا کہ سلم بن سالم نے۔ امام ابن المبارک رحمہ اللہ نے فرمایا: اس نے کس سے روایت کی ہے؟ انھیں بتلایا گیا کہ سلم آپ سے ہی روایت کرتا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: مجھ سے بھی روایت کرتا ہے!!! نیز انھوں نے فرمایا: سلم کے سانپوں سے بچو، وہ کہیں ڈس نہ جائیں۔ امام عجلی رحمہ اللہ نے فرمایا: «لا بـأس بـه» امام ابن عدی رحمہ اللہ سے بھی یہی قول حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اسے «لا بـأس بـه» نہیں کہا بلکہ اس کی روایات ذکر کر کے کہا ہے۔ اس کی یہ منکر روایات میں نے دیکھی ہیں، اس کی افراد (اور غرائب) ہیں۔ امید ہے کہ اس کی حدیث محتمل ہوگی۔ [1] لہٰذا اس کی منکرات کے بعد اس کی مفردات کو محتمل قرار دینا اس کی توثیق قطعاً نہیں۔ علامہ کوثری رحمہ اللہ نے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔ [2]

امام یحییٰ بن معین، امام ابوداود، امام ابن المبارک اور امام ابوزرعہ رحمہم اللہ کی شدید جرح کے مقابلے میں امام عجلی رحمہ اللہ کی کمزور سی توثیق قابلِ التفات نہیں۔ اس جیسے متروک اور کذاب راوی کی روایات سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات ثابت کرنے میں کون سی معقولیت ہے؟

اسی طرح یحییٰ بن عنبسہ، احمد بن عبداللہ بن محمد کندی المعروف باللجلاج، احمد بن محمد بن صلت حمانی، عبداللہ بن واقد ابوقتادہ، نوح بن ابی مریم ابوعصمہ، حسن بن زیاد لؤلؤی، حسین بن حسن بن عطیہ عوفی، خلف بن یاسین زیات، اسحاق بن بشر بخاری، محمد بن ابراہیم بن زیاد رازی، عبدالقدوس بن عبدالقاہر، سلیمان بن احمد بن عیسیٰ واسطی، محمد بن الفضل بن عطیہ، خارجہ بن مصعب، محمد بن اسحاق بلخی، عثمان بن دینار، محمد بن میسر ابوسعد صغانی، جعفر بن محمد بن مروان، ہیاج بن بسطام، محمد بن حمید رازی، محمد بن اشرس سلمی، مروان بن سالم،

[1] میزان: 185/2، لسان: 63/3، الکامل: 1173/3، الإرشاد، رقم: 1038، المجروحین: 1/ 344، تاریخ بغداد: 140/9 [2] تأنیب، ص: 278

حبان بن علی، یسع بن طلحہ، احمد بن حرب نیشاپوری، قاسم بن غصن، اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفہ محمد بن عبدالرحمٰن قشیری، خلف بن ایوب جیسے ضعیف، منکر الحدیث، متروک، کذاب اور وضاع راویوں سے مسند الامام ابی حنیفہ میں مروی روایات کو امام صاحب کی مرویات باور کرانا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ ان متکلم فیہ راویوں کے علاوہ مجاہیل کی روایات اس پر مستزاد ہیں جو مسند الامام کی زینت ہیں۔ افسوس ہے مسند الامام کے محقق علامہ قاسمی مسند کی مرویات کے شواہد ومتابعات تو بڑی وسعت سے بیان کرتے ہیں، مگر جس سند پر مسند الامام ابی حنیفہ کا دارومدار ہے اس کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ ہماری ان گزارشات سے استاذ حارثی کی مسند ابی حنیفہ کی پوزیشن واضح ہوجاتی ہے۔

قاسمی صاحب کی بے انصافی

اس ضمن میں یہ بھی دیکھیے کہ استاذ حارثی نے قاسم بن غصن کے واسطے سے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مرویات نقل کی ہیں اور مولانا قاسمی فرماتے ہیں: قاسم کا ترجمہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (1)

حالانکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے الثقات (2) میں اگر اس کا ذکر کیا ہے تو المجروحین میں بھی اس کا ذکر کیا اور کہا ہے۔

كان ممن يروي المناكير عن المشاهير ويقلب الأسانيد حتى يرفع المراسيل ويسند الموقوف لايجوز الاحتجاج به إذا انفرد. (3)

''وہ مشاہیر سے منکر روایات بیان کرتا ہے حتی کہ مراسیل کو مرفوع اور موقوفات کو مسند بنادیتا ہے جب وہ منفرد ہو تو اس سے استدلال جائز نہیں۔''

اب یہ دیانتداری کی کون سی معراج ہے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ کے ایک موقف کو تو ذکر

---

(1) مسند الإمام: 351/1، رقم: 475 (2) الثقات: 339/7 (3) المجروحين: 212,313/2

کیا جائے اور دوسرے کو، جو جمہور ائمہ جرح وتعدیل کے موافق ہے، نظر انداز کر دیا جائے! حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی امام ابن حبان رحمہ اللہ کے اس تناقض کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں: «هو ممن يناقض ابن حبان فيه» امام احمد رحمہ اللہ نے بھی فرمایا: «حدث بأحاديث مناكير» یعنی وہ منکر احادیث بیان کرتا ہے۔ امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف''، امام بزار رحمہ اللہ نے «لم يكن بالقوي» ، امام ابوزرعہ نے «ليس بقوي» کہا ہے اور امام ساجی، عقیلی، ابن شاہین، ابن الجارود، فسوی، حربی اور دولابی نے ''ضعفاء'' میں ذکر کیا ہے۔ ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کی احادیث صالح، غرائب اور مناکیر ہیں۔ امام وکیع رحمہ اللہ نے «لا بأس به» کہا ہے۔ ① حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی المغنی ② اور دیوان الضعفاء ③ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: «ضعفه أبو حاتم وغيره» امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''ضعیف'' کہا ہے۔ ④

اس جیسے ضعیف اور صاحب مناکیر کے بارے میں صرف الثقات لابن حبان کے حوالے پر اکتفا کرنا قاسمی صاحب کی تحقیق کا کمال ہے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھیے استاذ حارثی نے «الضحاك بن حجوة أبو حجوة ثنا أبو قتادة عن أبي حنيفة عن عطاء عن أبي هريرة» کی سند سے یہ حدیث ذکر کی ہے کہ «كان لرسول الله صلى الله عليه وسلم قلنسوة بيضاء شامية.» ⑤

اسی روایت کے بارے میں علامہ قاسمی صاحب نے ذکر کیا ہے کہ ابوالشیخ الاصبہانی نے «أخلاق النبي ﷺ» میں یہی روایت «الضحاك بن حجرة المنبجي عن عبدالله بن واقد عن أبي حنيفة» ہی کی سند سے نقل کی ہے اور اس میں ضحاک ضعیف ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: «فيه الضحاك وهو ضعيف.»

---

① میزان: 377/3، اللسان: 464/4 ② المغنی: 520/2 ③ دیوان الضعفاء: 25
④ السنن: 101/1 ⑤ مسند: 127/1، رقم: 15

اولاً: عرض ہے کہ ضحاک بن حجرہ نہیں بلکہ ضحاک بن حجوہ ہے۔

ثانیاً: استاذ حارثی نے اس کی کنیت ابوحجوہ ذکر کی ہے جبکہ کتب رجال میں عموماً اس کی کنیت ابوعبداللہ بیان ہوئی ہے۔

ثالثاً: یہ ضحاک ضعیف ہی نہیں بلکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے: «کان یضع الحدیث» یعنی وہ حدیث وضع کرتا تھا۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: «منکر الحدیث عن الثقات» ”وہ ثقات سے منکر احادیث بیان کرتا ہے۔“ پھر اس کی کچھ روایات نقل کر کے مزید یہ بھی کہا ہے کہ اس کی یہ تمام روایات سنداً متناً منکر ہیں۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ اپنے شہر والوں سے عجائبات روایت کرتا ہے، اس سے استدلال جائز نہیں۔ سوائے معرفت کے اس کی روایت ہی لینا جائز نہیں۔ یہ وہی ہے جس نے «أبو قتادة عن أبي حنیفة عن عطاء عن أبي هریرة» سے یہ روایت بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر شامی ٹوپی دیکھی ہے۔[1]

ایسے وضاع کے بارے میں جناب علامہ قاسمی صاحب کا فرمانا کہ وہ بس ”ضعیف“ ہے، علم کی کوئی خدمت نہیں۔

راوی ”ضعیف“ اور وضاع کے مابین جو فرق ہے اس سے ایک مبتدی بھی باخبر ہے مگر افسوس علامہ قاسمی صاحب کو یہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس کے ترجمہ میں مسند کی ہی روایت ذکر کر کے اس کی پوزیشن مزید واضح کر دی ہے۔ ایسے ہی متعدد کذابین اور متروکین کی روایات سے مسند الامام ابی حنیفہ مزین ہے۔

رابعاً: قاسمی صاحب نے ضحاک ایسے وضاع کو جہاں ضعیف کہہ کر ضمیر کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی ہے وہاں پر اس کے استاد ابوقتادہ عبداللہ بن واقد کے بارے میں خاموشی

---

[1] المجروحین: 379,380/1، الکامل: 305/6، میزان: 323/2، لسان: 200/3، الکشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث: 213

اختیار کر کے اپنے قارئین کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "متروک" قرار دیا ہے۔ (1)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی روایت ذکر کر کے کہا ہے: «فهو الآفة» "وہی آفت ہے۔" اور اسی وجہ سے علامہ حلبی نے اسے الكشف الحثيث (2) میں ذکر کر کے اسے وضاعین میں شمار کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اگرچہ اس کی توثیق کی ہے مگر جمہور محدثین نے اس پر سخت جرح کی ہے اور وہی راجح ہے۔ یہی رجحان حافظ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ ایسے متروک راویوں سے اغماض اہلِ علم کا شیوہ نہیں۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مناظرہ

اسی نوعیت کی ایک مثال اور دیکھ لیجیے، چنانچہ حارثی نے «محمد بن إبراهيم بن زياد الرازي حدثنا سليمان الشاذكوني» سے امام اوزاعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مابین رفع الیدین کے موضوع پر باہمی گفتگو ذکر کی ہے۔ یہ گفتگو بہت سے حنفی اکابرین اپنی تصانیف میں ذکر کرتے ہیں مگر اس کا اصل ماخذ یہی استاذ حارثی ہے۔ مولانا قاسمی صاحب نے بھی لکھا ہے: «هذا الأثر لم يروه إلا الحارثي» اور اسی اثر کے بارے میں قاسمی صاحب رقمطراز ہیں:

> فيه سليمان الشاذكوني، سئل صالح بن محمد جزرة عن الشاذكوني فقال: مارأيت أحفظ منه إلا أنه يكذب في الحديث، وقال ابن عدي: سألت عبدان عنه فقال: معاذ الله أن يتهم، إنما كان قد ذهبت كتبه، فكان يحدث حفظاً. (3)

"اس میں سلیمان شاذکونی ہے، صالح جزرہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو

(1) تقريب: 193 (2) الكشف الحثيث: 251 (3) مسند الحارثي: 484/1

انھوں نے کہا: میں نے اس سے زیادہ حافظ کسی کو نہیں دیکھا مگر وہ حدیث میں جھوٹ بولتا ہے۔ ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے عبدان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: اللہ کی پناہ کہ اسے متہم قرار دیا جائے، اس کی کتابیں ضائع ہو گئی تھیں تو وہ زبانی احادیث بیان کرتا تھا۔"

امام ابن عدی رحمہ اللہ نے بلاشبہ حافظ عبدان کے قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ متہم نہیں ہے، اس کی کتابیں ضائع ہو گئی تھیں، زبانی احادیث بیان کرتا تھا۔ اسی بنا پر احادیث بیان کرنے میں اس سے خطا ہو جاتی تھی۔ نیز انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی بہت سی احادیث مستقیم ہیں، بعض مناکیر ہیں اور بعض سرقہ ہیں۔ مولانا قاسمی صاحب نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے کہ شاذکونی ضعیف ہے۔ (1)

ان کی اس رائے کے بارے میں کچھ کہنے کی بجائے ہم یہاں ترجمان مسلک دیوبند مولانا محمد سرفراز صفدر مرحوم کے الفاظ ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «فیه نظر»، ابن معین رحمہ اللہ نے اس کو حدیث میں جھوٹا کہا، ابو حاتم رحمہ اللہ اس کو متروک الحدیث اور نسائی رحمہ اللہ «لیس بثقة» کہتے ہیں اور صالح جزرہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «کان یکذب فی الحدیث» "حدیث میں جھوٹ کہتا تھا۔" اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ شراب پیتا اور بیہودہ حرکتوں میں آلودہ تھا اور نیز فرمایا کہ درب دمیک میں شاذکونی سے بڑا جھوٹا اور کوئی داخل نہیں ہوا۔ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «رماہ الأئمة بالکذب» "ائمہ حدیث نے اس کو جھوٹ سے متہم کیا ہے۔" اور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «کان یضع الحدیث» "وہ جعلی روایتیں بنایا کرتا تھا۔" امام ابو احمد الحاکم رحمہ اللہ اس کو 'متروک الحدیث' اور امام ابن مہدی رحمہ اللہ اس کو خائب اور نامراد کہتے تھے۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اس کو عدو اللہ، کذاب اور خبیث کہا اور صالح

(1) مسند: 617,753/2، 358/1

جزرہ کہتے ہیں کہ آناً فاناً سندیں گھڑ لیتا تھا اور صالح بن محمد نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ کذب اور لونڈے بازی سے متہم تھا۔'' ①

قارئینِ کرام ان الفاظِ جرح کے بعد فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ شاذکونی ''ضعیف'' ہے یا اس سے اوپر کے درجے میں یعنی متروک یا کذاب ہے۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے المغنی ② اور دیوان الضعفاء ③ میں اسے ذکر کیا ہے اور امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ کی شدید جرح نقل کر کے اس کی پوزیشن واضح کر دی ہے۔ علامہ حلبی نے اسے الکشف الحثیث ④ میں ذکر کر کے اس کے وضاع ہونے کا اظہار کیا ہے۔

علامہ معلمی نے فرمایا ہے کہ استاذ حارثی کی بعض چیزوں کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی خود ساختہ ہیں، جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ''مسند'' کو وصیت نامہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مناظرہ۔ ⑤

اس میں محمد بن ابراہیم الرازی بھی ہے

علامہ قاسمی صاحب نے یہ تو اعتراف کیا ہے کہ اس میں شاذکونی ضعیف ہے۔ مگر یہ نہیں بتلایا کہ اس کا شاگرد اور استاذ حارثی کا استاد محمد بن ابراہیم بن زیاد رازی بھی اس میں پایا جاتا ہے اور وہ کیسا ہے؟ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متروک، دجال اور وضاع قرار دیا ہے۔ ایسے راوی سے خاموشی کیا مجرمانہ غفلت نہیں؟

ایک اور علت

یہی نہیں کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مابین ہونے والے اس مناظرے کی سند میں محمد بن ابراہیم متروک، کذاب اور سارق الحدیث ہے اور اس کا استاذ

① أحسن الكلام: 204/1 ② المغني: 279/1 ③ ديوان الضعفاء: 131 ④ الكشف الحثيث: 199 ⑤ حاشية الفوائد المجموعة: 14

شاذکونی بھی کذاب اور وضاع ہے بلکہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سماع ہی صحیح نہیں، چنانچہ امام عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں:

حدثني أبي قال: حدثنا مسكين قال: حدثنا الأوزاعي قال سئل ابوحنيفة، قال أبي: لم يسمع الأوزاعي عن أبي حنيفة شيئاً. (1)

"مجھے میرے والد (امام احمد) نے بتلایا، انھوں نے فرمایا: مجھے مسکین بن بکیر نے حدیث سنائی، اس نے کہا کہ مجھے اوزاعی نے حدیث سنائی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا۔ (یہ سن کر) میرے والد نے فرمایا: اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ بھی نہیں سنا۔"

ظاہر ہے کہ جب امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ سنا ہی نہیں تو مسکین ابن بکیر یہ کیسے کہتے ہیں کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا؟ یعنی دونوں کے مابین واسطہ ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام اوزاعی کا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سماع نہیں مگر افسوس کہ کذاب اور وضاع راویوں نے دونوں کے مابین تقریب پیدا کر دی اور باقاعدہ ایک مناظرے کی روداد بنا ڈالی۔ اگر اس مناظرے کی کوئی حقیقت ہوتی تو امام محمد، قاضی ابویوسف اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہم اس سے بے خبر نہ ہوتے۔ اس کا انکشاف سب سے پہلے استاذ حارثی پر ہوا۔ جس کا اعتراف قاسمی صاحب کو بھی ہے کہ «لم یروہ إلا الحارثي» اور خود حارثی کی پوزیشن آپ پہلے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

---

(1) العلل ومعرفة الرجال: 3/195، رقم: 4842

ایک حقیقت کا اعتراف

استاذ حارثی نے اس مناظرے کے آخری الفاظ یوں ذکر کیے ہیں: «وعبد الله عبدالله فسكت الأوزاعي» ''عبداللہ رضی اللہ عنہ (بن مسعود) عبداللہ ہیں، اس پر اوزاعی رحمہ اللہ خاموش ہوگئے۔'' مگر جامع المسانید میں آخری الفاظ یوں ہیں:

وعبد الله، عبدالله بن مسعود، له فضل كثير فى الفقه والقراءة وحق الصحبة من صغره عند النبى ﷺ على عبد الله بن عمر، فسكت الأوزاعي. (1)

جامع المسانید کے محقق حسن نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ مسند حصکفی میں تو یہی الفاظ ہیں: «وعبد الله ،عبدالله ،فسكت الأوزاعي» نیز ملاحظہ ہو: مسند حصكفي مع شرح القاري (2) مگر یہ زیادت میں نے اس کتاب کے دو نسخوں میں پائی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

والزيادة على ذلك وجدت فى نسختين من هذا الكتاب.

مولانا عثمانی یہی تفصیل بیان کر کے فرماتے ہیں:

لم توجد هذه الزيادة فى النسخ التى اعتمدت عليها فى تحقيق الكتاب، فهذه الزيادة ليس لها أساس...الخ (3)

''یہ زیادت ان نسخوں میں بھی نہیں جن پر میں نے کتاب کی تحقیق میں اعتماد کیا ہے، لہٰذا اس زیادت کی کوئی بنیاد نہیں۔''

عرض ہے کہ جس طرح جامع المسانید کے بعض نسخوں میں یہ زیادت کسی سمجھ دار ناسخ کی شرارت وجسارت ہے ہمارے نزدیک تو بالکل اسی طرح امام اوزاعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

(1) جامع المسانيد: 353/1 (2) مسند حصكفي مع شرح القاري: 37 (3) مسند: 484/1

کے مابین مناظرے کی یہ روداد بھی کذاب ووضاع راویوں کی جسارت ہے۔

بلکہ معنوی طور پر اس مناظرے میں کوئی معقولیت نہیں۔ ایک بدیہی بات ہے کہ رفع الیدین حسی اور ظاہری عمل ہے۔ یہاں فقاہتِ راوی نہیں ضبطِ راوی کی ضرورت ہے۔ مناظرے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بات منسوب ہوئی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

لم یصح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ شيء.

"رفع الیدین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کچھ ثابت نہیں۔"

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے ثبوت پیش کیا تو اس کے ثبوت کا انکار امام صاحب رحمہ اللہ نے نہیں کیا بلکہ رفع الیدین نہ کرنے کے بارے میں روایت ذکر کر کے دونوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے۔

غور فرمایئے کیا یہ اسلوب اس بات کا مشعر نہیں کہ امام صاحب کا جواب ان کے دعوے کے مطابق نہ تھا کیونکہ انھوں نے رفع الیدین کے ثبوت میں کلام نہیں کیا بلکہ اسے تسلیم کر کے دو روایتوں میں ترجیح کو اختیار کیا ہے۔ حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی مرحوم نے حسن البیان میں اس مناظرے پر معنوی اعتبار سے بڑی تفصیل سے نقد کیا ہے۔ شائقین اس کی مراجعت کریں ان شاء اللہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ استاذ حارثی کی روایت سے مناظرے کی یہ روداد نہ سنداً قابلِ اعتبار ہے اور نہ ہی معناً اس میں کوئی معقولیت ہے۔ مولانا قاسمی نے سلیمان شاذکونی کو ضعیف تو کہا مگر اس کے شاگرد محمد بن ابراہیم سے بالکل تعرض نہیں کیا جو قطعاً قرین انصاف نہیں۔

یہ تو مولانا لطیف الرحمن قاسمی صاحب کی تحقیقات کا ایک پہلو تھا۔ اب اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیں کہ استاذ حارثی نے ایک حدیث «أحمد بن أبي طیبة عن أبي حنیفة عن عکرمة عن ابن عباس» کی سند سے بیان کی ہے کہ «سید الشہداء یوم القیامة حمزة» اس کی تخریج میں جناب قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ

طبرانی اوسط میں یہ روایت «الحسن بن رشید عن أبی حنیفة به» کی سند سے ہے اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع الزوائد (1) میں کہا ہے:

فیه شخص ضعیف فی الحدیث.

''اس میں ایک شخص ہے جو حدیث میں ضعیف ہے۔''

قاسمی صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

قلت: أسلوبه یدل علی أنه یقصد به الإمام أباحنیفة رحمه الله، فلو کان هذا فهو مما یطعن به. (2)

''علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب بتلاتا ہے کہ شخص ضعیف سے ان کا مقصود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اگر یہ اسی طرح ہے تو وہ اس وجہ سے خود باعثِ طعن ہیں۔''

یہاں دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

اولاً: علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود ضعیف شخص کون ہے؟ علامہ قاسمی صاحب اس میں متردد ہیں مگر حقیقت الامر یہی ہے کہ اس سے مقصود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔ اور یہی ایک مقام نہیں اور مقامات پر بھی علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ اسی مسند الامام ابی حنیفہ (3) میں ایک روایت «من صلی بعد العشاء أربع رکعات...الخ» کے الفاظ سے مذکور ہے۔ علامہ قاسمی نے اس کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ یہ طبرانی کبیر میں ہے اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع (4) میں کہا ہے: «فیه من ضعف الحدیث» یہ روایت طبرانی کبیر (5) اور اوسط (6) میں ہے۔ اس روایت کے سب راوی ثقہ و صدوق ہیں۔ صرف امام صاحب میں کلام ہے علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع (7) میں ایک اور مقام پر بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور کہا ہے:

(1) مجمع الزوائد: 266/7، 268/9 (2) مسند: 182/1، رقم: 124 (3) مسند الإمام أبی حنیفة: 320/1، رقم: 403 (4) مجمع: 231/2 (5) طبرانی کبیر، رقم: 13800 (6) اوسط، رقم: 5235 (7) مجمع: 240-241/2

«فی إسناده ضعیف غیر متهم بالکذب» یہی روایت امام ابونعیم رحمہ اللہ نے بھی مسند ابی حنیفہ[1] میں ذکر کی ہے بلکہ قاضی ابویوسف رحمہ اللہ نے کتاب الآثار[2] اور امام محمد شیبانی رحمہ اللہ نے بھی کتاب الآثار[3] میں اور علامہ خوارزمی رحمہ اللہ نے بھی جامع المسانید[4] میں اسے ذکر کیا ہے۔ امام ابونعیم رحمہ اللہ اور امام طبرانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تنہا محارب بن دثار اور ان سے تنہا ابوحنیفہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں۔

اسی طرح مسند الامام ابی حنیفہ[5] میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: «لقد کن فی خلال سبع...الخ» جسے استاذ حارثی نے «محمد بن الفضل بن عطیة ثنا النعمان بن ثابت عن الشعبی عن عائشة» کی سند سے روایت کیا ہے۔ علامہ قاسمی اس سند کے بارے میں خاموش ہیں، جبکہ محمد بن الفضل کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے «کذبوہ» محدثین نے اسے جھوٹا کہا ہے۔[6] البتہ طبرانی کبیر[7] کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس میں یہ «عبد الله بن بزیع عن أبی حنیفة عن أبی إسحاق الشیبانی عن عامر الشعبی عن مسروق عن عائشة» کی سند سے ہے اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع[8] میں کہا ہے: «فیہ من ضعف» یہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علاوہ عبداللہ بن بزیع بھی ضعیف ہے، اس لیے حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کا اشارہ کس کی جانب ہے۔ تاہم دونوں اسانید میں فرق بالکل نمایاں ہے اور اس کا دارومدار امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر ہے۔

استاذ حارثی نے ایک حدیث «أبو حنیفة عن علقمة بن مرثد عن ابن بریدة عن أبیه» کی سند سے بیان کی ہے۔[9] علامہ قاسمی اس کی تخریج میں فرماتے ہیں

---

[1] مسند أبی حنیفة، رقم: 322 [2] کتاب الآثار، رقم: 414 [3] کتاب الآثار، رقم: 111
[4] جامع المسانید: 395/1 [5] مسند الإمام أبی حنیفة: 301/1، رقم: 370 [6] تقریب: 315
[7] طبرانی کبیر: 30/23، رقم: 75 [8] مجمع: 242/9 [9] 616,617/2، رقم: 995

امام احمد نے مسند[1] میں اس کی تخریج کی ہے اور امام عبداللہ بن احمد نے کہا ہے: والد گرامی امام احمد نے اسے اسی طرح «أخبرنا أبو فلانة» کے الفاظ سے روایت کیا ہے اور عمداً نام نہیں لیا۔ ان کے علاوہ دوسرے شیوخ نے نام لیا ہے اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہا ہے۔ یہی روایت علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع[2] میں ذکر کی ہے اور کہا ہے:

رواه أحمد وفيه ضعف، ومع ضعفه لم يسم.

''اسے احمد نے روایت کیا ہے، اس میں ضعف ہے اور اس ضعف کے ساتھ ساتھ اس کا نام نہیں لیا۔''

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس کا اظہار مسند حارثی[3] کے حاشیے میں کیا گیا ہے۔ امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الکامل میں اسے امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں ذکر کر کے اس کی نکارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔[4] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ محمد بن بشار اسے اسحاق الازرق سے روایت کرتے ہیں تو امام ''ابوحنیفہ'' کا نام لیتے ہیں۔ جیسا کہ اتحاف المھرۃ میں ابویعلی الکبیر سے ہے۔[5] اس سے امام عبداللہ بن احمد کے بیان کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ والد صاحب کے علاوہ دوسرے حضرات نام لیتے ہیں اور ابوحنیفہ کہتے ہیں۔ جس سے علامہ البانی کے اس موقف کی تردید ہوتی ہے کہ نام نہ لینے والے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے استاد اسحاق الازرق ہیں[6] نہیں بلکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

یادش بخیر! اس ناکارہ نے مسند ابی یعلی[7] کے تحت علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کے اسی نوعیت کے کلام کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا اشارہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے، مگر دار القبلۃ کے حنفی نگران نے اس سے اختلاف کیا۔ اس اختلاف کی پوزیشن کیا ہے یہ بحث وسیع الذیل ہے۔ ہمارے اوپر دیئے ہوئے حوالوں سے یہ بات نکھر جاتی ہے کہ علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا نام

---

[1] مسند: 357/5 [2] مجمع: 166/1 [3] مسند الحارثی: 182/1 [4] الکامل 163/10

[5] اتحاد المھرۃ 557/2 رقم: 2242 [6] الصحیحہ 1660

[7] مسند أبی یعلی: 263/2، رقم: 1609

لیے بخیر محولہ مقامات پر جس راوی پر جرح کا انھوں نے اشارہ کیا ہے وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔

ثانیاً: اگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ''ضعیف'' کہنے کے نتیجے میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ خود ''ضعیف'' ہونے کے حق دار ہیں تو یہ جرم تنہا علامہ ہیثمی رحمہ اللہ کا نہیں، امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ جنھوں نے اس کے واسطے سے روایت بیان کی مگر نام تک نہیں لیا۔ اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''ضعف کے باوجود ان کا نام نہیں لیا۔'' تو کیا یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ اس جسارت کے نتیجے میں امام احمد رحمہ اللہ بھی ضعف کے حقدار ٹھہرے ہیں؟ امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ امام عبد اللہ بن مبارک، امام علی بن مدینی، امام بخاری، امام نسائی، ابن حبان، ابو احمد الحاکم، ابن سعد، دارقطنی، ابو اسحاق فزاری، حمیدی، دارمی، ابو حاتم، خطیب بغدادی، ابو عبد الرحمٰن المقرئ وغیرہم متعدد ائمہ محدثین رحمہم اللہ بھی اسی ''جرم'' کی پاداش میں ضعف کے حقدار ہیں؟

علامہ قاسمی کے زاویۂ فکر کو سمجھنے کے لیے یہ چند مثالیں کافی ہیں ہماری ان گزارشات سے یہاں استاذ الحارثی کی تالیف ''مسند الامام ابی حنیفہ'' کی استنادی حیثیت ظاہر ہو جاتی ہے وہاں اس کے محقق کی ''تحقیق انیق'' کا بھرم بھی کھل جاتا ہے۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا فتنہ

اور

اس کا رد

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى اٰله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين. أما بعد!

ہر دل عزیزی اور قبولیتِ عوام کا فتنہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا: ''قبولیتِ عوام ہمیشہ علماء کے لیے سب سے بڑا فتنہ رہی۔'' اس فتنہ میں مبتلا ہو کر بڑے بڑے علماء و مشائخ نے ہر دور میں جادۂ حق سے گریز کی راہ اختیار کی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا جوئی کے برعکس سب کو خوش کرنے کی روش اپنائی اور سنت پر تمسک وتصلب کی بجائے بدعات وخرافات کی تائید وتاکید کی۔ اسی راہ کے راہرو جناب محمد اسحاق صاحب فیصل آبادی ہیں۔ ہم ان کے علم وفضل کے معترف ہیں۔ مگر جس راستہ پر وہ چل نکلے ہیں وہ قطعاً درست نہیں۔ بالخصوص حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے افکار، جو آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے ان کے معتقدین اور مداحین پھیلا رہے ہیں وہ بالکل اہلِ سنت کے نہیں، بلکہ رافضیوں کے ترجمان ہیں۔ بالخصوص حضرت عثمان، حضرت معاویہ

اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کی گفتگو انتہائی لچر اور غلیظ ہے۔ حدیہ کہ صحابہ کرام کی شان کے حوالے سے صحیح احادیث کے انکار اور ان کے ساتھ استہزا سے بھی انھوں نے اجتناب نہیں کیا۔ ان کے جہاد کو بھی انھوں نے جہاد نہیں، فساد اور دنیاداری سے تعبیر کیا، بلکہ بنو امیہ کے دور میں ہونے والی فتوحات کو جرم اور لٹیرا پن قرار دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«یا عثمان إنه لعل الله يقمصك قميصاً فإن أرادوك على خلعه فلا تخلعه لهم.»

''اے عثمان! شاید اللہ تعالیٰ تمھیں ایک قمیص پہنائیں اگر لوگ تم سے وہ قمیص اتروانا چاہیں تو ان کے لیے وہ قمیص نہ اتارنا۔''[1]

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن، امام ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح، امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح الاسناد اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔ جب کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے امام مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔[2] نیز اسے صحیح موارد الظمآن،[3] صحیح ترمذی،[4] اور صحیح ابن ماجہ میں لاکر اسے صحیح قرار دیا ہے۔

اس روایت کے بعض طرق میں یہ تفصیل بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جو انصاری خزرجی صحابی ہیں، نے جب یہ حدیث

---

[1] جامع ترمذی: 3705، ابن ماجه، رقم: 112، ابن أبی شيبة: 12/48، 15/201، مسند امام احمد: 6/75,86,114,149، صحیح ابن حبان، رقم: 6876، موارد الظمآن: 2196، المستدرك للحاکم: 3/99,100، الأوسط للطبرانی، رقم: 2854، السنة لابن أبی عاصم: 1172,1173,1174,1176,1178,1179، فضائل الصحابة لأحمد: 1/613، تاریخ المدينة لعمر بن شبّة: 3/1069، مسند الشاميين، رقم: 1234,1934، السنة للخلال، رقم: 418

[2] ظلال الجنة: 2/559 [3] موارد الظمآن، رقم: 1842 [4] صحيح ترمذی: 2926

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنی تو فرمایا: اے ام المومنین رضی اللہ عنہا! جب یہ نزاع چل رہی تھی تب یہ روایت آپ کو یاد نہ آئی اور لوگوں کو کیوں نہ بتلائی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نسیتہ واللہ ''اللہ کی قسم! ان دنوں میں یہ روایت بھول گئی تھی۔'' یہ الفاظ بھی مسند احمد، کتاب السنہ لابن ابی عاصم، ابن ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ اس روایت کے بارے میں خبیر سے مولانا اسحاق صاحب سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا: ''یہ سب راویوں کی بناوٹی باتیں ہیں۔''

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ روایت تنہا حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی نہیں، بلکہ ابو سہلہ مولی عثمان براہِ راست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کرتے ہیں کہ جن ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ تھا تو انھیں کہا گیا کہ آپ باہر نکل کر ان کے خلاف قتال کیوں نہیں کرتے تو انھوں نے فرمایا:

إن رسول الله ﷺ عهد إلى عهداً وأنا صابر عليه.

''کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا اور میں اس پر صبر کرتا ہوں۔''

اس عہد سے مراد بھی یہی قمیص خلافت کو نہ اتارنے کا عہد تھا۔ اور یہ روایت کتاب السنہ لابن ابی عاصم [1] مسند امام احمد [2] ابن ماجہ [3] اور ابن سعد [4] میں صحیح سند سے منقول ہے۔

علامہ البانی نے فرمایا ہے:

إسناده صحيح. [5]

لہٰذا اس روایت کا انکار اور استہزا کوئی اہلِ حدیث واہلِ سنت تو نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ استہزائی انداز کسی رافضی سے کوئی بعید نہیں۔

مزید برآں اس روایت کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں:

---

[1] كتاب السنة لابن أبى عاصم، رقم: 1175 [2] مسند الإمام احمد: 58,69/1 [3] ابن ماجه، رقم: 113 [4] ابن سعد: 66/3 [5] ظلال الجنة: 560/2

إن كساك الله ثوبا فأراد المنافقون أن تخلعه فلا تخلعه.

"کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمھیں لباسِ خلافت عطا فرمائیں اور منافق اسے تم سے اتروانا چاہیں تو اس لباس کو نہ اتارنا۔"

یہ الفاظ مسند امام احمد[1] السنۃ لابن ابی عاصم[2] فضائل الصحابۃ للامام احمد[3] مسند الشامیین[4] تاریخ المدینۃ[5] مستدرک[6] ابن ماجہ میں مختلف اسانید سے مروی ہیں۔ جن میں سے بعض اسانید صحیح اور جید ہیں۔ ان الفاظ سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لباسِ خلافت کے اتارنے سے منع فرمایا، بلکہ ان کے خلاف یہ اقدام کرنے والوں کی مذمت فرمائی اور انھیں منافق قرار دیا۔

لیکن محترم مولانا محمد اسحاق صاحب تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یورش کرنے والوں کو جلیل القدر انصاری صحابی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"تم فسادی کہتے ہو، ان سے بڑا ولی کوئی ہوا ہے؟ یہ صاحبِ کرامت لوگ تھے، انصاری صحابی نے دروازہ کھولا کہ کام نہیں بنتا تو ادھر سے آؤ۔ محاصرہ کرنے والے بیعت رضوان والے تھے۔ انصار قبرستان کے آگے کھڑے ہو گئے کہ یہاں دفن کیا تو نکال باہر پھینک دیں گے۔ وہ شہادت جس پر صحابہ ناراض ہوں وہ شہادت ہے؟"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں کوئی صحابی رضی اللہ عنہ ملوث نہیں

حالانکہ امرِ واقع یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کوئی جلیل القدر صحابی تو کجا صغار صحابہ میں سے بھی کسی کا بالفعل اس میں ملوث ہونا ثابت نہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ،

---

(1) مسند الإمام احمد: 75,87/1، رقم: 24466,24566 (2) السنة لابن أبي عاصم: 561/2، رقم: 1178 (3) فضائل الصحابه للإمام احمد: 613/1، رقم: 816 (4) مسند الشاميين، رقم: 1234 (5) تاريخ المدينة: 1067,1069/3 (6) مستدرك: 110/3

جواس سانحہ کے وقت مدینہ طیبہ میں تھے، سے پوچھا گیا کہ

أكان فيمن قتل عثمان أحد من المهاجرين والأنصار؟ قال: لا، كانوا علاجا من أهل مصر. ①

''کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں مہاجرین اور انصار میں سے کوئی فرد شامل تھا؟ انھوں نے فرمایا: نہیں، وہ مصر کے اکھڑ مزاج نوجوان تھے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی امام ابن عساکر رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو بلوائی گھر میں داخل ہوئے۔ ليس فيهم أحد من الصحابة ولا أبناء هم إلا محمد ابن أبي بكر. ②

ان میں کوئی بھی صحابی نہیں تھا اور سوائے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے، صحابہ کرام کی اولاد میں سے بھی کوئی نہیں تھا۔ یہی بات امام نووی نے شرح مسلم ③ میں کہی ہے۔

کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا شریک ہونا تو کجا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے اس کی تحسین اور تائید بھی ثابت نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صاف صاف لکھا ہے:

وأما ما يذكره بعض الناس من أن بعض الصحابة أسلمه ورضي بقتله فهذا لا يصح عن أحد من الصحابة أنه رضي بقتل عثمان رضي الله عنه، بل كلهم كرهه ومقته وسب من فعله. الخ ④

''بعض لوگ جو یہ ذکر کرتے ہیں کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو تسلیم کیا اور ان کے قتل میں وہ راضی تھے۔ تو کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح طور پر ثابت نہیں کہ وہ ان کے قتل پر راضی ہوا ہو، بلکہ سب صحابہ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کی مذمت کی اور یہ اقدام کرنے والوں کو ملعون قرار دیا۔''

---

① تاریخ خلیفہ: 176 ② البدایہ: 185/7 ③ شرح مسلم: 272/2 ④ البدایہ: 198/7

یہی بات علامہ صلاح الدین خلیل العلائی نے «تحقیق منیف الرتبة لمن ثبت له شریف الصحبة» [1] میں کہی ہے۔ ''منہاج الکرامہ'' کے رافضی مصنف ابن المطہر الحلی نے کہا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور جب ان کے قتل کی خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ملی تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیا، مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أين النقل الثابت عن عائشة بذلك [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ کہاں ثابت ہے؟ فرماتے ہیں: ان سے تو یہ منقول ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر انکار کیا، اس کی مذمت کی۔ بلوائیوں نے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب خط کا دعوی کیا کہ ہمیں یہاں آنے کی انھوں نے دعوت دی ہے جس کی سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سخت الفاظ میں تردید کی بلکہ قاتلینِ عثمان پر لعنت کی۔

علامہ ابن امیر الحاج نے علامہ السبکی سے نقل کیا ہے کہ

حمى الله الصحابة من مباشرة قتله، فالمتولي قتله كان شيطاناً مريداً، ثم لا نحفظ عن أحد منهم الرضابقتله، إنما المحفوظ الثابت عن كل منهم إنكار ذلك. [3]

''اللہ تعالیٰ نے براہِ راست صحابۂ کرام کو ان کے قتل سے محفوظ رکھا۔ ان کو شہید کرنے والا سرکش شیطان تھا۔ کسی صحابی سے ان کے قتل پر رضا مندی ثابت نہیں، بلکہ محفوظ سند سے ان میں سے ہر ایک صحابی سے اس پر انکار ثابت ہے۔''

بلکہ دکتور محمد بن عبداللہ الصبحی نے تو کہا ہے کہ اس فتنہ میں کسی صحابی کا شامل ہونا صحیح سند سے ثابت نہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

---

[1] تحقیق منیف الرتبة لمن ثبت له شریف الصحبة: 65,88 [2] منهاج السنه: 188/2

[3] التقریر والتحبیر: 260/2

إنه لم يشترك في التحريض على عثمان رضى الله عنه فضلًا عن قتله أحد من الصحابة رضى الله عنهم ، و إن كل ماروى في ذلك ضعيف الإسناد. ①

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کوئی صحابیِ شریک نہیں ہوا، چہ جائیکہ کوئی ان کے قتل میں شریک ہوا ہو اور جو اس بارے میں صحابہ کی شراکت بیان کی جاتی ہے ان کی تمام اسانید ضعیف ہیں۔''

دکتور محمد بن عبداللہ الصبحی کی یہ کتاب اسی حوالے سے تمام مرویات کے دراسہ پر مشتمل ہے۔ جو الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں بھی انھوں نے لکھا ہے:

مما أظهر لى أن هذه الفتنة لا تعد مما شجر بين الصحابة رضى الله عنهم وأرضاهم، إنما هى مما شجر بين الصحابة وأناس ليسوا من الصحابة، كما أوضحت موقف الصحابة الحقيقى تجاه عثمان رضى الله عنه وقتله، وأن أحداً من الصحابة لم يشترك فى التحريض عليه، فضلًا عن قتله ولم يخرج أحد من الصحابة عليه. ②

''جو چیز میرے لیے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ یہ فتنہ مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار نہ کیا جائے، بلکہ یہ اختلاف صحابہ اور ان لوگوں کے مابین ہوا جو صحابہ نہیں تھے۔ جیسا کہ میں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حقیقی موقف کی وضاحت کی ہے جو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے اور ان کی شہادت پر ظاہر کیا ہے۔ اور کوئی صحابی بھی ان کے

① فتنه قتل عثمان بن عفان: 289/1 ② أيضاً: 14/1

خلاف رغبت دلانے میں شریک نہیں۔ چہ جائیکہ ان کے قتل میں شریک ہو اور کسی صحابی نے ان کے خلاف خروج نہیں کیا۔"

لہٰذا تاریخ کی کتابوں میں جو بعض جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس فتنہ میں شمولیت کا ذکر ہے وہ تمام ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اسانید پر مبنی ہے۔ بالفرض بعض صحابہ اگر فتنہ پردازوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے تو یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف رأس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی سے بعض مخلص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی متاثر ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے قتل میں قطعاً کوئی صحابی شریک نہ تھا۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ حملہ آوروں میں وہ بھی شریک تھے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استفسار پر خود انھوں نے فرمایا:

واللہ ماقتلتہ ولا أمسکتہ.[1]

"اللہ کی قسم! میں نے نہ انھیں قتل کیا ہے نہ ہی پکڑا ہے۔"

حافظ ابن کثیر نے بھی لکھا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے بات کی تو وہ شرمندہ ہو کر منہ ڈھانپ کر پیچھے ہٹ گئے۔[2]

کنانہ مولیٰ صفیہ رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا ہے:

معاذ اللہ أن یکون قتلہ إنما دخل علیہ.[3]

"کہ اللہ کی پناہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے عثمان کو قتل کیا ہو وہ ان کے گھر داخل ہوئے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے بات کی تو وہ گھر سے نکل گئے۔"

بعض غیر معروف راویوں نے اس میں بھی بڑی رنگ آمیزی کی مگر یہاں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اکابر صحابہ اور انصار اس میں شامل تھے، قطعاً درست

---

[1] تاریخ الإسلام للذہبی: 460/1 وغیرہ [2] البدایہ: 185/7 [3] الاستیعاب: 160/3، تاریخ خلیفہ بن خیاط: 174

نہیں، بلکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تقریباً سات سو مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنی مدافعت میں لڑنے سے روک دیا۔ (1)

انھی میں حضرت عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ، حسن بن علی، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر، مغیرہ بن شعبہ، حارثہ بن نعمان، کعب بن مالک، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ کا ذکر نام بنام کتبِ تاریخ میں موجود ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روکنے کے باوجود حضرت زیاد بن نعیم فہری اور مغیرہ بن الاخنس اور کچھ دیگر حضرات فتنہ پردازوں سے مڈھ بھیڑ میں شہید ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم وغیرہ شدید زخمی ہوگئے۔ ام المؤمنین صفیہ رضی اللہ عنہا سواری پر آئیں تو اشتر نخعی نے ان کی سواری کو مارا اور وہ گرتے گرتے بچیں اور فرمایا مجھے واپس لے چلو، اس کتے کے ہاتھوں مجھے ذلیل نہ کرو۔ (2)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل کون تھا؟ اس سلسلہ میں مؤرخین نے مختلف نام ذکر کیے ہیں، مگر ان میں صحیح روایات کے مطابق سیاہ رنگ کا مصری شخص تھا جس نے انھیں قتل کیا۔ إنه رجل أسود من أهل مصر.

دکتور محمد بن عبداللہ الصبحی نے بھی اس کی تصویب کی ہے اور باقی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (3) المستدرک (4) اور تاریخ المدینۃ لابن شبہ (5) وغیرہ میں جبل بن ایھم مصری کو قاتل قرار دیا گیا ہے۔

ان فتنہ پردازوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید ہی نہیں کیا ان کے گھر کا مال ومتاع بھی لوٹ کر لے گئے، بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کے گھروں میں بھی غارت گری کی۔ (6)

---

(1) البدایہ: 181،188/7 (2) ابن سعد: 128/8، التاریخ الکبیر للامام البخاری: 227/7 وغیرہ (3) فتنہ مقتل عثمان: 251،255 (4) المستدرک: 102/3 (5) تاریخ المدینۃ لابن شبہ: 1308/4 (6) المنتظم: 59/5 وغیرہ

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہمنوا تھے اس لیے یہ تاثر سراسر غلط ہے کہ قاتلینِ عثمان فسادی نہیں بڑے ولی تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے ہم رکاب تھے۔

اسی طرح یہ کہنا بھی بالکل باطل ہے کہ ''انصار قبرستان کے آگے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ یہاں دفن کیا تو باہر پھینک دیں گے۔'' امام طبری رحمہ اللہ نے اس قسم کی باتیں واقدی جیسے ضعیف، بلکہ متروک سے نقل کی ہیں۔[1] بلکہ یہ جسارت کرنے والے بھی بدنصیب فتنہ پرداز ہی تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا تبصرہ یوں ہے:

وقد عارضه بعض الخوارج وأرادوا رجمه وإلقاءه عن سريره، عزموا على أن يدفن بمقبرة اليهود بدير سلع حتى بعث علي رضي الله عنه إليهم من نهاهم عن ذلك.[2]

''اور بعض خوارج، یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کرنے والے، آڑے آئے، ان کے جنازہ پر سنگ باری کرنا چاہی اور چارپائی سے جنازہ نیچے گرانے کی کوشش کی اور کہا کہ انھیں یہود کے مقبرہ میں سلع کے کنویں کے پاس دفن کیا جائے، تا آنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بھیجا اور اس نے انھیں اس (بیہودگی) سے روکا۔''

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے:

فلما سمع من قصد بذلك قعدوا له في الطريق بالحجارة.[3]

''جب (ان کے دفن کا) سنا تو جنھوں نے ان کی مخالفت کی تھی وہ راستے میں پتھر لے کر بیٹھ گئے۔''

اس لیے اس بیہودگی کا ارتکاب بھی انھی مفسدین نے کیا تھا۔ انصار صحابہ کرام میں سے

---

[1] تاریخ طبری: 143,144/5 [2] البدایہ: 191/7 [3] الکامل: 18/3

کوئی اس میں ملوث نہ تھا۔ متقدمین کی وضاحت کے علی الرغم انھیں انصارِ صحابہ قرار دینا تجاہلِ عارفانہ ہے یا پھر یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض و عداوت کا شاخسانہ ہے۔ أعاذنا اللہ منہ

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ علامہ ابن عبدالبر کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بقیع میں دفن ہونے سے روکنے والوں میں ایک اسلم بن بجرہ انصاری تھے۔ ①

اولاً: عرض ہے کہ حافظ ابن عبدالبر نے کس سند سے اسلم بن بجرہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بقیع میں دفن کرنے سے روکتے تھے؟ البتہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تاریخ ② میں ان کا اور ابو حیہ مازنی کا نام واقدی کی سند سے ہی ذکر کیا ہے۔ اور وہ ضعیف، بلکہ متروک ہے۔

ثانیاً: حافظ ابن عبدالبر نے تو کہا ہے «فی صحبتہ نظر» اس کا صحابی ہونا محلِ نظر ہے۔ ③

اور اس کی وضاحت بھی انھوں نے کر دی کہ جس روایت سے اس کا صحابی ہونا ثابت ہوتا ہے ''اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس کا مدار اسحاق بن ابی فروہ پر ہے۔'' اور وہ متروک ہے۔ ثبوتِ صحبت کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبرانی صغیر ④ سے بھی ایک روایت ذکر کی ہے، مگر اس کی سند بھی درست نہیں کیونکہ سند میں عبداللہ بن عمر الفہری اس کا استاد محمد بن ابراہیم، اس کا استاد یعنی محمد کا باپ ابراہیم بن محمد کا کہیں ترجمہ نہیں ملتا ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اسے مجمع الزوائد ⑤ میں ذکر کیا اور فرمایا: « فیہ جماعۃ لم أعرفھم » اس میں ایک جماعت ہے جنھیں میں نہیں جانتا۔ اس لیے اسلم بن بجرہ کا تو قابلِ اعتبار سند سے صحابی ہونا ہی محلِ نظر ہے جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ لہٰذا اسے انصار صحابہ میں ذکر کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفن میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں میں شمار کرنے کی حیثیت

---

① الإصابۃ: 36/1 ② تاریخ: 144/5 ③ الإصابۃ: 36/1، الاستیعاب: 179/1 ④ طبرانی صغیر: 66/1 ⑤ مجمع الزوائد: 141/6

ہی کیا رہ جاتی ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مزید عمر بن شبہ کی تاریخ المدینہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ مخلد بن خفاف نے حضرت عروہ سے نقل کیا ہے کہ اسلم ان لوگوں میں شامل تھے، جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بقیع میں دفن ہونے سے منع کیا۔ ①

مگر تاریخ المدینۃ لابن شبہ ② میں یہ «ابی دینار أحد بنی دینار ۔ ابن النجار» کی سند سے ہے جس کا ترجمہ تتبع بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس کا استاد ''محمد بن خفاف'' ہے۔ مگر الاصابہ میں یہ مخلد بن خفاف ہے۔

ثانیاً: مخلد بن خفاف کو تو خود انھوں نے تقریب ③ میں مقبول کہا ہے اور انھوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ مقبول تب ہے جب اس کی متابعت ہو ورنہ وہ کمزور ہوتا ہے۔ ④

ابن شبہ کی ایک روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے ابن بجرہ بقیع میں دفن کرنے سے روکنے والے تھے مگر اس میں ''رجل'' مبہم و مجہول ہے اور یہ ہے بھی مرسل اس لیے کسی قابلِ اعتبار سند سے اس کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ اسلم کا صحابی ہونا ہی کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت جبلہ رضی اللہ عنہ بن عمرو انصاری کے بارے میں عمر بن شبہ کے حوالے سے لکھا ہے وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بقیع میں دفن ہونے سے روکتے تھے۔ ⑤

مگر افسوس کہ اس کی بھی سند درست نہیں ہے یہ قصہ «بعض أهل المدينة» کے واسطہ سے ہے اور وہ مبہم و مجہول ہے۔ اس لیے جب تک کسی قابلِ ذکر سند سے اس کا ثبوت نہ ہو، تب تک انھیں اس میں ملوث کرنا درست نہیں۔ محض کسی کا نقل کر دینا ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے واقدی کی سند سے حضرت جبلہ رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ سب سے پہلے اعتراض کرنے والوں میں نام لیا ہے۔ اور امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے بھی اسے «قیل» سے حکایت کیا ہے۔ ⑥

---

① الاصابہ ② تاریخ المدینۃ لابن شبہ: 1240/4 ③ تقریب: 331

④ مقدمۃ التقریب ⑤ الإصابہ: 332/1 ⑥ الکامل: 168/3

مگر بقیع میں دفن کے حوالے سے انھوں نے بھی کوئی بات ذکر نہیں کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہیں

اسی طرح یہ کہنا کہ ''وہ شہادت جس پر صحابہ ناراض ہوں وہ شہادت ہے؟'' یہ جملہ بھی انتہائی خبثِ باطن کا مظہر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی پیش گوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی پیش گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد پہاڑ پر چڑھے، آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم تھے۔ احد کانپنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اثبت أحد فإنما عليك نبي وصديق وشهيدان.

''احد ٹھہر جاؤ، تمھارے اوپر تو نبی ہے، صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔''

یہ روایت صحیح بخاری [1] وغیرہ متعدد کتبِ حدیث میں منقول ہے۔ یہی روایت کچھ اختلاف سے حضرت ابو ہریرہ، بریدہ بن الحصیب، سعید بن زید رضی اللہ عنہم بلکہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے انھوں نے محصور ہونے کے ایام میں بیان فرمایا تھا۔ بعض روایات میں حراء پہاڑ پر کھڑے ہونے کا ذکر ہے اور ان میں حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت علی، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ذکر ہے۔ جس کی تفصیل سلسلۃ الصحیحہ [2] میں دیکھی جا سکتی ہے۔ غور فرمایئے جسے لسانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے شہادت کی بشارت ملے ان کی شہادت کا انکار، حدیث کا انکار اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض وعداوت کا مظہر نہیں؟ اور یہ ساری کارروائی روافض کی ہمنوائی نہیں؟

بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عداوت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قاتلینِ عثمان ''صاحبِ کرامات ولی تھے'' اللہ، اللہ! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے، ان کے گھر کو لوٹنے والے

[1] بخاری، رقم: 3699 [2] سلسلة الصحيحه، رقم: 785

بھی ''صاحب کرامات ولی'' ٹھہرے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مستجاب الدعوات مشہور تھے، کو جب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ہوئی تو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں رحمت کی دعا کی اور قاتلین کے بارے میں یہ آیت پڑھ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ [1]

''کہہ دو کہ ہم تمھیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے فرمایا:

''اے اللہ! انھیں شرمسار کرو پھر انھیں اپنی گرفت میں لے لو۔''

چنانچہ اسی طرح ہوا قاتلینِ عثمان خود قتل ہوئے یا دیوانے اور پاگل ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ [2]

مگر خطیبِ جہال خانوانہ اور مفتی فتاویٰ آن لائن محمد اسحٰق صاحب کو وہ ''صاحبِ کرامات ولی'' نظر آتے ہیں۔ سید التابعین حضرت ابو مسلم خولانی نے قاتلینِ عثمان سے فرمایا تھا:

''تمھارا حشر وہی ہوگا جو قوم ثمود کا ہوا تھا کیونکہ خلیفہ کی عزت و تکریم اللہ کی اونٹنی سے زیادہ ہے۔'' [3]

ہم یہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کے تاثرات کی تفصیل مناسب نہیں سمجھتے کہ یہ مجالہ اس کا متحمل نہیں، اور نہ ہی یہ تفصیلات جمع کرنا ہمارا مقصد ہے۔

---

[1] الكهف: 103,104 [2] البداية: 189/7 [3] البداية: 197/7

یہ ''صاحب کرامات ولی'' وہ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں ہمارے ساتھ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نکلو۔ عثمان رضی اللہ عنہ کا خون حلال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انکار کر دیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

فلم كتبت إلينا؟ قال: لا والله ما كتبت إليكم كتاباً قط، قال فنظر بعضهم إلى بعض، ثم قال بعضهم لبعض لهذا تقاتلون أو لهذا تغضبون، فانطلق علي رضي الله عنه فخرج من المدينة إلى قرية.

''آپ نے ہمیں خط کیوں لکھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم میں نے کبھی آپ کی طرف خط نہیں لکھا۔ وہ حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور کہتے ہیں اس (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے لیے تم لڑتے ہو اس کے لیے تم آگ بگولا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ چھوڑ کر کسی بستی کی طرف نکل گئے۔''

غور فرمایئے! مفسدین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں ''آپ نے خط لکھ کر ہمیں یہاں بلوایا ہے۔'' مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کا قطعاً انکار کرتے ہیں۔ یہ ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی کرنے والے ''صاحبِ کرامات ولی''۔ یہ وہی حضرات ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے سواری پر جاتے ہوئے ایک شخص کو پکڑا جس کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خط تھا اور ان کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جس میں عاملِ مصر کو لکھا تھا کہ ان آنے والوں کو قتل کر دو اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس خط سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور فرمایا: اللہ کی قسم میں نے یہ خط نہیں لکھا نہ ہی لکھوایا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں مجھے کچھ علم ہے۔ مگر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حلفیہ بیان پر یقین نہیں کرتے بالکل اسی طرح جس طرح انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اور اسی تناظر میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیتے ہیں۔ یہ ہیں ''صاحبِ کرامت ولی'' سبحان

اللہ۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خط کی اس پلاننگ سے لوگوں کو ان کے مکروفریب کا پتہ چل گیا۔ ①

یہ وہی ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کرتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دیوار پر سے ان سے بات کرنے کے لیے انھیں السلام علیکم کہتے ہیں۔ حضرت ابوسعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ان کی طرف سے سلام کا جواب کسی سے نہیں سنا آہستہ سے کسی نے دیا ہو تو علیحدہ بات ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے بئر رومہ کو اپنے مال سے خرید کر لوگوں کے لیے وقف کیا، مگر آج تم مجھے اس میٹھے کنویں سے روزہ افطار کرنے کے لیے بھی پانی نہیں لینے دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے زمین خرید کر مسجد نبوی کے لیے وقف کی، کیا کبھی کسی کو وہاں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا؟ مگر ظلم کی یہ داستان تو حضرت مفتی محمد اسحاق صاحب تسلیم ہی نہیں کرتے، بلکہ فرماتے ہیں کہ نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ اور دوسرے مظالم جو تاریخی روایات میں ہیں بالکل جھوٹ اور وضعی ہیں، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

غور فرمایئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم وستم کی یہ داستان تو جھوٹی قرار پائے۔ مگر قاتلینِ عثمان اور خارجین صاحبِ کرامت ولی ٹھہریں۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار

یہ ساری تفصیل بیان کرکے بالآخر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فعلمت أن أعداء اللہ لم یریدوا إلا الدنیا.

''میں نے جان لیا کہ اللہ کے ان دشمنوں کا مطمحِ نظر دنیا تھا۔''

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی یہ روایت صحیح سند سے مصنف ابن ابی شیبہ ② فضائل الصحابہ للإمام احمد ③ الاحسان یعنی صحیح ابن حبان ④ میں ہے اور مسند اسحاق بن راھویہ سے یہی روایت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے المطالب العالیہ ⑤ میں نقل کی اور فرمایا: «رجالہ ثقات

---

① تاریخ اسلام: 440/1 ② مصنف ابن أبی شیبة: 215,230/15 ③ فضائل الصحابة للإمام أحمد: 574/1 ④ ابن حبان: 36/9، رقم: 6880 ⑤ المطالب العالیة، رقم: 4372

سمع بعضهم من بعض" کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور راویوں نے ایک دوسرے سے سنا ہے یعنی سند متصل ہے۔ یہی بات علامہ البوصیری نے بھی اتحاف الخیرۃ[1] میں کہی ہے۔ علامہ الہیثمی رحمہ اللہ نے یہ روایت بحوالہ البزار نقل کی اور فرمایا کہ اس کے سب راوی صحیح بخاری کے ہیں سوائے ابوسعید مولی ابن سعید کے اور وہ ثقہ ہے۔[2]

یہی روایت تاریخ المدینہ لابن شبہ، تاریخ خلیفہ بن خیاط اور طبری وغیرہ میں متفرق طور پر منقول ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی نوعیت کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب جھوٹے مکتوبات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ خط بھی جھوٹ کا پلندہ تھا۔ انھوں نے نہ لکھنے کا حکم دیا اور نہ ہی انھیں اس بارے میں کچھ علم تھا ان کے الفاظ ہیں:

وهكذا زور هذا الكتاب على عثمان أيضاً فإنه لم يأمر به ولم يعلم به أيضاً.[3]

دراصل انھی جھوٹے فتنہ پردازوں (جو لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے منافق اور حضرت ابوسعید کے فرمان میں دنیا پرست تھے) کی سازشوں میں کچھ نیک دل حضرات بھی پھنس گئے۔ بالآخر انھی شرپسندوں نے اپنے ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ خون سے رنگے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند حسن، امام حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

عمل أمير المؤمنين عثمان بن عفان ثنتي عشرة سنة لا ينكرون عن إمارته شيئاً حتى جاء فسقة فداهن والله في أمره أهل المدينة.[4]

---

[1] إتحاف الخيرة: 10/8 [2] المجمع: 228/7 [3] البدايه: 175/7، نیز دیکھیں: 195/7

[4] التاریخ الاوسط: 460/1، رقم: 194 یہی کتاب پہلے التاریخ الصغیر کے نام سے طبع ہوتی رہی ہے اس کے ہندی نسخہ کے صفحہ (۸۴) پر بھی یہ قول منقول ہے۔

''امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارہ سالہ دورِ خلافت میں ان کی امارت پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا تھا تا آنکہ فاسق آئے، اللہ کی قسم اہلِ مدینہ نے ان کے بارے میں مداہنت کی۔''

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے انھی کو ''خوارج مفسدون فی الارض'' کہا۔ ①

ابن عمار نے انھیں «أراذل من أوباش القبائل» کہا۔ ②

یہی کچھ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں شرح مسلم ③ میں کہا۔ مگر ہمارے مہربان فرماتے ہیں وہ صاحبِ کرامت ولی تھے۔ سبحان اللہ

بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

لقد عابوا على عثمان رضي الله عنه أشياء، لو فعل بها عمر ما عابوها عليه. ④

''لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کچھ باتوں کی بنا پر عیب لگایا۔ اگر وہی باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کرتے تو وہ ان پر اعتراض نہ کرتے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ہی کی کیا بات، اس حوالے سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وضاحت کر دی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تدور رحى الإسلام على رأس خمس وثلاثين أو ست وثلاثين أو سبع وثلاثين (الحديث)

''اسلام کی چکی ۳۵ سال یا ۳۶ سال یا ۳۷ سال تک چلتی رہے گی۔''

یہ حدیث ابوداود مع العون ⑤ مسند امام احمد ⑥ المستدرک ⑦ اور شرح السنہ ⑧ وغیرہ

---

① منہاج السنة: 189/3 ② شذرات: 40/1 ③ شرح مسلم: 272/2 ④ الشريعة للآجري: 1977/4، الاستيعاب: 157/3 ⑤ ابوداود مع العون: 159/4 ⑥ مسند امام احمد: 390,393/1 ⑦ المستدرك: 114/3، 521/4 ⑧ شرح السنہ: 18/15

کتبِ احادیث میں صحیح سند سے مروی ہے۔ شیخ البانی نے بھی السلسلۃ الصحیحہ [1] میں اسے ذکر کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حادثہ فاجعہ ۳۵ھ میں رونما ہوا۔ اس مدت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ اسلام کی چکی چلتی رہے گی۔ مگر طاعنینِ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اس سے اتفاق نہیں، انھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام کی چکی رکتی اور احکامِ اسلام میں رخنہ اندازی نظر آتی ہے۔

یہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک اسلام کی سربلندی کا ذکر فرمایا، بلکہ انھیں عبائے خلافت نہ اتارنے کی تلقین کی، اور ان کے موقف کو مبنی برحق اور مخالفین کو منافق قرار دیا، اور اس فتنہ سے بچنے والے خوش نصیبوں کو نجات کی بشارت بھی دی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حوالہ سے بسند صحیح مروی ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من نجا من ثلاث فقد نجا۔ ثلاث مرات۔ موتی، والدجال، وقتل خلیفة مصطبر بالحق یعطیه. [2]

''کہ جو تین چیزوں سے بچ گیا اس نے نجات پائی۔ یہ بات آپ نے تین بار ارشاد فرمائی، ایک میری موت (پر فتنہ ارتداد) دوسرا دجال (کا فتنہ) تیسرا حق ادا کرنے اور اس پر قائم رہنے والے خلیفہ کے قتل کا فتنہ۔''

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں حق پر قائم رہنے والے جس خلیفہ کے قتل کی طرف اشارہ ہے اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مراد ہیں اور محدثین کرام نے اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب میں ذکر کیا ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خلیفہ برحق کے قتل سے بچنے والوں کو فتنہ ارتداد اور فتنہ دجال سے بچنے والے خوش نصیبوں میں قرار دیتے ہیں اور انھیں نجات کی بشارت دیتے ہیں۔ مگر صد افسوس کہ اس کے بالکل برعکس بتلانے والے

[1] السلسلة الصحيحة، رقم: 976 [2] مسند احمد: 33,228/5، 105,109,110/4، السنة لابن أبي عاصم، رقم: 1177، المستدرك: 101/3، ابن أبي شيبه: 135/15، دلائل النبوة: 393/6، مجمع الزوائد: 334/7

بتلاتے ہیں اور برسرِ منبر ومحراب بتلاتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اِن اِن غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ان کے خلاف اقدام کرنے والے صاحبِ کرامت ولی اور جلیل القدر صحابی تھے۔ انصار صحابہ نے انھیں جنت البقیع میں دفن نہ ہونے دیا۔ ﴿ كبرت كلمة تخرج من أفواههم....وما تخفى صدورهم أكبر﴾

رہے وہ اعتراضات جو مفسدین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر عائد کیے تھے ان تمام کے جوابات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیئے۔ جن کی تفصیل البدایہ [1] وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مولانا مودودی نے خلافت وملوکیت میں بھی ان اعتراضات کو نقل کیا ہے۔ روافض اور جماعتِ اسلامی سے وابستہ حضرات کے علاوہ ملک کے تمام مسالک سے وابستہ علمائے کرام نے ان کی اس ''تحقیقی کاوش'' سے اختلاف کیا اور اس کے جواب میں متعدد کتابیں لکھیں۔

اسی خلافت وملوکیت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

''ان کی شکایات میں سے اگر کوئی شکایت وزنی تھی تو صرف وہی جس کا اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں۔'' [2]

یہ شکایات کس قدر ''وزنی'' تھیں۔ اس حوالے سے خود انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن صاف کی۔ مدینے کے مہاجرین وانصار بھی، جو دراصل اس وقت مملکتِ اسلامیہ میں اہلِ حل وعقد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے ہمنوا بننے کے لیے تیار نہ ہوئے، مگر یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انھوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا۔'' [3]

نیز لکھتے ہیں:

---

[1] البدایہ: 7/171 [2] خلافت وملوکیت: 118 [3] خلافت وملوکیت: 117

”پھر انھوں نے اس زیادتی پر بھی بس نہ کی، بلکہ تمام شرعی حدود سے تجاوز کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا اور ان کا گھر لوٹ لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جن کاموں کو وہ اپنے نزدیک گناہ سمجھتے تھے وہ اگر گناہ تھے بھی تو شریعت کی رو سے کوئی شخص انھیں ایسا گناہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس پر کسی مسلمان کا خون حلال ہو جائے...... جو لوگ شریعت کا نام لے کر ان پر معترض تھے انھوں نے خود شریعت کا کوئی لحاظ نہ کیا اور ان کا خون ہی نہیں، ان کا مال بھی اپنے اوپر حلال کر لیا۔“ (1)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اس اقدام پر اہلِ مدینہ کی رائے کے حوالے سے بھی مولانا مودودی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”اس مقام پر کسی شخص کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اہلِ مدینہ ان لوگوں کے اس فعل پر راضی تھے.... مدینہ والوں کے لیے تو یہ انتہائی غیر متوقع حادثہ تھا جو بجلی کی طرح ان پر گرا اور بعد میں وہ اس پر سخت نادم ہوئے کہ ہم نے مدافعت میں اتنی تقصیر کیوں کی۔“ (2)

”شریعت“ کے نام سے فتنہ گروں نے جو فتنہ اٹھایا خود ان کی ”شریعت پابندی“ ان اقتباسات سے واضح ہو جاتی ہے اور مدینہ طیبہ کے مہاجرین و انصار کا موقف بھی اس سے سمجھا جا سکتا ہے آج بھی ان حقائق کے برعکس شریعت ہی کی پابندی کے حوالے سے یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شریعت کی مخالفت کی تھی اور ان کے خلاف یہ اقدام کرنے والے جلیل القدر صحابہ تھے اور وہ ان کے قتل پر معاذ اللہ خوش تھے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات و اعتراضات جو ان فتنہ پردازوں نے اٹھائے تھے اور ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا جواب دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن صاف کر دی تھی“ انھی اعتراضات کو دوبارہ اٹھانا اور اپنی چرب زبانی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو موردِ طعن بنانا کیا انھی فتنہ

---

(1) ایضاً: 119 (2) ایضاً: 120

پروازوں کی ہمنوائی نہیں؟ جو شریعت کے نام پر شریعت کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ اعاذنا اللہ منہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حق پر تھے

معترضین کے اعتراضات کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یا خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ بھی کی ہوتی تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بعد کسی سچے مسلمان کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے دور میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برحق قرار دیا۔ چنانچہ حضرت مرۃ بن کعب رضی اللہ عنہ (اور بعض نے کعب بن مرۃ رضی اللہ عنہ نام لیا ہے) فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہدِ قریب میں فتنوں کا ذکر کیا تو ایک شخص چادر میں لپٹا ہوا سامنے سے گزرا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هذا يومئذ على الهدى» ''یہ فتنہ کے دنوں میں ہدایت پر ہو گا۔'' اور بعض طرق میں ہے کہ ''یہ اور ان کے ہمنوا ہدایت پر ہوں گے۔'' حضرت مرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اس شخص کی طرف لپکا تو دیکھا وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے ان کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے عرض کیا، یہ شخص؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم، ہاں! یہی شخص۔ یہ روایت جامع ترمذی ①، مسند امام احمد ②، ابن ابی شیبہ ③، السنۃ لابن ابی عاصم ④، المستدرک ⑤، المعجم الکبیر، ⑥ مسند الشامیین ⑦ میں منقول ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن صحیح اور امام حاکم رحمہ اللہ نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ⑧ علامہ البانی رحمہ اللہ نے السلسلۃ الصحیحہ ⑨ صحیح الترمذی ⑩ اور حاشیہ مشکوۃ ⑪ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

---

① جامع ترمذی، رقم: 3704 ② مسند امام احمد: 235,236/4، 33,35/5 ③ ابن ابی شیبہ: 41,42/12، 593/14 ④ السنۃ لابن أبی عاصم، رقم: 1295 ⑤ المستدرک: 102/3، 433/4 ⑥ المعجم الکبیر: 316/2 ⑦ مسند الشامیین: 394/2 ⑧ حلیۃ الأولیاء: 114/9 ⑨ السلسلۃ الصحیحۃ، رقم: 3119 ⑩ صحیح الترمذی: 2922 ⑪ حاشیہ مشکوۃ: 1715/3

یہی روایت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن حوالہ، کعب بن عجرہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ مزید دیکھئے السلسلۃ الصحیحۃ ①

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہمنوائی کا حکم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کا ذکر کیا تو ایک صحابی نے کہا: ہمیں آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

علیکم بالأمین وأصحابه وهو یشیر إلی عثمان.

"تم امین اور اس کے ساتھیوں سے وابستہ رہو اور یہ کہتے ہوئے آپ نے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔" یہ روایت مسند امام احمد، ② المستدرک، ③ ابن ابی شیبہ، ④ دلائل النبوۃ للبیہقی ⑤ اتحاف الخیرۃ ⑥ میں ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اس کی سند جید حسن ہے۔ ⑦

اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے الصحیحہ ⑧ میں اسے درج کیا ہے۔ لہٰذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا، جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یقیناً شامل ہیں، کے حق پر ہونے اور ان کے امانت دار ہونے کی پیشگوئی فرمائی اور ان کا ساتھ دینے کا حکم فرمایا تو اس صحیح حدیث کے برعکس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو موردِ الزام ٹھہرانا اور ان پر زبانِ طعن دراز کرنا اپنی عاقبت تباہ و برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں مولانا مودودی کے حوالے سے جو کچھ ہم نے نقل کیا

---

① السلسلة الصحيحة: 3118 ② مسند امام احمد: 345/2، رقم: 5722 ③ المستدرك: 434/4 ④ ابن أبي شيبة: 50,51/12 ⑤ دلائل النبوة للبيهقي: 393/6 ⑥ إتحاف الخيرة: 7/8 ⑦ البدايه: 201/7 ⑧ الصحيحة: 3188

ہے۔ اسے تاریخی روایات کہہ کر بے اصل قرار دینا بھی دراصل سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے دشمنی کی علامت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو کجا بلوائی جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملے اور اپنی شکایت انھیں پیش کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں مطمئن کر دیا تو وہ راضی اور مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت، جس کا ہم ابن ابی شیبہ، ابن حبان وغیرہ کے حوالے سے ذکر کر آئے ہیں، میں یہ تفصیل موجود ہے۔ اس کے بعد خط کی کہانی انھوں نے بنائی اور اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انھوں نے اپنا ہمنوا بنانا چاہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی جس طرح تکذیب کی اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط [1] میں بھی صحیح سند کے ساتھ امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بلوائیوں کی باہمی گفتگو اور پانچ باتوں پر اتفاق کا ذکر موجود ہے۔ اور یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کردار ادا کیا تھا۔ یہ روایت گو مرسل ہے، مگر حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی کچھ تائید ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان کوششوں کو تاریخی روایات کہہ کر انکار کرنا بہر نوع غلط ہے، بلکہ صحیح بخاری کتاب فرض الخمس، باب ماجاء فی درع النبی ﷺ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

لو كان علي ذاكراً عثمان ذكره يوم جاءه ناس فشكوا سُعاة عثمان. [2]

''اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا کہنے والے ہوتے تو اس دن کہتے جب کچھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملوں کی شکایت کرنے ان کے پاس آئے تھے۔''

اسی روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط: 169,170 [2] بخاری: 3111

پاس ایک تحریر دے کر بھیجا کہ صدقات کے بارے میں یہ تحریر رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ اپنے عاملوں سے کہیں اس کے مطابق عمل کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اس کا علم ہے اس کی مجھے ضرورت نہیں۔ محمد بن حنفیہ فرماتے ہیں: میں نے جا کر یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہہ دی تو انھوں نے فرمایا: کہ یہ تحریر جہاں سے لی تھی وہیں رکھ دو۔

یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض نہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کن کن عاملوں سے انھیں کیا شکایت تھی؟۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس بارے میں عدمِ علم کا اظہار کیا ہے۔ اور نہ ہی یہ ذکر ہے کہ یہ شکایت ان بلوائیوں کی تھی یا ان کے علاوہ کسی اور وقت میں بعض نے شکایت کی تھی۔ تاہم یہ بات موجود ہے کہ بلوائیوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو کوفہ اور ابن عامر کو بصرہ کا عامل مقرر کرنے کا مطالبہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے تسلیم کیا۔

خبثِ باطن کا ایک اور کرشمہ

افسوس یہ ہے کہ اس حوالے سے یہ بھی کہا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حالات یہاں تک بگڑ گئے کہ حضرت ابوالدرداء نے فرمایا:

> واللہ ما أعرف من أمة محمد ﷺ شیئاً إلا أنھم یصلون جمیعاً.[1]

> ’’اللہ کی قسم! میں امت محمد ﷺ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں پاتا کہ وہ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں۔‘‘

گویا یہ انقلاب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

حالانکہ اس سے یہ استدلال اعتقادی کجی اور فکری زیغ کا نتیجہ ہے۔ اولاً: تو حضرت

[1] بخاری، رقم:650، کتاب الأذان، باب فضل صلاۃ الفجر فی جماعۃ

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت انس رضی اللہ عنہ، ان کے اس نوعیت کے اقوال دراصل رسول اللہ ﷺ سے بُعدِ زمانی کی بنا پر ہیں۔ عملی انحطاط رسول اللہ ﷺ کے کچھ عرصہ بعد شروع ہوا اور بالآخر یہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آپ سے بُعد کا عالم تو یہ ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس مبارک اور اہل وعیال کی مجلس میں قلبی وایمانی کیفیت میں جو فرق محسوس کرتے تھے اس کی بنیاد پر اپنے متعلق وہ نفاق کا شبہ کرتے اور فرماتے: «نافق حنظلة» حنظلہ منافق ہوگیا۔[1]

یہ فرق تو صرف آپ ﷺ کی مجلس مبارک اور دوسری مجلسوں میں تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

وما نفضنا عن رسول الله ﷺ الأيدي وإنا لفي دفنه حتى أنكرنا قلوبنا.[2]

''کہ ہم نے ابھی رسول اللہ ﷺ کی قبرِ اطہر کی مٹی بھی ہاتھوں سے نہیں جھاڑی تھی اور ہم آپ کے دفن میں مصروف تھے کہ ہم نے اپنے دلوں کی کیفیت بدلی ہوئی محسوس کی۔''

اس سے صحابۂ کرام کے بگڑنے کا تصور واستدلال کسی رافضی کا تو ہوسکتا ہے صحیح العقیدہ مسلمان کا نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور یقیناً وہ نہ تھا جو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے بھی مختلف تھا۔ لیکن اس کا یہ مقصد قطعاً نہیں کہ یہ سب کچھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کے نتیجہ تھا۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کی جو عکاسی کی ہے اس کا باحوالہ ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ البتہ بنوامیہ کے دور میں حجاج اور اس کے ہمنواؤں کا کردار بہرحال بہت مختلف تھا۔ لیکن اس کی ذمہ داری انھی پر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی پالیسیوں اور حرکتوں کے قطعاً ذمہ دار نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

---

[1] مسلم، رقم: 6966، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر [2] ترمذی: 295/4 وابن ماجه وغیرہ

مراد أبی الدرداء أن أعمال المذکورین حصل فی جمیعها النقص والتغییر إلا التجمیع فی الصلاة وهو أمر نسبی لأن حال الناس فی زمن النبوة کان أتم مما صار إلیه بعده، ثم کان زمن الشیخین أتم مماصار إلیه بعدهما، وکان ذلك صدر من أبی الدرداء فی أواخر عمره وکان ذلك فی أواخر خلافة عثمان، فیالیت شعری إذا کان العصر الفاضل بالصفة المذکورة عند أبی الدرداء، فکیف بمن جاء بعدهم من الطبقات إلی هذا الزمان؟[1]

''حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اعمال میں نقص اور تبدیلی پیدا ہوگئی تھی سوائے باجماعت نماز پڑھنے کے، یہ نسبتی معاملہ ہے کیونکہ لوگوں کی حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بتمام وکمال تھی نسبتاً آپ کے بعد کے دور کے، اور پھر شیخین حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دور میں لوگوں کی حالت بہتر تھی نسبتاً ان کے بعد کے دور کے، یہ بات حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں کہی تھی اور ان کا یہ دور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری دور تھا۔ ہائے افسوس! جب حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس بابرکت دور کی یہ حالت ہے تو اس کے بعد کے طبقات میں، ہمارے زمانے تک کیا حال ہوگا؟''

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی اس بات میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے کے تناظر میں جو بتدریج انحطاط پیدا ہوا اس کی طرف اشارہ ہے۔ مگر افسوس کہ بعض حضرات سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی دشمنی میں اسے بھی ان کی پالیسیوں کی کمزوری کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ فوا اسفا

[1] فتح الباری: 138/2

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مطاعن اور ان کے بعض اقدامات پر جو اعتراضات قدیم وجدید دور میں ہوئے عرصہ ہوا ان کا جواب علمائے کرام دے چکے ہیں۔ جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جو کج بحثی خطبات وغیرہ میں مولانا محمد اسحق صاحب نے پھیلائی ہے قارئین کرام کو اس سے آگاہ کر دیا جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے خلاف ہرزہ سرائی

جناب مولانا اسحاق صاحب نے یہ بھی فرمایا: ''شاہ ولی اللہ اور ابن تیمیہ نے بہت جھوٹ بولا، جھوٹی روایات کتابوں میں بھر دیں ذرا خوف خدا نہ کیا۔ میرا دعویٰ ہے آئیں شیخ الحدیث اور نکالیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آخر میں پچھتاتے تھے کہ کاش میں پہلے فوت ہو گیا ہوتا۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا مقام و مرتبہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کے باوصف ہم انھیں معصوم نہیں سمجھتے، مگر اس طرزِ تکلم کے بارے میں ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ چاند پر تھوکنے والا درحقیقت اپنے ہی منہ پر تھوکتا ہے۔

ہمیں ان کی اس جسارت پر کوئی تعجب نہیں۔ جو صاحب صحابہ کرام پر تنقید کی جرأت کر سکتے ہیں ان سے اِن کا برامت پر یوں طعن و تشنیع کہ ''انھوں نے بہت جھوٹ بولا اور جھوٹی روایتیں کتابوں میں بھر دیں'' ہمارے لیے کچھ اجنبی نہیں۔

وہ ''جھوٹی روایتیں'' کون کون سی ہیں اور کتنی ہیں۔ کاش انھوں نے اس کی وضاحت کی ہوتی اور ہمیں ان کی خبر ہو جاتی۔ لیکن جس روایت کا انھوں نے ذکر فرمایا وہ یہ کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ آخر میں پچھتاتے تھے کہ کاش میں پہلے فوت ہو گیا ہوتا'' آیئے اس روایت کو دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی یہ جھوٹی روایت ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جنگ صفین و جمل کے بارے میں موقف

امام حارث نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ بن صرد نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں اور جنگ میں شریک نہ ہونے کی میری طرف سے معذرت کریں تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معذرت آپ کیا کریں گے وہ میرے پاس کھڑے کہہ رہے تھے:

يا حسن! ليتني مت قبل هذا بعشرين سنة. (1)

''اے حسن! کاش میں اس سے بیس سال پہلے فوت ہوگیا ہوتا۔''

یہ روایت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے المطالب العالیہ (2) میں بھی ذکر کی ہے اس کی سند صحیح ہے اور یہی روایت انھوں نے امام مسدد رحمہ اللہ کی سند سے بھی بیان کی ہے اور اس میں عشرین سنۃ کی بجائے «بكذا وكذا سنة» کے الفاظ ہیں۔ اور اس کی سند بھی صحیح اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں جیسا کہ المطالب العالیہ کے محقق نے فرمایا ہے۔ علامہ البوصیری رحمہ اللہ نے یہی قول اتحاف الخیرہ (3) میں بھی ذکر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ یہ اثر المصنف لابن ابی شیبۃ (4) امام نعیم بن حماد رحمہ اللہ کی کتاب الفتن (5) امام احمد رحمہ اللہ کی السنہ (6) طبرانی کبیر (7) المستدرک (8) السنۃ للخلال (9) اور البدایہ (10) میں مختلف اسانید سے مروی ہے اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (11) میں کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔ علامہ البوصیری رحمہ اللہ اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ وغیرہ کا اس اثر کی سند کو صحیح اور حسن قرار دینے کے بعد ضرورت تو نہیں رہتی کہ اس کے راویوں پر بحث کی جائے۔ تاہم رفعِ اشتباہ کے لیے اور اس حقیقت کو مدلل طور پر مبرہن کرنے کے لیے اس کے راویوں کی پوزیشن قارئینِ کرام کے

---

(1) بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث: 762/2، رقم: 757 (2) المطالب العالیہ: 144/3، رقم: 4402 (3) اتحاف الخیرہ: 17/8 (4) المصنف: 282,286/15 (5) کتاب الفتن: 78,80,99/1 (6) السنہ: 556,589/2 (7) طبرانی، البدایہ: 241/1 (8) المستدرک: 373/3 (9) السنۃ للخلال: 474 (10) البدایہ: 241/7 (11) مجمع الزوائد: 150/9

سامنے عرض کیے دیتے ہیں تاکہ نصف النہار کی طرح واضح ہو جائے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہ تاثر دینے والے خود کتنے جھوٹے اور کس قدر "خوفِ خدا" سے عاری ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ المطالب العالیہ میں امام مسدد رحمہ اللہ کی مسند سے اس کی سند یوں نقل کرتے ہیں:

حدثنا يحيى عن شعبة حدثني أبو عون عن أبي الضحى قال: قال سليمان بن صرد للحسن بن علي رضي الله عنه: أعذرني عند أمير المؤمنين فقال الحسن: لقد رأيته يوم الجمل وهو يلوذ بي وهو يقول: وددت أني مت قبل هذا بكذا وكذا سنة.(1)

اس سند کے پہلے راوی یحییٰ ہیں جو معروف امام یحییٰ بن سعید قطان رحمہ اللہ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ثقة متقن حافظ إمام قدوة.(2)

ان کے استاذ شعبہ بن الحجاج ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں:

ثقة حافظ متقن أمير المؤمنين في الحديث.(3)

ان کے استاد ابوعون محمد بن عبداللہ الثقفی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ ہے: ثقة (4)

ان کے استاذ ابوالضحیٰ رحمہ اللہ مسلم بن صبیح الھمدانی تابعی ہیں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «ثقة فاضل»(5) اور ان کے شیوخ میں سلیمان رحمہ اللہ بن صرد کا ذکر موجود ہے۔(6)

یہی روایت امام حارث بن محمد بن ابی اسامہ نے المسند میں عبدالرحمٰن بن غزوان ابونوح قراد سے، جیسا کہ بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث(7) میں اور المطالب(8) میں ہے۔

---

(1) المطالب: 4405 (2) تقریب: 375 (3) تقریب: 145 (4) تقریب: 309 (5) تقریب: 335
(6) تہذیب: 220/2 وغیرہ (7) بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث، رقم: 757
(8) المطالب، رقم: 4402

ابن ابی شیبہ [1] نے ابواسامہ حماد بن اسامہ سے، نعیم بن حماد نے الفتن [2] میں امام ابن المبارک رحمہ اللہ سے، یہ تینوں حضرات امام شعبہ رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس اثر کے مزید طرق محولہ کتب میں موجود ہیں۔ یہاں استیعاب مقصود نہیں۔ بتلانا صرف یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول صحیح اور حسن اسانید سے ثابت ہے۔ اور اسی سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرنے والے کی صداقت و دیانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے انکار کا پسِ منظر یہ ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ان تنازعات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موقف کو اجتہاد اور تاویل پر مبنی قرار دینا پڑے گا۔ اور اس سے طاعنینِ صحابۂ کرام کی موہوم عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ حسبِ ذیل روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی روایت امام عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ نے السنۃ [3] میں ذکر کی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات صفین یا جمل کے موقعہ پر فرمائی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے التاریخ الکبیر [4] میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو ڈانٹا کہ تم جنگ میں پیچھے کیوں رہے ہو۔ عمرو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملے تو انھوں نے فرمایا: تم پریشان نہ ہو اللہ کی قسم! میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صفین کے روز سنا فرماتے تھے:

لیت أمی لم تلدنی ولیت أنی مت قبل الیوم.

"کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش میں اس سے پہلے فوت ہو جاتا۔"

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صفین کے دن فرمایا:

لو علمت أن الأمر یکون هكذا ما خرجت.

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو میں اس لڑائی کے لیے نہ نکلتا۔"

---

[1] ابن ابی شیبہ: 288/15 [2] الفتن: 80/1 [3] السنۃ: 555/2 [4] التاریخ الکبیر: 384/6

بلکہ اس کے ساتھ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے، جنھیں انھوں نے اپنی طرف سے حکم مقرر کیا تھا، فرمایا:

اذهب يا أبا موسى فاحكم ولو خرعنقي. ①

''ابوموسیٰ جاؤ کوئی فیصلہ کرو اگرچہ میری گردن نیچے ہو جائے۔''

اس اثر کے بھی تمام راوی ثقہ وصدوق ہیں، مگر یہ مرسل ہے۔ لیکن اس کی تائید ایک اور مرسل سے بھی ہوتی ہے جسے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الآثار میں بواسطہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، موسیٰ بن ابی کثیر سے نقل کیا ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

خلصني منها ولو بعرق رقبتي. ②

''میری اس سے جان چھڑا دیں اگرچہ میری گردن کی رگ کٹ جائے۔''

ان جنگوں میں فریقین ایک دوسرے کے مقتولین کی تلاش کرتے اور باہم مل کر ان کی تدفین کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی نماز جنازہ پڑھاتے۔ ③

بلکہ ۴۰ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح کر لی۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمت میں یہ خط لکھا کہ امت ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو گئی آپ عراق کے حاکم اور میں شام کا حاکم ہوں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بات کو قبول کر لیا۔ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے سے رک گئے۔ لشکر کو اپنے اپنے شہر میں بھیج دیا گیا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔ ④

قابلِ غور بات یہ ہے کہ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنواؤں کے ''باغی'' ثابت ہو جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان سے مصالحت کس ''نص'' کی بنیاد پر تھی؟

---

① ابن ابی شیبۃ: 293/15 ② کتاب الآثار: 208 ③ البدایۃ: 278/7، منہاج السنۃ 108/4 ④ البدایہ: 323/7، تاریخ طبری: 81/5، الکامل لابن الأثیر: 385/3، المنتظم 163/5

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے تحکیم کے معاملے میں جان بخشی کروانے کے کیا معنی تھے؟ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اپنی پریشانی کا اظہار کیوں کرتا تھا؟

جناب مولانا محمد اسحاق صاحب کا کہنا کہ ''شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ نے جھوٹی روایتیں کتابوں میں بھر دیں۔'' ہمیں بتلایا جائے کہ ابن ابی شیبہ وغیرہ کتب کے حوالہ سے جو روایات ہم نے ذکر کیں اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے ان کی تحسین و تصحیح نقل کی اس میں کون سا راوی جھوٹا اور کذاب ہے؟ اگر یہ عذر پیش کیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اپنی پریشانی کا اظہار جنگِ جمل کے بارے میں تھا۔ تو یہ عذر، عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے قبیل سے ہے۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف جنگ جمل میں راجح اور درست نہیں تھا؟ جنگِ صفین کی طرح جب جنگِ جمل میں بھی ان کا موقف راجح تھا تو پھر یہ پچھتاوا چہ معنی دارد؟ بعض طرق میں صفین کا ذکر بھی اس عذر لنگ کے ابطال پر برہان ہے۔

کیا صحابہ پر تنقید درست ہے؟

علاوہ ازیں حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بحیثیت مجموعی مولانا محمد اسحٰق صاحب کی فکر یہ ہے کہ ان پر تنقید درست ہے ان کی زلات اور ان کے باہمی مشاجرات ومنازعات کو بیان کرنا بالکل درست ہے، بلکہ اس بارے میں ان کے الفاظ ہیں:

''سن لو! دماغ سے یہ کابوس اتار دو کہ وہ صحابی ہیں۔ اس فکر نے دین کا بیڑا غرق کیا ہے کہ ان پر تنقید کرنا درست ہی نہیں، بلکہ عین ایمان ہے۔ یہ میرے خطبات کا نچوڑ ہے۔''

لیکن مولانا موصوف کا یہ موقف ائمہ سلف کے خلاف اور ان کی واضح تصریحات کے بالکل منافی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، العقیدۃ الواسطیہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد واصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن أصول أهل السنة والجماعة سلامة قلوبهم وألسنتهم لأصحاب رسول الله ﷺ.الخ [1]

''اہل السنۃ والجماعت کا اصول ہے کہ وہ اپنے دلوں اور اپنی زبانوں کو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں سلامت رکھتے ہیں۔''

امام ابوجعفر طحاوی رحمہ اللہ، جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے عقیدہ وعمل کے ترجمان ہیں، اپنی مشہور کتاب العقیدۃ الطحاویہ میں رقم طراز ہیں:

نحب أصحاب رسول الله ﷺ ولا نفرط فی حب أحد منهم ولا نتبرأ من أحد منهم، ونبغض من يبغضهم، وبغير الخير يذكرهم، ولا نذكرهم إلا بخير، وحبهم دين وإيمان وإحسان، وبغضهم كفر ونفاق وطغيان. [2]

''ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی محبت میں نہ افراط کا شکار ہیں اور نہ ہی کسی سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جو ان سے بغض رکھتا ہے اور خیر کے علاوہ ان کا ذکر کرتا ہے ہم اس سے بغض رکھتے ہیں اور ہم ان کا ذکر صرف بھلائی سے کرتے ہیں۔ ان سے محبت دین، ایمان اور احسان ہے اور ان سے بغض کفر ونفاق اور سرکشی ہے۔''

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والے مشاجرات کے بارے میں اپنے تبصرہ کے بعد فرماتے ہیں:

واتفق أهل السنة على وجوب الكف عما شجر بينهم والإمساك عن مساويهم وإظهار فضائلهم ومحاسنهم وتسليم

[1] العقيدة الواسطية: 111، نیز دیکھیے منهاج السنه: 219,220 [2] شرح العقيدة الطحاوية:

أمرهم إلى الله عز وجل على ما كان جرى من اختلاف على وطلحة والزبير وعائشه ومعاوية رضى الله عنهم على ما قدمنا بيانه.①

''اہلِ سنت اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشاجرات اوران کی کمزوریوں پر خاموشی اختیار کرنا، ان کے فضائل اوران کی خوبیوں کو بیان کرنا اور حضرت علی، طلحہ، زبیر، عائشہ، معاویہ رضی اللہ عنہم کے مابین جو اختلاف ہوا۔ اسے اللہ کے سپرد کرنا واجب ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔''

شارح صحیح مسلم امام محی الدین النووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہلِ سنت اور اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حسن ظن رکھا جائے۔ ان کے آپس کے اختلافات میں خاموشی اور ان کی لڑائیوں کی تاویل کی جائے۔ وہ بلاشبہ مجتہد اور صاحبِ رائے تھے۔ معصیت اور نافرمانی ان کا مقصد نہ تھا اور نہ ہی محض دنیا طلبی پیشِ نظر تھی، بلکہ ہر فریق یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ وہی حق پر ہے اور دوسرا باغی ہے۔ اور باغی کے ساتھ لڑائی ضروری ہے تا کہ وہ امرِ الٰہی کی طرف لوٹ آئے۔ اس اجتہاد میں بعض راہِ صواب پر تھے اور بعض خطا پر تھے۔ مگر خطا کے باوجود معذور تھے کیونکہ اس کا سبب اجتہاد تھا اور مجتہد خطا پر بھی گنہگار نہیں ہوتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان جنگوں میں حق پر تھے اہلِ سنت کا یہی موقف ہے۔ یہ معاملات بڑے مشتبہ تھے۔ یہاں تک کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت حیران وپریشان تھی۔ وہ جماعت فریقین سے علیحدہ رہی اور قتال میں حصہ نہیں لیا۔ اگر انھیں صحیح بات کا یقین ہو جاتا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معاونت میں پیچھے نہ رہتے۔''②

---

① الغنیہ: 79/1 ② شرح مسلم للنووی: 390/2، نیز 272/2

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے: اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ تسلیم کیا جائے، سب کی تعریف کی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان جو کچھ رونما ہوا وہ اجتہاد پر مبنی تھا۔" الخ [1]

بلکہ علامہ ابن حجر المکی رحمۃ اللہ علیہ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ بھی نقل کیا ہے:

"واعظین اور دوسرے لوگوں کے لیے حرام ہے کہ مقتل سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والے جھگڑوں اور اختلافات کو بیان کریں۔ کیونکہ یہ جسارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض پر اور ان پر طعن وملامت کرنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔ حالانکہ وہ تو دین کے ستون ہیں۔ ائمہ نے ان سے دین روایتاً لیا اور ہم نے ائمہ سے دین درایتاً لیا۔ لہٰذا ان پر طعن کرنے والا خود مطعون ہے جو اپنے اور اپنے دین میں طعن وملامت کرتا ہے۔" [2]

ائمہ اہلِ سنت کی اس نوعیت کی تصریحات کا دائرہ وسیع الذیل ہے۔ ہم انھی چند حوالہ جات پر اکتفا کرتے ہیں۔ انھی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہلِ سنت اور ائمہ سلف کے موقف کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ کہنا کہ "صحابہ کی عظمت کا کابوس دماغوں سے اتار دو، ان پر طعن عین دین ہے۔" یہ موقف روافض اور ان کے ہمنواؤں کا تو ہو سکتا ہے اہلِ سنت کا قطعاً نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے معافی کا اعلان

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معصوم نہیں تھے، ان سے خطا اور غلطی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں بھی ہوئی، بلکہ بسا اوقات بڑی سنگین ہوئی۔ اس کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں معاف فرمایا اور ان سے درگزر فرمایا۔ غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کی نافرمانی کے نتیجہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾ [3] "کہ تم میں

---

① إحياء العلوم: 120/1 ② الصواعق المحرقة: 223 ③ آل عمران: 152

سے بعض دنیا طلبی میں پڑ گئے تھے۔'' کے الفاظ سے سرزنش فرمائی، مگر اس کے باوصف ساتھ ہی فرمادیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ [1] ''کہ اس نے تمھیں معاف کر دیا۔'' اس طرح کچھ وہ بھی تھے جو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر ان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ [2]

''کہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔''

بلکہ اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی فرمایا:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ [3]

''آپ ان کا قصور معاف کر دیں ان کے لیے بخشش کی دعا کریں اور (آئندہ کے لیے) ان سے مشورہ لیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ان کے آئندہ کے واقعات واحوال سے بھی خوب خبر تھی مگر اس کے باوجود انھیں ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ اور ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ کی جانفزا بشارتوں سے نوازا۔ رسول اللہ ﷺ نے آئندہ کے واقعات اور فتنوں سے خبردار کیا۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحتی کوششوں کو سراہا اور تحسین فرمائی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے خبردار کیا۔ اس کے باوجود آپ نے مجموعی طور پر یہی فرمایا کہ میرے صحابی کی بات آئے تو زبان روک لو، ان کی حسنات یاد کرو، انھیں برا مت کہو، ان سے درگزر کرو۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف کا عمل اور طرزِ فکر یہی رہا۔ محدثین کرام رحمہم اللہ نے کتب احادیث میں ان کے مثالب نہیں، بلکہ مناقب ہی جمع کیے ہیں اور ان سے بہر نوع اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] آل عمران: 152 [2] آل عمران: 155 [3] آل عمران: 159

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا نامناسب رویہ

اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعارف پر جن حضرات نے کتابیں لکھیں انھوں نے بھی ان کے مناقب ومحامد ہی نقل کیے ہیں۔ مثالب وباہمی مناقشات کا ذکر نہیں کیا۔ ان میں علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ ہیں جنھوں نے «الاستیعاب فی معرفة الأصحاب» میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشاجرات ومناقشات کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کے اس اسلوب پر متاخرین نے نکیر کی ہے، بلکہ اسے ان کی اس کتاب کے عیوب اور نقائص میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے معروف محدث امام ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمن ابن الصلاح اپنی اصول حدیث کی مشہور کتاب ''علوم الحدیث'' میں ۳۹ ویں نوع معرفۃ الصحابہ میں رقم طراز ہیں:

> ومن أجلها وأكثرها فوائد كتاب الاستيعاب لابن عبد البر: لولا ما شانه به من إيراده كثيراً مما شجر بين الصحابة وحكاياته عن الأخباريين لا المحدثين، وغالب على الأخباريين الإكثار والتخليط فيما يروونه.[1]

''معرفۃ الصحابہ کے عنوان پر بہت سی کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور باکثرت فوائد کے اعتبار سے ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی الاستیعاب ہے، اگر وہ اس میں صحابہ کے مابین ہونے والے مشاجرات اور محدثین کی بجائے مؤرخین کی بیان کردہ حکایات کی بھرمار نہ کرتے۔ کیونکہ مؤرخین کا غالب رجحان بلاامتیاز باکثرت اور خلط ملط روایات جمع کرنا ہوتا ہے۔''

یہی بات علامہ نووی رحمہ اللہ نے التقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی[2] میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ اور یہی بات علامہ السخاوی رحمہ اللہ نے فتح المغیث[3] میں کہی ہے۔

---

[1] علوم الحدیث: 262 [2] تدریب الراوی: 207/2 [3] فتح المغیث: 85/4

التقریب کے علاوہ یہی بات علامہ نووی رحمہ اللہ نے ارشاد طلاب الحقائق[1] میں فرمائی ہے۔ اور اس کا اعتراف تو علامہ ابن الوزیر الیمانی رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے کہ بعض اہلِ حدیث نے الاستیعاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشاجرات ذکر کرنے کی بنا پر ابن عبدالبر رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے۔[2]

جس سے ان محدثین اور ائمۂ سلف کے موقف کو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے ذکر خیر میں ان کے مثالب کا ذکر غلط سمجھتے ہیں۔

پھر جس ہستی کے وہ صحابہ ہیں جب انھوں نے حکماً فرما دیا کہ «إذا ذکر أصحابي فأمسکوا» ''جب میرے صحابہ کے بارے میں ذکر ہو تو خاموش رہو''[3] تو اس کے بعد بھی ان پر طعن و تشنیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت اور اپنی عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ یہی طرزِ فکر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی تھی۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

أمروا أن یستغفروا لأصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم فسبوهم.[4]

''حکم تو یہ دیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں استغفار کرو، مگر لوگوں نے انھیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی فرماتے تھے:

لا تسبوا أصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فإن اللہ عزوجل أمر بالاستغفار لهم وهو یعلم أنهم سیقتتلون.[5]

''کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا مت کہو، بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ عنقریب باہمی قتل و قتال میں مبتلا ہوں گے ہمیں ان کے بارے میں استغفار کا حکم فرمایا ہے۔''

---

[1] إرشاد طلاب الحقائق: 584/2 [2] الروض الباسم: 130/1 [3] الصحیحة: 34 [4] صحیح مسلم: 421/1 [5] فضائل الصحابة لأحمد: 70/1، 1152/2، الشریعة للآجري: 2494/5 وغیره

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے کہ کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یاوہ گوئی شروع کر دی تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں یاوہ گوئی سے باز آجاؤ، ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک غلطی ہوگئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر کوئی اللہ کا نوشتہ پہلے سے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے کیا اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی اور مجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمارے بارے میں سبقت لے گئی ہے۔[1]

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس اثر کی سند کو صحیح کہا اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے شرطِ شیخین پر صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں طعن و تشنیع کرنے لگا تو وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے پھر فرمایا: ایک اعرابی صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں انصار صحابہ کی ہجو کی تو انھوں نے فرمایا: کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ صحبت حاصل ہے۔ اگر یہ شرف اسے حاصل نہ ہوتا تو میں تمھاری طرف سے دفاع میں اس کے لیے کافی ہوتا۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس واقعہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اعرابی سے صرف صحابی ہونے کے ناطے درگزر فرمایا۔[2] ورنہ وہ اسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی کی سزا دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے پسِ منظر میں سنا کر خبردار فرمایا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسی جسارت بہر نوع باعثِ مذمت اور مستوجبِ سزا ہے۔ ہم اس حوالے سے مزید تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل مطلوب ہو تو ہمارے رسالہ ''مشاجرات صحابہ اور سلف کا موقف'' ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] المطالب العالیہ: 150/4، المستدرك: 329/2 [2] الإصابہ: 8/1

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ سلف رحمہم اللہ کی ان تصریحات سے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح فرمان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی مناقشات اور مشاجرات میں زبان کو آلودگی سے بچانا چاہیے اور اس حوالے سے ان پر طعن و تشنیع بہر نوع سلف کے موقف کے مخالف اور ''سبیل المؤمنین'' کے منافی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خون سے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا ہے تو ہم زبانوں کو اس میں ملوث کیوں کریں۔

اس کے بعد ایمان داری سے بتائیں اور غور فرمائیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف زبان درازی کرنے والے کو سلف کا ترجمان اور مسلک اہلِ سنت کا پاسبان قرار دیا جا سکتا ہے؟

کیا شیخین کے بعد جہاد نہیں؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر یوں تنقید کی کھلی چھٹی اور اس جسارت کو عین دین قرار دینے کے علاوہ حضرت موصوف تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے بعد ہونے والے جہاد کو اسلام کا جہاد ہی قرار نہیں دیتے۔ اس حوالے سے جب ان سے استفسار کیا گیا تو وہ اس سے انکار کر گئے اور فرمایا کہ خلفاے راشدین کے بعد کا جہاد کوئی اسلامی جہاد نہیں۔ ملک چھیننا اگر اسلامی جہاد ہے تو ہلاکو اور چنگیز نے کم ملک فتح کیے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

گویا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ امارت میں ہونے والا جہاد، ہلاکو اور چنگیز خان جیسے کفار کی ملک گیری کا مصداق ہے۔ لا حول ولا قوة إلا بالله

حالانکہ صحیح بخاری میں حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أول جيش يغزون مدينة قيصر مغفور لهم

''کہ مدینہ قیصر پر سب سے پہلے فوج کشی کرنے والے لشکر کو بخش دیا گیا ہے۔''

اور یہ بھی فرمایا:

أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا.

''کہ میری امت کا پہلا لشکر جو دریا کے راستے جہاد کرے گا ان پر مغفرت و جنت واجب قرار دے دی گئی ہے۔''[1]

علامہ البانی نے الصحیحہ[2] میں اسے ذکر کیا ہے اور مزید حلیۃ الاولیاء[3] اور مسند الشامیین کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اسی جہاد میں حصہ لینے والے خوش نصیب حضرات میں حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابۂ کرام بھی تھے۔ یہ جہاد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ امارت ۴۹ھ میں ہوا۔ یہی نہیں، بلکہ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب سے مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے، حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے مسکرانے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے خواب میں اپنی امت کے کچھ لوگوں کو دیکھا وہ سمندر کے اندر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اس طرح سوار ہیں گویا تختوں پر بادشاہ بیٹھے ہیں، حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا فرماتی ہے میں نے عرض کیا جناب! میرے لیے دعا کریں اللہ مجھے بھی ان میں شریک کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا کی، پھر آپ سر رکھ کر سو گئے، پھر ہنستے، مسکراتے بیدار ہوئے۔ تو میں نے پوچھا آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد کو جا رہے تھے اس طرح میرے سامنے لائے گئے جیسے بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی ان میں شریک کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پہلے لوگوں میں شریک ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ یہ جہاد خلافتِ عثمانی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیر امارت و قیادت ۲۷ھ میں ہوا تھا۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا اس لشکر میں شامل تھیں۔ جب لشکر دریا سے باہر ہوا تو حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سواری سے گر گئیں اور ان کا انتقال ہو گیا۔[4]

---

[1] بخاری، رقم: 2924، باب ما قیل فی قتال الروم وغیرہ [2] الصحیحۃ، رقم: 268

[3] حلیۃ الأولیاء: 62/2 [4] بخاری، رقم: 2788,2789,6282,6283

غور فرمایا آپ نے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت وسیادت میں اس جہاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے «غزاة في سبيل الله» قرار دیا۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عداوت وبغض میں مولانا موصوف ان کی جہادی مہمات کو ہلاکو اور چنگیز خان کی ہوس ملک گیری سے تشبیہ دینے میں کس قدر بے باک ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ''دریا'' میں جہاد اور بحری بیڑے کے اجازت بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہی حاصل کی تھی اور انھی کی سرکردگی میں پہلا بحری بیڑا سمندر میں اترا جس کی بشارت خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایسی پیش قدمی کو معاذ اللہ ہلاکو کی پیش قدمی کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد کسی صحیح العقیدہ مسلمان کے لیے اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یا ان کی قیادت میں ان مہمات کے بارے میں یہ تصور رکھے کہ ان کے دور میں جہاد نہیں، بلکہ ہوس ملک گیری تھی، اور نہ ہی اس کے بعد مزید اس حوالے سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ تاہم ماضی قریب کے نامور مؤرخ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمہ اللہ نے عہد بنو امیہ میں ہونے والے جہاد کے بارے میں جو فرمایا اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ سے جو کچھ نقل کیا اس کا ذکر ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موصوف رقم طراز ہیں:

''بنو امیہ کا تقریباً پورا دور جو اسلامی غزوات وفتوحات کا شان دار دور ہے، اس انداز میں گزرا ہے کہ جہاد وغزوات میں صحابہ وتابعین اور تبع تابعین امیرِ لشکر ہوتے تھے اور ان کے ساتھ عباد، زہاد، صلحاء اور علماء وفضلاء کی بڑی جماعت ہوا کرتی تھی۔ (جس کے باقاعدہ انھوں نے حوالے دیے ہیں) جن کی برکات وتجربات، تعلیمات وہدایات اور دعاؤں کے جلو میں اسلامی لشکر کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ ابن کثیر نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

كانت سوق الجهاد قائمة فى بنى أمية ليس لهم شغل إلا ذلك ، قد علت كلمة الإسلام فى مشارق الأرض ومغاربها، وبرها وبحرها، وقد أذلوا الكفر وأهله، وامتلأت قلوب المشركين من المسلمين رعباً، لا يتوجه المسلمون الى قطر من الاقطار الا اخذوه وكان فى عساكرهم وجيوشهم فى الغزو الصالحون والأولياء والعلماء من كبار التابعين فى كل جيش منهم شر ذمة عظيمة ينصر الله بهم دينه.

"بنوامیہ کے دور میں جہاد کی گرم بازاری تھی۔اس کے علاوہ ان کا کوئی شغل نہیں تھا۔ اسلام کا کلمہ مشرق ومغرب اور بحر و بر میں بلند تھا۔انھوں نے کفر اور کفار کو سرنگوں کر دیا تھا اور مشرکوں کے قلوب مسلمانوں کے رعب سے بھر گئے تھے۔ مسلمان جس علاقہ میں چلے جاتے اس کو فتح کر لیتے اور غزوات میں ان کے ہر لشکر میں کبار تابعین سے صلحاء، اولیاء اور علماء کی بڑی جماعت ہوتی تھی۔ان کی ذات بابرکات سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرماتا تھا۔"[1]

مزید جسارتیں

اس پر بس نہیں وہ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دنیا دار قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں معاویہ کے رشتہ داروں کو قتل کیا تھا یہ کلمہ تو پڑھ گئے لیکن بیٹے تو انھی کے تھے جو مارے گئے، معاویہ نے علی سے ان کا بدلہ تو لینا تھا اور علی کی شامت تو آنی ہی تھی۔"

نیز یہ بھی کہ "کہنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہتے تھے ہمیں دولت چاہیے، تم خشک روٹی

[1] البدایۃ: 87/9، تدوین سیر ومغازی: 59,60

کھاتے ہو۔ معاویہ روپے پیسے دیتا ہے تم نہیں دیتے۔ ہمیں یہ دین نہیں چاہیے یہ وقت عیاشی کا ہے۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''وہ ظالم تھا اس نے جھوٹ بولا۔ یہ وہی ہے جو مہاجرین کے تعاقب میں کفارِ مکہ کا نمائندہ بن کر حبشہ گیا تھا۔'' ہم ان کے اس اندازِ تکلم پر اپنے تبصرہ کا حق محفوظ رکھتے ہیں البتہ یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس قسم کی برسرِ منبر و محراب گفتگو کسی مسموم رافضی فکر کی تو ہو سکتی ہے۔ مسلک سلف سے وابستہ کسی اہلِ سنت سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بلکہ محترم مولانا موصوف کی یہ سیڈیز اب امام بارگاہوں میں بھی دستیاب ہیں اور وہ انھیں فروخت کر کے جہاں دام کماتے ہیں وہاں ''اہلِ حدیث عالم و مفتی'' کی اس گفتگو کو اپنی ہمنوائی اور اپنے دفاع میں بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جو مولانا مودودی کی خلافت و ملوکیت سے روا رکھا گیا کہ اس کتاب کی طباعت کے ایام میں ایک شیعہ آرگن نے لکھا تھا:

> ''بات یہ ہے کہ شیعوں کی تنقید کو سب و شتم قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سنی حضرات بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ترجمان القرآن کے تازہ شماروں میں مولانا مودودی کے قلم سے ''خلافتِ راشد سے ملوکیت تک'' کا مقالہ شائع ہوا ہے۔ مولانا نے اس مقالہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہی نہیں، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سرخیل یعنی خلفاے راشدین پر بھی تنقید فرمائی ہے۔ اگر یہی تنقید ایک شیعہ کے قلم سے شائع ہوتی تو یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب و شتم قرار دی جاتی۔ کیا مولانا مودودی صاحب پر بھی صحابہ کرام پر سب و شتم کرنے کا فتویٰ صادر فرما کر دیانت داری کا ثبوت فراہم فرمایا جائے گا۔''[1]

مولانا محمد اسحق کو یہ ''شرف'' بھی حاصل ہے کہ انھیں امام بارگاہ میں اور خالص رافضیوں

---

[1] ہفت روزہ رضا کار لاہور 16 جولائی 1965ء بحوالہ خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت: 00،

کی مجالس میں خطاب کے لیے دعوت دی جاتی ہے اور اس میں وہ اہلِ سنت کا صحیح موقف بیان کرنے کی بجائے روافض کی دلجوئی کی پوری کوشش کرتے ہیں اور ان کے دفاع میں فرماتے ہیں کہ یہ معذور ہیں انھوں نے جو پڑھا ہے۔ اس کے مطابق یہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں نہ دیں تو اور کیا کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا، وغیرہ۔

یہ اور اسی نوعیت کی اور بہت سے باتیں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں مختلف اسلوب سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے انھی خطابات کا نتیجہ ہے کہ ان کے حلقہ میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت عثمان، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں وہ احترام نہیں پایا جاتا جو اہلِ سنت کا طرۂ امتیاز ہے، بلکہ ان کے حلقہ میں ان حضرات کے اوصاف و مناقب کا کوئی تصور نہیں حتی کہ بعض تو ان کے بارے میں بد زبانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان حقیقتوں کے باوجود حضرت موصوف کے افکار کو اہلِ سنت کی ترجمانی قرار دینا بالکل غلط اور اہلِ سنت کے موقف سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ کو راسخ فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کے بارے میں اپنی امت کو تلقین فرمائی ہے کہ ''میری وجہ سے میرے صحابہ کا خیال رکھو، ان سے اچھے طریقے سے پیش آؤ، اور جب ان کا ذکر ہو تو خاموشی اختیار کرو۔''[1] اس کے مطابق عمل کی توفیق بخشے۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله العلي العظيم.

---

[1] السلسلة الصحيحة، رقم: 34,431,116

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المصنف لابن ابی شیبہ میں تحریف

شیخ محمد عوامہ کی جسارت

المصنف لابن ابی شیبہ میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث نماز میں ہاتھ باندھنے کے حوالے سے ایک عرصہ سے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے کہ اس میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہیں یا نہیں؟ المصنف کی پہلی جلد سب سے پہلے ہندوستان سے مولانا ابوالکلام اکادمی حیدرآباد سے ۱۳۸۲ھ بمطابق ۱۹۶۶ء میں طبع ہوئی۔ اس کے (ص ۳۹۰ ج ۱) پر یہی حدیث ہے۔ مگر اس میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس کا عکس دوبارہ الدار السلفیہ بمبئی سے طبع ہوا اور اس میں بھی ''تحت السرۃ'' کے الفاظ نہیں تھے۔ لیکن اسی نسخہ کو جب ادارۃ القرآن کراچی کے کارپردازوں نے شائع کیا تو اس میں پورے صفحہ کے الفاظ کے مقابلے میں جلی حروف سے ''تحت السرۃ'' کا اضافہ کر دیا۔ جسے ہر انسان بچشمِ خود دیکھ سکتا ہے۔

اس کے بعد طیب اکادمی ملتان اور مکتبہ امدادیہ ملتان کے منتظمین نے استاذ سعید اللحام کی تحقیق سے مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ شائع کیا، اور انھوں نے بھی اپنی جانب سے اس حدیث میں ''تحت السرۃ'' کا اضافہ کیا۔ بددیانتی اور تحریف کی انتہا دیکھیے کہ استاذ سعید اللحام کی تحقیق سے یہی نسخہ اس سے قبل دار الفکر بیروت سے شائع ہوا، مگر اس میں یہ اضافہ

قطعاً نہیں۔ ارباب طیب اکادمی نے مکتبہ راشدیہ پیر آف جھنڈا کے نسخہ مخطوطہ المصنف لابن ابی شیبہ کے متعلقہ صفحہ میں جو شرمناک تحریف کر کے اس کا عکس شائع کیا ہے وہ ظلمات بعضھا فوق بعض کا مصداق ہے۔ فإلی اللہ المشتکی.

اور اب حال ہی میں ۱۴۲۷ھ بمطابق ۲۰۰۶ء میں المصنف کا ایک ایڈیشن شیخ محمد عوامہ کی تحقیق سے دار القبلہ مؤسسہ علوم القرآن سے شائع ہوا ہے اور اس میں بھی "تحت السرۃ" کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ادارۃ القرآن کراچی کا یہ اقدام تو سراسر چوری اور سینہ زوری کا مصداق ہے۔ کہ کس نسخہ کی بنیاد پر انھوں نے یہ جسارت کی؟ اس بات کی کوئی وضاحت انھوں نے نہیں کی، طیب اکادمی ملتان کی کارستانی ہی ان کی کذب بیانی کی دلیل ہے جیسا کہ ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ البتہ شیخ محمد عوامہ نے دو نسخوں کی بنیاد پر "تحت السرۃ" کا اضافہ کیا۔ ان میں ایک نسخہ شیخ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا شیخ محمد مرتضی رحمہ اللہ الزبیدی کا۔ چنانچہ اسی حدیث [1] کے تحت انھوں نے لکھا ہے:

تحت السرة زيادة ثابتة في ت، ع كما يرى القارى الكريم صورتهما في مقدمة هذا المجلد.

"کہ "تحت السرۃ" کی زیادتی نسخہ "ت" اور "ع" میں ثابت ہے، جیسا کہ محترم قاری اس جلد کی ابتدا میں ان دونوں نسخوں کا عکس دیکھتا ہے۔"

"ت" سے مراد علامہ محمد مرتضی الزبیدی رحمہ اللہ کا نسخہ ہے، اور "ع" سے شیخ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ کا۔ شیخ محمد عوامہ کے اشارے کے مطابق ہم نے ان دونوں نسخوں کا عکس بھی دیکھا اور ان دونوں نسخوں کا جو تعارف انھوں نے "المصنف" کے نسخوں کی تفصیل کے ضمن میں پیش کیا اسے بھی دیکھا۔ لیکن انھی کی تفصیلات کے مطابق "تحت السرۃ" کا یہاں اضافہ صحیح نہیں۔ کیونکہ شیخ محمد عابد سندھی مرحوم کے نسخہ کے متعلق خود شیخ محمد عوامہ نے

---

[1] 3/320، رقم: 3959

وضاحت کردی ہے کہ:

هي نسخة للاستئناس لا للاعتماد عليها.[1]

''کہ یہ نسخہ مانوس ہونے کے لیے ہے، اس پر اعتماد کے طور پر نہیں۔''

لہٰذا جب اس نسخہ کی یہ غیر یقینی پوزیشن خود انھوں نے بیان کردی ہے تو پھر اس پر ''اعتماد'' محض مسلکی حمیت کا شاخسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ نسخہ قابلِ اعتماد کیوں نہیں؟ اس کی طرف اشارہ بھی انھوں نے خود کردیا کہ یہ «ليست بخطه» خود شیخ محمد عابد سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں، بلکہ انھوں نے اسے محسن بن محسن الزراقی رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۲۲۹ھ میں لکھوایا تھا۔ شیخ سندھی نے اس کی ابتدا میں صرف اس کے ابواب کی فہرس لکھی ہے۔ اس نسخہ کا تقابل اصل نسخہ سے ہوا؟ اور جس اصل سے شیخ سندھی کے لیے نسخہ نقل کیا گیا اس کی استنادی پوزیشن کیا ہے؟ یہ تفصیل بھی شیخ محمد عوامہ نے نہیں لکھی، بظاہر یہ تفصیلات بھی مفقود ہیں جس سے مزید اس نسخہ کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

رہا دوسرا نسخہ جو شیخ محمد مرتضی الزبیدی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جس کے بارے میں خود انھوں نے لکھا ہے کہ کئی مقامات پر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کے اس پر حواشی ہیں اور یہی نسخہ شیخ قاسم بن قطلو بغا رحمۃ اللہ علیہ کے پیشِ نظر تھا اور اسی نسخہ سے شیخ قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے « التعريف والإخبار بتخريج أحاديث الاختيار » میں یہ حدیث بھی نقل کی ہے اور اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ اس نسخہ کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے۔ کہ «والاعتماد عليها مفيد» اس پر اعتماد مفید ہے۔ گویا اس پر بھی اعتماد یقینی نہیں، اعتماد کی گنجائش ہے۔ مگر اس نسخہ میں بھی وہی نقص ہے جس کی طرف علامہ محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے «فتح الغفور في وضع الأيدي على الصدور» میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

«في ثبوت زيادة تحت السرة نظر، بل هي غلط، منشأه السهو،

---

[1] 27

فإني راجعت نسخة صحيحة للمصنف فرأيت فيها هذا الحديث بهذا السند وبهذه الألفاظ إلا أنه ليس فيها تحت السرة، وذكر فيها بعد هذا الحديث أثر النخعي ولفظه قريب من لفظ هذا الحديث ، وفي آخر« في الصلاة تحت السرة» فلعل بصر الكاتب زاغ من محل إلى آخر، فأدرج لفظ الموقوف في المرفوع، ويدل على ما ذكرت أن كل النسخ ليست متفقة على هذه الزيادة وأن غير واحد من أهل الحديث روى هذا الحديث ولم يذكر «"تحت السرة"» بل ما رأيت ولا سمعت أحداً من أهل العلم ذكر هذا الحديث بهذه الزيادة إلا القاسم. ①

'''' تحت السرة'' کی زیادت میں نظر ہے، بلکہ یہ زیادت غلط ہے اور اس کا سبب سہو ہے۔ میں نے مصنف ابن ابی شیبہ کا صحیح نسخہ دیکھا جس میں یہ حدیث اسی سند اور انھی الفاظ سے ہے، مگر اس میں تحت السرۃ کے الفاظ نہیں۔ اس حدیث کے بعد ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر تقریباً انھی الفاظ سے ہے جو حدیث کے الفاظ ہیں اور اس کے آخر میں «في الصلاة تحت السرة» کے الفاظ ہیں۔ غالباً کاتب کی نظر حدیث سے اس اثر کے آخری حصہ پر چلی گئی جس کی بنا پر موقوف کا لفظ مرفوع میں درج کر دیا اور یہ جو میں نے ذکر کیا ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ المصنف کے نسخے اس زیادت کے نقل کرنے میں متفق نہیں ہیں اور بہت سے محدثین نے یہ حدیث بیان کی ہے، مگر وہ ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ذکر نہیں کرتے، بلکہ میں نے

① فتح الغفور: 77,78، المطبوعه: 1977 بتحقيق الشيخ ضياء الرحمن الاعظمى

شیخ قاسم رحمہ اللہ کے علاوہ کسی عالم سے یہ روایت اس زیادت کے ساتھ نہ سنی، نہ ہی کہیں دیکھی۔''

یہی بات علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے «درة فی الظهار غش نقد الصرة» میں بھی کہی ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

روی هذا الحديث ابن أبی شيبة وروی بعده أثر النخعی ولفظهما قريب وفی آخر الأثر لفظ تحت السرة، واختلفت نسخه، ففی البعض ذكر الحديث مطلقاً من غير تعيين محل الوضع مع وجود الأثر المذكور، وفی البعض وقع الحديث المرفوع بزيادة لفظ تحت السرة بدون أثر النخعی، فيحتمل أن هذه الزيادة منشأها ترك الكاتب سهواً نحو سطر فی الوسط وإدراج لفظ الأثر فی المرفوع.[1]

''یہ حدیث ابن ابی شیبہ نے بیان کی ہے اور اس کے بعد ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر بیان کیا ہے، اور ان دونوں کے الفاظ ایک جیسے ہیں اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کے آخر میں ''تحت السرة'' کے الفاظ ہیں۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے نسخے مختلف ہیں۔ چنانچہ بعض میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کے ساتھ، ہاتھ باندھنے کی تعیین کے بغیر مطلقاً حدیث کا ذکر ہے اور بعض نسخوں میں مرفوع حدیث کے ساتھ ''تحت السرة'' کے الفاظ ہیں ان میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر نہیں ہے۔ اس لیے یہ احتمال ہے کہ مرفوع حدیث میں زیادت کاتب کے سہو کا نتیجہ ہے۔ جس سے درمیان میں ایک سطر کے قریب عبارت رہ گئی اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کے الفاظ مرفوع حدیث میں درج ہو گئے۔''

---

[1] درة: 5

علامہ سندھی رحمہ اللہ نے یہ بات جو بتکرار کہی بالکل یہی صورت شیخ محمد مرتضی الزبیدی رحمہ اللہ کے نسخہ کی ہے اور یہی نسخہ اس سے قبل علامہ قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ کے پاس تھا جیسا کہ شیخ محمد عوامہ نے تصریح کی ہے، اور اس نسخہ میں صرف مرفوع حدیث ہے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر اس سے ساقط ہے۔ جیسا کہ اس عکس سے نمایاں ہوتا ہے جو شیخ محمد عوامہ نے المجلد الثالث کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس لیے جب اس میں سے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر ساقط ہے تو اس سے علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے۔ کہ کاتب کے صرف نظر سے اثر نخعی میں ''تحت السرۃ کے الفاظ مرفوع روایت کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں، اور درمیان میں اثرِ نخعی کے الفاظ مع سند ساقط ہو گئے ہیں۔ مگر شیخ محمد عوامہ کی اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس اشکال کا جو جواب دیا وہ بڑا مضحکہ خیز اور تعجب ناک ہے ان کے الفاظ ہیں:

إن هذا تظنن وتشكك يفرح به أعداء الله والإسلام ، لو فتح لما بقي لنا ثقة بشيء من مصادر ديننا ، ومع ذلك فماذا نفعل بثبوت ذلك كله في نسخة الشيخ محمد عابد السندهي ، التي فيها الحديث والأثر ، وفي آخر كل منهما تحت السرة.[1]

''اس شک اور گمان سے اللہ تعالیٰ اور اسلام کے دشمن خوش ہوں گے، اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو ہمارے مصادرِ دینیہ کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ علاوہ ازیں پھر ہم کیا کریں گے۔ جب کہ یہ سب شیخ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ کے نسخہ میں ثابت ہے جس میں اثر اور حدیث دونوں ہیں اور دونوں کے ساتھ ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہیں۔''

---

[1] المصنف: 321/3

ہم شیخ محمد عوامہ سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ایمانداری سے بتلائیں کہ کیا قلمی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں میں اس نوعیت کی کاتبوں کے صرف نظر کی مثالیں نہیں پائی جاتیں؟ اور نقل عبارت میں اس قسم کا تسامح نہیں ہوتا؟ قارئین کرام کی تشفی کے لیے ہم اس کی چند مثالیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ مسند امام احمد[1] طبعة ميمنيه، جو سب سے قدیم طبعہ ہے طبعة دار احياء التراث اور طبعة المكتب الإسلامي بيروت[2] میں ایک حدیث کی سند اور اس کا متن یوں ہے:

ثنا سليمان بن داود ثنا عباد بن منصور عن عكرمة عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ وقف بجمع فلما أضاء كل شيء قبل أن تطلع الشمس أفاض.[3]

مسند امام احمد کی تینوں طبعات میں یہ روایت اسی طرح مندرج ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ اس سند کا متن اور اس کے مابعد روایت کی سند کا کچھ حصہ کاتب کے سہو سے حذف ہو گیا ہے۔ اصل سند اور متن یوں ہیں:

حدثنا سليمان بن داود حدثنا عباد بن منصور عن عكرمة (عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ بعث إلى أبي طيبة عشاء فجمعه وأعطاه أجره، حدثنا أبو داود عن زمعة عن عكرمة) عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ وقف بجمع فلما أضاء كل شيء قبل أن تطلع الشمس أفاض.

مسند امام احمد جو بیت الافکار الدولیۃ، الریاض سے ایک ہی جلد میں طبع ہوئی اس کی یہ

---

(1) مسند امام احمد: 327/1 (2) رقم: 3012 (3) المسند: 327/1، رقم: 3012

روایت ہے[1] اور محقق نے اشارہ کیا ہے کہ مسند احمد مطبوعہ میمنیہ میں پہلی سند کا کچھ حصہ اور اس کا متن اور دوسری سند کا ابتدائی حصہ کاتب کی غلطی سے ساقط ہو گیا ہے۔ قوسین میں ہم نے اسے واضح کر دیا ہے۔ کاتب کی نظر پہلی سند میں عکرمہ کے بعد دوسری سند میں عکرمہ پر پڑ گئی اور دوسری سند کا متن پہلی سند سے ملا دیا۔

دوسری روایت علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اطراف المسند[3] اور علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ[4] میں اسی طرح نقل کی ہے۔ یعنی «ابو داود عن زمعة عن عكرمة» سے، اور محشی نے حاشیہ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسند امام احمد[5] میں یہ روایت اس سند سے نہیں، بلکہ «سليمان بن داود ثنا عباد بن منصور عن عكرمة» سے ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

لم أجد حديث ابن عباس في مسند أحمد بهذا السند، بل إسناده هكذا: حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا سليمان بن داود ثنا عباد بن منصور عن عكرمة عن ابن عباس. الحديث.

جس طرح مسند احمد میں عکرمہ سے کاتب کی نظر نیچے کی سطر میں عکرمہ پر پڑی اور درمیانی حصہ حذف ہو گیا۔ بعینہٖ المصنف میں علامہ الزبیدی کے نسخہ میں مرفوع روایت لکھتے ہوئے ''فی الصلاۃ'' سے نظر اس کے بعد اثر ابراہیم میں الصلاۃ پر پڑی، یوں مرفوع کے ساتھ ساتھ اس کے بعد کے الفاظ ''تحت السرۃ'' بھی لکھ دیے گئے اور درمیان میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کی سند اور اس کے متن کا ابتدائی حصہ سہوِ کاتب کی نذر ہو گیا۔ اگر اس سیدھی سی بات سے مصادر دینیہ پر سے اعتماد اٹھ جانے کا خطرہ ہے تو مسند امام احمد پر اعتماد چہ معنی دارد؟ مسند احمد میں یہی ایک حدیث نہیں اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ طبعہ میمنیہ میں بہت سی احادیث ساقط ہیں۔ مگر کسی نے اختلاف نسخ کو بداعتمادی پر محمول نہیں

---

[1] مسند امام احمد: 270 [2] التحقیق: 2/475 [3] أطراف المسند: 3/220 [4] نصب الرایہ: 4/74 [5] مسند امام احمد: 1/327

کیا۔ شیخ محمد عوامہ ان حقائق سے بے خبر نہیں، مگر عصبیتِ مذہبی اس حقیقت کے قبول سے مانع ہے۔

۲۔ مسند امام احمد پر ہی موقوف نہیں جامع ترمذی جیسی متداول اور داخل نصاب کتاب کے اکثر نسخوں میں «باب مناقب معاذ بن جبل وزيد بن ثابت وأبي ابن كعب وأبي عبيدة رضي الله عنهم» میں امام ترمذی رحمہ اللہ قتادة عن انس سے ایک روایت «أرحم أمتي بأمتي أبو بكر ، الحديث» لائے ہیں اور اس کے بعد فرمایا ہے:

وقد رواه أبو قلابة عن أنس عن النبي ﷺ نحوه، حدثنا محمد ابن بشار نا عبد الوهاب بن عبد المجيد الثقفي نا خالد الحذاء عن أبي قلابة عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ لأبي بن كعب: إن الله أمرني أن أقرأ عليك لم يكن الذين كفروا. الخ [1]

حالانکہ یہ روایت اس سند سے قطعاً نہیں، بلکہ اس سند سے أرحم أمتي بأمتي أبو بكر، الحديث ہی مروی ہے، اور حدیث «قال رسول الله ﷺ لأبي بن كعب إن الله أمرني» کی سند یوں ہے:

حدثنا محمد بن بشار ثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبة قال سمعت قتادة يحدث عن أنس.

کاتب کی نظر غلطی سے پہلی سند نقل کرتے ہوئے بعد کی سند میں ''عن انس'' پر پڑی اور درمیان میں پہلی سند کا متن جو ''ارحم امتی، الحدیث'' کے الفاظ سے تھا، اور دوسری حدیث کی

---

[1] ترمذی مع التحفۃ: 344/4

سند حذف ہوگئی۔ علامہ المزی رحمہ اللہ نے تحفۃ الاشراف[1] میں اس غلطی پر خبردار کیا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت اسی طرح غلط سند سے نقل کی ہے، اور صراحت کی ہے کہ «قد دخل علیه حدیث فی حدیث» ترمذی کے اکثر نسخوں میں یہ روایت اسی طرح ہے، البتہ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ کی شرح عارضۃ الاحوذی[2] میں اور دکتور بشار عواد کی تحقیق سے دار الغرب الاسلامی سے جو نسخہ شائع ہوا اس[3] میں یہ درست سند اور متن سے منقول ہے۔

کتبِ حدیث ہی میں نہیں رجال کی کتابوں میں بھی اس نوعیت کا سہو موجود ہے۔ چنانچہ لسان المیزان میں ہے:

محمد بن عبد الله عن معاوية بن أبى سفيان قال: فذكر حديثاً منكرًا فى مدمن الخمر لا يعرف. انتهى.[4]

اب میزان الاعتدال سے اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ حقیقت کیا سے کیا ہوگئی ہے۔

محمد بن عبد الله بن معاوية بن سفيان قال فذكر حديثا (لا يعرف، محمد بن عبد الله عن أبيه قال فذكر حديثا) منكراً فى مدمن الخمر لا يعرف.[5]

غور فرمایا آپ نے کہ لسان میں ''محمد بن عبداللہ عن ابیہ'' کا ترجمہ کاتب کے سہو سے گر گیا ہے۔ پہلی سطر میں «فذكر حديثا» سے دوسری سطر میں لکھے ہوئے «فذكر حديثا» کے الفاظ پر نظر چلی گئی اور یوں درمیان کا حصہ ساقط ہوگیا جیسا کہ قوسین سے ہم نے واضح کر دیا ہے۔ ''بن معاویۃ بن سفیان'' کا عن معاویۃ بن ابی سفیان ہو جانا تو معمولی

---

[1] تحفة الأشراف: 259,325/1 [2] عارضة الأحوذی: 202,203/12 [3] ترمذی دار الغرب الإسلامی: 127,128/6 [4] لسان المیزان: 224/5 [5] المیزان: 603/3

مسئلہ ہے۔

کتبِ احادیث اور کتبِ رجال میں اس نوعیت کی متعدد مثالیں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کاتب سے اس قسم کا تغافل وتسامح ناممکن نہیں۔ اصولِ حدیث میں کتابت کے اصول اور کتاب کے معتبر ہونے کے لیے جو اصل سے تقابل وغیرہ کی شروط کا ذکر ہے وہ انھی خطرات کی بنا پر ہے۔ کاتب کی اس نوعیت کی غفلت کا کوئی مبتدی تو انکار کر سکتا ہے، مگر حیرت ہے کہ شیخ محمد عوامہ بھی اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں، بلکہ اسے مصادرِ دین پر عدمِ اعتماد کا باعث قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس نوعیت کی کاتبین کی لغزشوں سے تو کیا وضاعین کی دسیسہ کاریوں کے باوجود آج تک کسی صاحبِ علم نے مصادرِ دین پر شک نہیں کیا۔ یہ تو ایک دو لفظوں یا سطروں کی بات ہے وضاعین نے کتابوں میں کیسی کیسی تبدیلیاں کیں، رسائل لکھ کر ائمۂ اسلام کی طرف انھیں منسوب کیا، کتابیں مستعار لے کر ان میں حک واضافہ کرتے رہے۔ مگر ان کی ان تمام کارستانیوں کے باوجود کسی قابلِ اعتماد عالم نے مصادرِ دین میں شک وریب کے ڈورے نہیں ڈالے۔ محدثین اور اہلِ علم نے ہر دور میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا۔ مگر افسوس ہے کہ شیخ محمد عوامہ کو سہوِ کاتب میں مصادرِ دین مجروح ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ہماری اس مختصر وضاحت سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کاتب کا سہو اور تسامح ناممکن نہیں۔ علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے جو بات المصنف میں ''تحت السرۃ'' کی زیادت کے بارے میں کہی ہے وہ ایک واضح حقیقت ہے اور اس جیسے تسامح کی اور بھی متعدد مثالیں موجود ہے۔

اب رہی یہ بات کہ شیخ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ کے نسخہ میں جب مرفوع حدیث اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کے ساتھ دونوں جگہ پر ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہیں تو اس سے اس خدشہ کا جواب ہو جاتا ہے جس کا اظہار علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ ہمیں رہ رہ کر شیخ محمد عوامہ پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف مقدمۂ کتاب میں نسخوں کی تفصیل بیان کرتے

ہوئے صاف صاف فرماتے ہیں کہ شیخ محمد عابد کا نسخہ قابلِ اعتماد نہیں۔ اس سے صرف ہم مانوس ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں اسی نا قابلِ اعتماد نسخہ پر بڑے رسوخ سے اعتماد کا اظہار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ إنالله وإنا إليه راجعون

ہم حیران ہیں کہ جس نسخہ کو شیخ محمد عوامہ نے خود نا قابلِ اعتماد قرار دیا، اس پر یہ اعتماد کیسا؟ اور اس کے مقابلے میں جن چار نسخوں میں یہ زیادت نہیں ان پر عدمِ اعتماد کیوں؟ حالانکہ ان نسخوں میں ایک نسخہ وہ ہے جس کے بارے میں خود شیخ عوامہ نے فرمایا ہے: «هي أقدم نسخة وقفت عليها» کہ یہ سب سے قدیم نسخہ ہے جو ۶۴۸ھ میں لکھا ہے اس کا خط بھی بڑا واضح اور صاف ہے۔ اس کا ناسخ بھی ''متقن'' ہے اور یہ نسخہ بھی اصل سے مقابلہ شدہ ہے۔[1] جس کی علامت انھوں نے ''خ'' دی ہے۔ اس سب سے صحیح اور قدیم نسخہ پر اعتماد کیوں نہیں؟ تین مزید نسخوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان چار نسخوں پر تو اعتماد نہ ہو اور جسے خود «لا لا عتماد عليها» کہہ کر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہیں اس پر اعتماد کو پھر مذہبی عصبیت کا شاخسانہ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

گلِ دیگر شگفت

یہی نہیں، بلکہ مزید تعجب ناک بات یہ ہے کہ ان دو (علامہ محمد عابد سندھی اور علامہ زبیدی کے) نسخوں کے علاوہ ''ثلاث'' تین اور نسخے بھی اس زیادت کے مؤید ہیں۔ وہ نسخے کون سے ہیں؟ ان کے الفاظ ہیں:

نسخة العلامة قاسم، وقد تكون هي نسخة ت، ونسخة العلامة عبد القادر بن أبي بكر الصديق مفتي مكة المكرمة، ونسخة العلامة محمد أكرم السندي، نقل ذلك منها العلامة

[1] مقدمہ: 38,39

محمد هاشم التتوی السندي فی رسالته ترصيع الدرة علی درهم الصرة. ①

''ایک نسخہ علامہ قاسم رحمہ اللہ کا اور یہ وہی ت (یعنی علامہ الزبیدی) والا نسخہ ہے۔ دوسرا علامہ عبدالقادر بن ابوبکر الصدیق مفتی مکہ مکرمہ کا، اور تیسرا نسخہ علامہ محمد اکرم السندھی کا، جیسا کہ ان سے علامہ محمد ہاشم ٹھٹھوی سندھی نے اپنے رسالہ ''ترصیع الدرۃ علی درھم الصرۃ'' میں نقل کیا ہے۔''

حیرت ہے کہ علامہ قاسم رحمہ اللہ کے نسخہ کو علامہ زبیدی والا نسخہ قرار دینے کے باوجود اسے ایک اور نسخہ کیوں کر باور کرایا جاتا ہے؟ پھر اس نسخہ کو شیخ عابد رحمہ اللہ کے نسخہ کا مؤید قرار دینا بھی ظلمات بعضھا فوق بعض کا مصداق ہے۔ جب شیخ قاسم رحمہ اللہ کے نسخہ میں اثرِ نخعی نہیں ہے تو یہ شیخ عابد رحمہ اللہ کے نسخہ کا مؤید کیوں کر بن گیا؟ صرف اس وجہ سے کہ اس میں ''تحت السرۃ'' مرفوع روایت کے ساتھ ہے۔ اگر یہ روایت مرفوع بھی صحیح ہے تو اثرِ نخعی کے ساقط ہونے کا انکار اتنی دیدہ وری سے کیوں ہے؟ اور یہ قابلِ اعتماد نسخہ کیوں کر ہے؟ جب آپ نے خود فرمایا ہے کہ ''اس نسخہ پر اعتماد مفید ہے۔'' تو اب اس پر یہ کامل اعتماد علم کی کون سی خدمت ہے؟

رہا علامہ محمد اکرم سندھی رحمہ اللہ کا نسخہ تو اس کے ذکر کرنے میں بھی شیخ محمد عوامہ نے دیانت وامانت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کیونکہ جس کتاب کے حوالے سے انھوں نے اس نسخہ کا ذکر کیا اسی کتاب میں شیخ محمد ہاشم سندھی نے فرمایا ہے:

إذا الظاهر فی نسخة الشيخ محمد أكرم أن لفظة تحت السرة من تتمة الحديث كما هو الموجود الآن فيها و إن أثر النخعي ساقط منه بتمامه مع لفظة تحت السرة. ②

---

① حاشية المصنف: 321/3 ② ترصيع الدرة علی درهم الصرة: 7

''ظاہر ہے کہ شیخ محمد اکرم رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ حدیث کا تتمہ ہیں جیسا کہ اب بھی اس میں موجود ہے اور اس سے اثر نخعی ''تحت السرۃ'' کے ساتھ مکمل طور پر ساقط ہے۔''

لیجیے جناب! شیخ محمد اکرم رحمۃ اللہ علیہ کے نسخے کا پردہ تو شیخ محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ نے چاک کر دیا۔ اس میں بھی وہی نقص اور عیب ہے جو شیخ قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور بعد میں علامہ الزبیدی رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں ہے۔ اب انصاف شرط ہے کہ یہ ''تحت السرۃ'' کے صحیح ہونے کا مؤید کیسے ہوا؟ جیسا کہ قبل ازیں ہم وضاحت کر آئے ہیں۔

رہا علامہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ مفتی مکہ مکرمہ کا نسخہ تو اس کے بارے میں بلاشبہ شیخ محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس میں مرفوع اور اثر نخعی دونوں ہیں اور دونوں میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہیں۔ مگر انھوں نے یہ قطعاً ذکر نہیں کیا کہ یہ نسخہ کس نسخہ سے منقولہ ہے؟ اور اس کا ناسخ کون ہے؟ یہ اصل سے مقابلہ شدہ اور قابلِ اعتماد ہے یا نہیں؟ جب تک یہ امور ثابت نہ ہوں اس پر اعتماد اہلِ علم کی شان نہیں۔ ایسے نسخہ سے استدلال محض ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کا مصداق ہے۔

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

شیخ محمد عوامہ نے ''تحت السرۃ'' کے ''ثبوت'' اور ''تین نسخوں'' میں اس کے ''وجود'' پر بحث کے بعد یہ بھی ضروری سمجھا کہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی کی جانب سے شائع ہونے والے المصنف کے نسخہ میں ''تحت السرۃ'' کے اضافہ کی شرم ناک تحریف کو درست ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اس حوالے سے انھوں نے فرمایا کہ ''ادارۃ القرآن کے منتظم شیخ نور احمد نے مجھ سے حرمِ نبوی میں ذکر کیا کہ المصنف کے نسخہ میں ''تحت السرۃ'' کا اضافہ شیخ محمد ہاشم کی تحقیق کی بنیاد پر کیا ہے جو انھوں نے ''ترصیع الدرۃ'' میں کی ہے اور فرمایا ہے کہ تین نسخوں میں اضافہ موجود ہے۔ اس سے انھیں مکمل اطمینان ہوا تو ''تحت

السرۃ'' کا اضافہ کر دیا۔ انھوں نے کوئی رسول اللہ ﷺ پر کذب کی جرأت نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے مذہب کی تائید میں نص کو بدلا ہے۔[1]

عرض ہے کہ یہی بات راقم سے خود مولانا نور محمد صاحب نے ذکر کی تھی۔ راقم استاذی مکرم حضرت مولانا محمد عبداللہ محدث فیصل آبادی نور اللہ مرقدہ کے ہمراہ کتابوں کی خریداری کے لیے ادارۃ القرآن میں پہنچا۔ حضرت الاستاذ تو کتابوں کی تلاش میں مصروف ہو گئے اور یہ ناکارہ مولانا نور محمد کے پاس کھڑا ہو گیا اور انھوں نے المصنف کے بارے میں وہی بات فرمائی جو شیخ محمد عوامہ نے ذکر کی ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۴۰۷ھ بمطابق ۱۹۸۷ء میں سب سے پہلے راقم ہی نے اس تحریف سے عالم اسلام کو خبردار کیا۔ چنانچہ مسلکِ محدثین کے معروف ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ، ۲۰ فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں اس حوالے سے مفصل مضمون شائع کروایا جو بعد میں راقم ہی کے ''مقالات'' کی جلد اول میں طبع ہوا۔

میرے اسی مقالے کے حوالے سے اس تحریف سے شیخ بکر بن عبداللہ ابو زید رحمہ اللہ نے الردود[2] میں اور شیخ صلاح الدین مقبول حفظہ اللہ نے زوابع في وجه السنة قديماً وحديثاً[3] میں ذکر کر کے عالم عرب کو خبردار کیا۔ جزاهما الله أحسن الجزاء

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مولانا نور محمد مرحوم نے جو فرمایا کیا اس کی بنیاد پر ''تحت السرة'' کا اضافہ درست اور صحیح ہے؟ جس مطبوعہ نسخہ کا عکس انھوں نے شائع کیا۔ اس کی دو اشاعتوں میں یہ اضافہ بہرحال نہیں جیسا کہ پہلے ہم عرض کر آئے ہیں۔ اسی نسخہ کی تصویر میں یہ اضافہ جو کمپوز میں دوسرے حروف سے نمایاں ہے اور اپنے جعلی اور محرف ہونے کی چغلی کھا رہا ہے۔ کیا کتبِ حدیث میں سقط اور نقص کو دور کرنے کا کوئی ضابطہ ہے یا نہیں؟

المحدث الفاصل بين الراوي والواعي، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، الإلماع. مقدمہ ابن الصلاح اور اصولِ حدیث کی دیگر کتب میں تصحیح

---

[1] ملخصاً، حاشیہ: 321,322/3 [2] الردود: 181,255 [3] زوابع: 333

والحاق کا کوئی قاعدہ نہیں؟ اگر ہے تو اسے نظر انداز کر کے بے لگام اس کا اضافہ تحریف نہیں تو اور کیا ہے؟

کتاب ''المصنف'' نامور حنفی محقق و مصنف مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کی تحقیق و مراجعت سے مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے مرفوع روایت جوں کی توں ''تحت السرۃ'' کے بغیر نقل کی، اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر قوسین میں یوں نقل کیا:

[۳۹۰۷۔ حدثنا وکیع عن ربیع عن أبی معشر عن إبراھیم قال: یضع یمینه علی شماله فی الصلاة تحت السرة.]

اسی اثر پر حاشیہ نمبر (۱) کے تحت انھوں نے لکھا ہے:

سقط من الأصل اِلا آخرہ مدرجاً فیما فوقه، واستدرکته من ب والحیدر آبادیة.①

''کہ یہ اثر اصل نسخہ میں ساقط ہے، مگر اس کا آخری حصہ (''تحت السرۃ'') اوپر کی روایت میں مدرج ہے اور میں نے اس کا استدراک ب اور حیدر آبادی نسخہ سے کیا ہے۔''

مولانا اعظمی مرحوم کے ان الفاظ اور ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

۱۔ ان کے پاس بھی ''المصنف'' کا ویسا ہی نسخہ تھا جو شیخ مرتضیٰ زبیدی اور شیخ قاسم کے پاس تھا۔ جس میں حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر ساقط تھا اور اس کا آخری حصہ ''تحت السرۃ'' اوپر والی مرفوع روایت کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے بھی ایسے نسخہ کی نشان دہی کی ہے۔

۲۔ مولانا اعظمی نے دو نسخوں کی بنا پر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا اثر قوسین میں ذکر کیا۔ کیونکہ جس نسخہ کو انھوں نے اصل اور بنیاد قرار دیا اس میں یہ اثر ساقط تھا۔

۳۔ مولانا اعظمی اصل نسخہ میں سقط کی بنا پر ذخیرۂ احادیث اور ''مصادرِ دین'' کے بارے

① 351

میں اس خدشہ کا شکار نہیں جس کا اظہار شیخ محمد عوامہ نے کیا ہے۔

۴۔ انھوں نے اصل نسخہ میں مرفوع روایت کے ساتھ "تحت السرة" کا لفظ ہونے کے باوجود اس پر اعتماد نہیں کیا جیسا کہ شیخ محمد عوامہ نے اس پر اعتماد کر کے مرفوع کے ساتھ اسے باقی رکھا ہے، اور اس کے ثبوت میں دو صفحات سیاہ کر ڈالے۔

۵۔ جس نسخہ پر مرفوع روایت میں شیخ محمد عوامہ نے اعتماد کیا۔ اس میں اثر نخعی ساقط ہونے سے وہ پھر نا قابلِ اعتماد ٹھہرتا ہے۔ اور دوسرے نسخہ "ب" (جو خود ان کے نزدیک قابلِ اعتماد نہیں) سے اثر نقل کرتے ہیں اور اس فرق کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور یہ سارا کرتب نہایت تحقیق اور دیانت داری سے مسلکی عصبیت کے بغیر کیا جارہا ہے۔ سبحان اللہ۔

ہماری ان گزارشات سے اور مولانا اعظمی کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادارۃ القرآن کے کارپردازوں نے بلا تنبیہ واشارہ جو اضافہ کیا وہ بھی غلط اور امانتِ علمی کے منافی ہے اور شیخ محمد عوامہ کا دفاع "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق ہے۔

گلِ دیگر شگفت

شیخ محمد عوامہ ادارۃ القرآن دار العلوم الاسلامیہ کراچی کا دفاع ہی نہ کریں بلکہ طیب اکادمی ملتان اور مکتبہ امدادیہ ملتان کی کارستانی کی بھی فکر کریں، جنھوں نے دار الفکر سے استاذ سعید اللحام کی تحقیق سے شائع ہونے والے المصنف کے نسخہ میں صریح دھاندلی کی اور بڑے دھڑلے سے اس میں "تحت السرة" کا اضافہ کر دیا۔ البتہ انھوں نے اسے قوسین ( ) میں نقل کیا اور حاشیہ میں اضافہ کا سبب بھی ذکر کیا۔ جس کے بارے میں ہم ان شاء اللہ آئندہ بھی کچھ عرض کریں گے۔

دار الفکر سے یہ نسخہ شائع ہوا تو مرفوع روایت میں "تحت السرة" کا اضافہ نہ تھا، مگر طیب اکادمی اور مکتبہ امدادیہ ملتان نے اسی نسخہ کا عکس شائع کیا تو اس میں "تحت السرة" کا اضافہ کر دیا۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ مکتبہ راشدیہ پیر آف جھنڈا کے نسخہ سے ہاتھ

باندھنے والی روایت سے متعلقہ صفحہ کا عکس بھی ''تحت السرۃ'' کے اضافہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ مکتبہ راشدیہ کا یہ نسخہ راقم نے ایک سے زائد بار دیکھا اور اس سے استفادہ کیا، اور اسی متعلقہ روایت کے حوالے سے دوبارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں مرفوع روایت کے ساتھ ''تحت السرۃ'' کے الفاظ قطعاً نہیں۔ یہی بات اس نسخہ کے حوالے سے محترم مولانا حافظ ثناء اللہ ضیاء صاحب حفظہ اللہ نے اپنے رسالہ ''نماز میں ہاتھ کہاں باندھیں'' کے (ص ۸۴) پر حلفاً کہی کہ اس نسخہ میں مرفوع روایت کے ساتھ ''تحت السرۃ'' کے الفاظ بالکل نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے حضرت سید محب اللہ شاہ الراشدی نور اللہ مرقدہ کا وضاحتی بیان بھی ذکر کیا ہے کہ اس نسخہ میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بصارت عطا فرمائی ہے وہ آج بھی مکتبہ راشدیہ میں اس نسخہ کو دیکھ کر تشفی کر سکتا ہے۔ شیخ محمد عوامہ بتلائیں کہ کیا یہ تحریف کی بدترین جسارت نہیں؟ اور کیا یہ سارے کرتب مذہبی حمیت میں روا نہیں رکھے جا رہے؟

مزید عرض ہے

شیخ محمد عوامہ نے فرمایا ہے کہ نسخہ ''ت'' پر کئی مقامات پر علامہ عینی رحمہ اللہ کے حواشی ہیں۔ یہی نسخہ شیخ قاسم کے پیشِ نظر تھا، اور انھوں نے ''التعریف والاخبار'' میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ سے یہ حدیث نقل کی ہے اور یہی نسخہ شیخ محمد مرتضیٰ زبیدی صاحب التاج کے پاس تھا، بلکہ وہ احیاء العلوم کی شرح لکھ رہے تھے تب بھی یہ نسخہ ان کے پیشِ نظر تھا اور اس نسخہ سے وہ آثار وغیرہ نقل کرتے ہیں، بلکہ اس شرح [1] میں اس نسخہ کے ناسخ اور تاریخِ نسخ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ مقدمۂ کتاب [2] میں انھوں نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔

۱۔ مگر قابلِ غور، بلکہ حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ علامہ مرتضیٰ الزبیدی رحمہ اللہ اسی احیاء العلوم کی شرح ''اتحاف السادۃ المتقین'' کی تیسری جلد میں ہاتھ باندھنے سے متعلقہ بحث کے ضمن میں حنفی مسلک کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معروف روایت مسند احمد اور دارقطنی

---

[1] شرح: 2270/3 [2] مقدمہ کتاب: 29

وغیرہ سے تو ذکر کرتے ہیں، مگر ''المصنف'' کی یہ ''صحیح'' اور ''جید سند'' سے منقول ''روایت'' ذکر کیوں نہیں کرتے؟ ان کے الفاظ ہیں:

دليل أبي حنيفة ما رواه أحمد والدار قطني والبيهقي عن علي. ①

یہی نہیں، بلکہ مسلک حنفی کی تائید میں انھوں نے ''عقود الجواہر المنیفہ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں بھی انھوں نے ''المصنف'' کی یہ روایت ذکر نہیں کی۔ آخر کیوں؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کے نزدیک یہ روایت اسی طرح درست اور قابلِ اعتماد ہوتی تو اس کا ذکر ضرور کرتے، یہ اس بات کا قرینہ تو یہ ہے کہ ''المصنف'' کے نسخہ میں اس روایت کے نقل میں وہ مطمئن نہ تھے۔ علامہ قاسم رحمہ اللہ کا اسی نسخہ سے روایت نقل کرنا تو قابلِ اعتماد ٹھہرے، مگر علامہ الزبیدی رحمہ اللہ کا اسے نظر انداز کر دینا اس کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی دلیل کیوں نہیں؟

۲۔ بلکہ علامہ عینی رحمہ اللہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نسخہ میں کئی مقامات پر ان کے حواشی ہیں۔ انھوں نے بھی صحیح بخاری کی شرح ''عمدۃ القاری'' میں اور ہدایہ کی شرح ''البنایہ'' میں اس روایت کو ذکر نہیں کیا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ضعیف روایت کے دفاع کی کوشش تو کرتے ہیں، لیکن کیا وجہ ہے ''المصنف'' کی ''سند جید'' سے اس روایت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ کیا یہ قرینہ نہیں کہ علامہ عینی رحمہ اللہ بھی اس سند اور متن پر مطمئن نہیں تھے؟

۳۔ علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ المتوفی ۴۶۳ھ نے التمہید ② میں نماز میں ہاتھ باندھنے کے مسئلہ کے بارے میں ''المصنف'' سے متعدد آثار نقل کیے ہیں اور اجمالاً ذکر کیا ہے کہ ابراہیم نخعی اور ابو مجلز ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے قائل تھے ③ اور کسے علم نہیں کہ ان دونوں کے یہ آثار ''المصنف'' میں موجود ہیں، بلکہ علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کے بارے میں «لا یثبت» کہہ کر اس کے ضعف کی طرف اشارہ

① إتحاف السادة: 37/3 ② التمهيد: 74,86/20 ③ التمهيد: 75/20

بھی کر دیا ہے۔ اگر حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہوتے تو انھیں بھی وہ ذکر کرتے۔ انہیں ذکر نہ کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ''المصنف'' میں یہ اضافہ غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ کسی مسئلہ پر کسی دلیل کا ذکر نہ کرنا اور کسی مسئلہ میں کتاب کے متعلقہ باب میں سے متعدد آثار نقل کرنا اور ''قابل اعتبار سند'' سے مذکورہ روایت ذکر نہ کرنے میں فرق بالکل واضح ہے۔ علامہ زیلعی، حافظ ابن حجر، علامہ ابن الملقن، علامہ ابن ہمام رحمہم اللہ وغیرہ متاخرین میں سے بھی کسی نے اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ ان کے بارے میں ممکن ہے کہ یہ عذر لنگ پیش کیا جائے کہ انھوں نے ''المصنف'' کی طرف رجوع نہیں کیا اور نہ اس باب کے آثار کو ہی المصنف کے حوالے سے ذکر کیا۔ لیکن علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے بارے میں اس کا قطعاً امکان نہیں۔

۴۔ شیخ محمد عوامہ روایات کی تخریج اور اس کے طرق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس باب «وضع اليمين على الشمال» کی روایات کی بھی بالعموم انھوں نے تخریج کی ہے، مگر ''جید سند'' سے مروی اس روایت کی تخریج کیوں نہیں کی؟

انھوں نے ساری توجہ، بلکہ پوری قوت ''تحت السرۃ'' کے اضافہ کے صحیح ہونے میں تو صرف کر دی، مگر اس کی تخریج کے حوالے سے خاموشی اختیار کی، آخر کیوں؟ کیا «وكيع عن موسى بن عمير عن علقمة عن أبيه» کی سند سے اس موضوع کی کہیں کوئی روایت نہیں تھی کہ اس بارے میں انھوں نے چپ سادھ لی ہے۔ اگر تھی تو اس سے خاموشی اور بے اعتنائی کیا اس خطرہ کی بنا پر تو نہیں کہ اس سے تو اس زیادت کا بھرم کھل جائے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی «الرقيب العليم بالنيات» ہیں جیسا کہ انھوں نے اس روایت پر بحث کے اختتام پر لکھا ہے، مگر اسلوب سے ہٹ کر اس کی تخریج سے خاموشی اس بات کی چغلی نہیں کھا رہی کہ یہاں معاملہ رکھ رکھاؤ اور ہاتھ کی صفائی کا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ ساری کارروائی طفل تسلی قرار پائے گی اور مسلکی حمیت کا شاخسانہ ٹھہرے گی۔

ہم عرض کرتے ہیں امام وکیع کی اس سند سے یہ روایت مسند امام احمد [1]، سنن دار قطنی [2] اور شرح السنۃ للبغوی [3] میں ''تحت السرۃ'' کے بغیر ہے۔ امام وکیع کے معاصر امام عبداللہ بن مبارک نے بھی یہ روایت موسیٰ بن عمیر سے اس زیادت کے بغیر بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو، نسائی [4]، السنن الکبریٰ لہ ایضاً، التمہید [5]، امام وکیع کے تیسرے معاصر امام ابونعیم رحمہ اللہ فضل بن دکین بھی اسے بغیر زیادت کے روایت کرتے ہیں۔ [6]

یہی وجہ ہے کہ حنفی مسلک کے معروف وکیل علامہ نیموی رحمہ اللہ نے التعلیق الحسن میں اس اضافہ کو غیر محفوظ قرار دیا ہے۔ چنانچہ پہلے انھوں نے اس کے بارے میں حافظ قاسم بن قطلو بغا، علامہ ابوالطیب المدنی اور شیخ عابد سندھی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے انھوں نے اسے سند جید، رجالہ ثقات قرار دیا ہے۔ پھر علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کا موقف بیان کیا ہے کہ یہ زیادت کاتب کی غلطی کا کرشمہ ہے اس کے بعد اس کے جواب میں علامہ قائم سندھی کی فوز الکرام سے علامہ حیات سندھی رحمہ اللہ کی تردید نقل کی ہے کہ یہ زیادت صحیح ہے۔ یہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

الإنصاف أن هذه الزيادة وإن كانت صحيحة لوجودها في أكثر النسخ من المصنف لكنها مخالفة لروايات الثقات فكانت غير محفوظة. [7]

انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ زیادتی اگرچہ ''المصنف'' کے اکثر نسخوں میں ہونے کی وجہ سے صحیح ہے۔ لیکن یہ زیادت ثقات کی روایات کے مخالفت ہے اس لیے غیر محفوظ ہے۔ ''اکثر نسخوں'' کی بات تو ان شاء اللہ ہم بعد میں کریں گے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا

---

[1] مسند امام احمد: 316/4 [2] دارقطنی: 286/1 [3] شرح السنۃ للبغوی 30/3 [4] نسائی: 105/1 [5] التمہید: 72/20 [6] التمہید: 72/20، السنن الکبری للبیہقی: 28/2، المعجم الکبیر للطبرانی: 9/22، تہذیب الکمال للمزی: 499/11 ترجمہ موسیٰ بن عمیر. [7] التعلیق الحسن: 71 ط ملتان

ہے کہ علامہ نیموی رحمہ اللہ اس زیادت کو غیر محفوظ قرار دیتے ہیں اور وہ علامہ قاسم رحمہ اللہ وغیرہ کے ہمنوا نہیں ہیں کہ اسے بطور استدلال پیش کیا جائے۔

بلکہ مولانا بدر عالم رحمہ اللہ نے فیض الباری کے حاشیہ میں علامہ نیموی رحمہ اللہ کا یہی موقف ان کی ایک دوسری کتاب «الدرة الغرة في وضع اليدين تحت السرة» سے نقل کیا ہے کہ علامہ موصوف شیخ قاسم، شیخ عابد سندھی اور علامہ ابو الطیب المدنی رحمہم اللہ کے موقف کے برعکس اس روایت کی توثیق پر مطمئن نہیں ان کے الفاظ ہیں:

لم يرتض به العلامة ظهير أحسن رحمه الله تعالىٰ وذهب إلى أن «تلك الزيادة معلولة» [1]

''علامہ ظہیر احسن نیموی رحمہ اللہ اس کی توثیق پر راضی نہیں، وہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ زیادت معلول ہے۔''

ظاہر ہے کہ امام وکیع اور ان کے دوسرے معاصرین کی روایات ذخیرہ کتب احادیث میں موجود ہیں اور ان میں ''تحت السرة'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ المصنف کے کئی نسخوں میں بھی یہ اضافہ نہیں ہے اب یہ علم و دیانت کی کون سی معراج ہے کہ ''نا قابلِ اعتماد'' اور ''غلط نسخوں'' کی بنا پر اسے صحیح قرار دیا جائے۔ یاد رہے کہ شیخ عابد کے نسخے کو شیخ محمد عوامہ ''نا قابلِ اعتماد'' قرار دے چکے اور دوسرے نسخہ میں ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے اثر کا ساقط ہونا بھی انھوں نے تسلیم کیا۔ جیسا کہ پہلے ضروری وضاحت گزر چکی ہے۔

رہی علامہ نیموی رحمہ اللہ کی یہ بات کہ المصنف کے ''اکثر'' نسخوں میں یہ زیادتی پائی جاتی ہے۔ تو یہ بات دراصل انھوں نے پہلے علامہ قائم سندھی رحمہ اللہ کے رسالہ فوز الکرام کے حوالے سے نقل کی ہے، اور اسی تناظر میں انھوں نے اکثر نسخوں میں اس کے وجود کا ذکر کیا ہے۔ خود انھوں نے کسی نسخہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ''الدرة الغرة'' میں مکتبہ محمودیہ کا نام انھوں نے لیا ہے کہ اس کے نسخہ میں یہ زیادت موجود ہے۔ اور یہ وہی نسخہ ہے جسے شیخ محمد عوامہ

---

[1] حاشیہ فیض الباری: 2/267

«لا للاعتماد علیها» کہہ کر نا قابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں۔

فوز الکرام کا نسخہ پیر جھنڈا کے مکتبہ میں راقم کی نظر سے گزرا ہے، اور اس کی ایک نقل راقم کے پاس بحمد اللہ موجود ہے۔ اس کے حوالے سے علامہ نیموی رحمہ اللہ نے جو نقل کیا وہ عبارت اس وقت بھی پیش نظر ہے۔ جس میں شیخ قائم رحمہ اللہ نے شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ مفتی مکہ مکرمہ کے نسخہ کا اور شیخ قاسم رحمہ اللہ کے «التعریف والاخبار بتخریج احادیث الاختیار» میں اس روایت کو نقل کرنے کا نیز ایک اور نسخہ میں اس روایت کے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اب بتلایئے یہ ''اکثر نسخے'' کیوں کر بن گئے؟ شیخ قاسم اور مفتی مکہ مکرمہ کے نسخوں کے حوالے سے پہلے بات گزر چکی ہے۔ جبکہ شیخ قاسم کا تو نسخہ ہی ناقص ہے اس پر اعتماد چہ معنی دارد؟ رہا تیسرا نسخہ تو اس کی کوئی تفصیل شیخ قائم رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کی کہ اس کی پوزیشن کا اندازہ لگایا جا سکے۔

اس کے برعکس علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ مرحوم علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کا موقف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ولا عجب أن يكون كذلك فإني راجعت ثلاث نسخ للمصنف فما وجدته في واحدة منها.[1]

> ''یعنی کوئی تعجب نہیں کہ بات اسی طرح ہو جیسے علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ خود میں نے المصنف کے تین نسخے دیکھے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی میں نے اس (تحت السرۃ) کو نہیں پایا۔''

علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے ان تین نسخوں کی وضاحت نہیں کی کہ وہ کن مکتبات میں تھے۔ لیکن تین کے مقابلے میں یہ بھی تین ہیں، اور شیخ محمد عوامہ نے المصنف[2] کے حاشیہ میں تسلیم کیا ہے کہ چار نسخوں میں یہ زیادت نہیں ہے۔

---

[1] فیض الباری: 267 [2] المصنف: 321/1

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی انھی نسخوں پر اعتماد کیا محرف نسخہ پر نہیں۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں شیخ کمال یوسف کی مراجعت سے دار التاج بیروت سے جو المصنف کا نسخہ شائع ہوا ہے اس میں بھی ''تحت السرة'' کا اضافہ نہیں ہے۔ استاذ سعد اللحام کی تحقیق سے جو نسخہ شائع ہوا اس میں بھی یہ اضافہ نہیں، مگر بعد میں طیب اکادمی ملتان نے اس میں اضافہ کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں شیخ محمد عبدالسلام شاہین کی تصحیح سے دار الکتب العلمیہ بیروت سے المصنف کا جو نسخہ شائع ہوا اس[1] میں بھی یہ اضافہ نہیں ہے۔ شیخ حمد بن عبداللہ اور شیخ محمد بن ابراہیم کی تحقیق سے ''المصنف'' کی ایک جلد شائع ہوئی۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مکمل شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ اس نسخہ کو انھوں نے آٹھ قلمی نسخوں اور تین مطبوعہ نسخوں کے تقابل سے شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں انھوں نے ادارة القرآن کی طرف سے محرفہ نسخہ کا بھی ذکر کیا۔ لکھتے ہیں:

هذا الحديث يوجد في الطبعات الثلاث من المصنف[2] بدون هذه الزيادة ولم يشر ناشرها إلى النسخة التي وجدت فيها هذه الزيادة وأين توجد هذه النسخة ، فعلى هذا سقطت هذه الطبعة من الاعتماد العلمي عليها بل حتى جميع مطبوعات هذه الدار يجب ألا يعتمد عليها، فماذا بعد الكذب على النبي ﷺ.[3]

''یہ حدیث المصنف کے تین نسخوں میں اس زیادت کے بغیر ہے۔ ناشر ادارة القرآن نے اس نسخہ کی نشان دہی نہیں کی جس میں یہ زیادتی ہے اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ نسخہ کہاں ہے۔ اس بنا پر ادارة القرآن کے شائع کردہ نسخہ پر اعتماد نہیں رہا، بلکہ اس کی تمام مطبوعات قابلِ اعتماد نہیں رہیں۔ جو نبی ﷺ پر جھوٹ باندھ سکتا ہے وہ کیا نہیں کر سکتا۔''

---

[1] المصنف: 342/1 [2] المصنف: 390/1 [3] المصنف: 55/1 الفصل الثانی

تین مطبوعہ نسخوں اور آٹھ خطی نسخوں کے برعکس ادارۃ القرآن کی جسارت پر جو صدائے احتجاج ان حضرات نے بلند کی ہے بھلا اس کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ اکثر نسخوں میں یہ زیادت موجود ہے۔ کلا ثم کلا

۵۔ علامہ علاء الدین ابن الترکمانی رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۴۵ھ یا ۷۵۰) نے ''الجوہر النقی'' میں امام بیہقی رحمہ اللہ پر تعاقب کے ساتھ ساتھ حنفی مسلک کی جو وکالت کی ہے اہلِ علم اس کی حیثیت سے باخبر ہیں۔ نماز میں ہاتھ باندھنے کے مسئلہ میں بھی انھوں نے اپنے مسلک کا دفاع کیا اور اسی ضمن میں امام بیہقی رحمہ اللہ کے موقف کے برعکس مصنف ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ سے ابو مجلز رحمہ اللہ کا اثر ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے بارے میں بالاسناد نقل کیا ہے۔[1] انصاف شرط ہے کہ اگر المصنف میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''تحت السرۃ'' کے الفاظ ہوتے تو وہ انھیں ذکر نہ کرتے؟ امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت وائل رحمہ اللہ کی روایت موسیٰ ابن عمیر کی سند سے بھی ذکر کی ہے جس میں ''تحت السرۃ'' نہیں ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اور مؤمل بن إسماعیل عن الثوری عن عاصم بن کلیب عن أبیہ عن وائل کی سند سے ''علی صدرہ'' کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں۔ علامہ ماردینی رحمہ اللہ پہلی روایت پر بالکل خاموش ہیں اور دوسری پر مؤمل کی بنا پر جرح کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں المصنف میں ''سند جید'' سے ''تحت السرۃ'' کی روایت ہوتی تو وہ بھی یقیناً ذکر کرتے۔ ان کی یہ خاموشی بھی اس بات کی بین دلیل ہے کہ ''المصنف'' کے کسی قابلِ اعتماد نسخہ میں ۷۴۵ھ تک ''تحت السرۃ'' کے الفاظ نہیں تھے۔

ہماری ان گزارشات سے نصف النہار کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''المصنف'' میں ''تحت السرۃ'' کا اضافہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں قطعاً صحیح نہیں، اور شیخ محمد عوامہ نے چار نسخوں کے مقابلے میں جن دو نسخوں کی بنیاد پر یہ اضافہ کیا اور اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کے اپنے مسلمات کی روشنی میں درست نہیں۔ قدیم اور صحیح نسخوں کو

[1] الجوہر النقی: 31/2

نظر انداز کر کے نا قابلِ اعتماد اور غلط نسخہ پر اس کی بنیاد محض مسلکی حمیت کا شاخسانہ ہے، یہ کوئی علم کی خدمت نہیں۔ پھر ادارۃ القرآن کراچی کے تحت طبع ہونے والے محرف نسخہ کا جو دفاع کیا وہ بھی ان کی علمی ثقاہت و دیانت کے منافی ہے۔ ان سے تو کسی قدر طیب اکادمی اور مکتبہ امدادیہ ملتان والے بہتر نکلے کہ انھوں نے دار الفکر سے طبع ہونے والے نسخہ کو جب شائع کیا تو اس میں گو ''تحت السرة'' کا اضافہ کیا، مگر یہ اضافہ بریکٹ میں (تحت السرة) کیا، مگر اس کے حاشیہ میں جو انھوں نے لکھا وہ ان کے تعصب، بلکہ ان کی بے خبری کا منہ بولتا ثبوت ہے، لکھتے ہیں:

تحت السرة، هذه ألفاظ موجودة في بعض نسخ المصنف وزيادة الثقة معتبرة، ولم ينكرها أحد إلاّ محمد حيات السندهي المتوفى ١١٦٨ھ الذي كان تلميذاً لمحمد معين تتوي الشيعي. الخ

''کہ ''تحت السرة'' کے الفاظ ''المصنف'' کے بعض نسخوں میں ہیں اور ثقہ کی زیادت معتبر ہوتی ہے۔ اس کا انکار سوائے محمد حیات سندھی (المتوفی: ۱۱۶۳ھ) کے کسی اور نے نہیں کیا جو محمد معین ٹھٹھوی شیعہ کے شاگرد تھے۔''

لیجیے یہ ہے بنیاد اس اضافے کی۔

اولاً: تو انھوں نے خود کسی نسخہ کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کے ثبوت کا مدار صرف علامہ محمد ہاشم رحمہ اللہ سندھی کی ''درہم الصرة'' پر ہے جیسا کہ حاشیہ میں انھوں نے لکھا، بلکہ اس جلد کے آخر میں یہ رسالہ بھی شائع کر دیا۔ اس رسالہ میں جو بنیاد شیخ محمد ہاشم رحمہ اللہ نے ذکر کی اس کی حقیقت ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

ثانیاً: محشی کی علمی پختگی پر یہ جملہ ہی دال ہے۔ «وزيادة الثقة معتبرة» جناب من! یہ زیادت ثقہ نہیں ثبوتِ نسخہ کا مسئلہ ہے۔

ثالثاً: کہا گیا کہ اس کا انکار سوائے علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کے اور کسی نے نہیں کیا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ علامہ نیموی رحمہ اللہ اور علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی اس زیادت کو ''غیر محفوظ'' اور ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے، بلکہ اس کا انکار مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ نے بھی کیا جیسا کہ پہلے ہم نقل کر آئے ہیں۔ پھر محشی کو شاید علم نہیں کہ شیخ محمد ہاشم رحمہ اللہ کا رسالہ «درهم الصرة في وضع اليدين تحت السرة» دراصل شیخ ابوالحسن السندھی محشی صحیح بخاری وغیرہ کے رد میں ہے، اور شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ کا رسالہ «درة في اظهار غش نقد الصرة» کے سرورق پر لکھا ہے کہ انھوں نے یہ رسالہ اپنے شیخ ابوالحسن کے مشورہ اور تعاون سے لکھا ہے، اور اس رسالہ میں بھی انھوں نے ''المصنف'' کے نسخہ میں اس اضافے کو کاتب کی غلطی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ''تحت السرة'' کے اضافے کا انکار صرف علامہ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ ہی نے نہیں کیا بلکہ ان کے شیخ ابوالحسن سندھی رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے۔ مزید برآں عرض ہے کہ درہم الصرۃ کا جواب شیخ پیر سید رشد اللہ شاہ پیر آف جھنڈا صاحب العلم الرابع نے ''درج الدرر في وضع الايدي على الصدر'' میں دیا ہے۔ جس کے کلمۂ افتتاحیہ میں انھوں نے لکھا ہے:

«فهذا تعليق أنيق وتحقيق عميق أبديته لإظهار ما في الرسالة المسماة بدرهم الصرة في وضع اليدين تحت السرة من الغش الموجب للعار»

اس لیے یہ کہنا کہ اس اضافے کا انکار شیخ محمد حیات رحمہ اللہ کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا، قطعاً غلط اور محشی کی بے خبری کی دلیل ہے۔

رابعاً: محشی کے تعصب کا اندازہ کیجیے کہ وہ شیخ ہاشم رحمہ اللہ کا ذکرِ خیر تو ''الشيخ محمد هاشم السندي'' کے الفاظ سے کرتا ہے، مگر شیخ محمد حیات رحمہ اللہ کے بارے میں صرف ''محمد حیات'' لکھتا ہے۔

خامساً: اس کے تعصب کی آگ اسی پر سرد نہیں ہوئی، بلکہ ''محمد حیات'' کے تعارف میں مزید لکھتا ہے: ''وہ محمد معین ٹھٹھوی شیعہ کا شاگرد تھا'' محمد معین السندھی کون تھے؟ اور کیسے تھے؟ ہم اس بحث میں جانا نہیں چاہتے ۔ اگر وہ شیعہ تھے اور علامہ محمد حیات رحمہ اللہ کا ان سے تلمذ جرم ہے تو جابر بن یزید جعفی جیسے رافضی سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کا تلمذ چہ معنی دارد؟

نہ تم طعنے ہمیں دیتے نہ ہم فریاد یوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

ادھر محمد معین کے تلمذ کا الٹا اثر شیخ محمد حیات پر یہ ہوا کہ انہوں نے ''ابطال الضرائح'' لکھ کر قبور یین اور شیعوں کا رد کیا۔ پھر شیخ سندھی رحمہ اللہ نے علامہ ابوالحسن السندھی المدنی رحمہ اللہ سے حدیث کا درس لیا اور ان کی وفات کے بعد انہی کی مسند کے امین بنے، اور ۲۴ سال تک حرمِ نبوی میں ان کی مسند پر درس حدیث دیا۔ ان کے علاوہ الشیخ عبداللہ سالم المکی، الشیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی اور الشیخ حسن بن علی العجمی رحمہم اللہ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ مگر محشی کو اپنے خبثِ باطن کی بنا پر یہ مشائخ نظر نہیں آتے۔ مولانا سید عبدالحی لکھنوی انھیں ان القاب سے یاد کرتے ہیں:

الشيخ الإمام العالم الكبير المحدث محمد حيات. (1)

سادساً: محشی نے شیخ محمد حیات کی وفات ۱۱۶۸ھ میں ذکر کی ہے، مگر یہ بھی غلط ہے ان کی وفات ۱۱۶۳ھ میں ہوئی جیسا کہ سید عبدالحی نے ذکر کیا ہے: «سنة ثلاث وستين ومائة والف» اس وضاحت سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ''تحت السرة'' کا اضافہ کرنے والے کس قدر حق وانصاف کے پاسدار ہیں۔ جن کے تعصب کا یہ عالم ہو وہ اگر اسے صحیح قرار دیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ فاعتبروا يا أولي الأبصار

(1) نزهة الخواطر: 301/6

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المصنف لعبد الرزاق کے الجزء المفقود کی

"دست یابی"

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس امت کو جن خصائص اور اعزازات سے نوازا ہے، ان میں سے ایک عظیم الشان خصوصیت یہ ہے کہ اسے خاتم النبیین سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے فرامین کو بالاسناد محفوظ کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے۔ سابقہ امتوں میں سے کسی کو اپنے نبی کے آثار وارشادات متصل سند کے ساتھ جمع کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ

الإسناد من الدين ولولا الإسناد لقال من شاء ماشاء.[1]

"اسناد" دین میں سے ہے، اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہتا۔"

خطیب بغدادی نے الکفایہ[2] میں ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ "جو شخص دینی امور کو بلا سند لیتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو چھت پر بغیر سیڑھی کے چڑھتا ہے۔" سند کا یہ اہتمام

---

(1) مقدمہ صحیح مسلم: 12/1، العلل الصغیر للترمذی مع التحفہ: 388/4

(2) الکفایہ: 393

احادیث و آثار تک ہی محدود نہیں بلکہ لغت، شعر و ادب اور تاریخ و رجال بھی بالاسناد بیان کیے جاتے ہیں۔

سند کے اسی اہتمام کی بنا پر کتب مصنفہ کی روایت بھی قرناً بعد قرن بالاسناد ہوتی رہی۔ بلکہ کتاب کی ابتدا یا اس کے اختتام پر اس کی مسموعات کو بھی ناسخین نے سند کے اہتمام کے ساتھ محفوظ کیا اور کتاب نقل کرنے کے اصول وضوابط مقرر کیے، نقل شدہ نسخہ کی صحت اور عدم صحت متعین کی، جس کی تفصیل الکفایة، الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع، الإلماع فی ضبط الروایة وتقیید الأسماع، علوم الحدیث لابن الصلاح وغیرہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سند اور کتاب کی اس قدر حفاظت وصیانت کے باوصف وضاعین وکذابین اور متساہلین سے جو باتیں صادر ہوئیں، وہ بڑی حیرت ناک اور عجیب ہیں۔ شیوخ اور محدثین کی روایات میں اپنی روایت بنا کر داخل کر دینا، کتابیں لکھ کر ثقہ محدثین اور اہلِ علم کی طرف منسوب کر دینا، محدث کی کتاب میں اپنے لکھے ہوئے اجزا شامل کر کے باور کرانا کہ یہ بھی اس کا حصہ ہیں، کذابین اور ضعفا کا یہ مشغلہ رہا ہے، جس کی تفصیل بڑی طویل ہے۔ اس حوالے سے شائقین سفیان بن وکیع، قیس بن ربیع الاسدی، عبداللہ بن صالح، حبیب بن ابی حبیب الوراق، خالد بن نجیح کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔ یحییٰ بن حسان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا ایک جماعت کے پاس ایک جز تھا جسے اس نے ابن لھیعہ سے سنا تھا، میں نے اسے دیکھا تو اس میں (حقیقتاً) ایک حدیث بھی ابن لھیعہ کی نہ تھی۔ پھر ابن لھیعہ سے ملا تو انہیں اس کی اطلاع دی، انھوں نے فرمایا میں کیا کروں، میرے پاس کتاب لے کر آتے ہیں تو کہتے ہیں یہ آپ کی احادیث ہیں (انھیں بیان کیجیے) تو میں انھیں بیان کر دیتا ہوں۔ حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایسا ہمارے شیوخ کے زمانے میں بھی ہوتا تھا۔[1]

حاجی خلیفہ نے ''مقدمہ ابی اللیث'' کی شرح جو شیخ مصلح الدین مصطفیٰ بن زکریا المتوفی

[1] مقدمہ ابن الصلاح: 187

۸۰۹ھ نے کی اور اس کا نام ''التوضیح'' رکھا، کے بارے میں علامہ شعرانی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ شرح بڑی عظیم ہے۔ اس کے مؤلف مصر گئے تو بعض حاسدین نے ان کی کتاب میں ایک عبارت داخل کر دی، جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توہین ہوتی تھی۔ اس بنا پر انھوں نے ان کے کفر اور قتل کا فتویٰ دیا۔ شیخ مصلح الدین نے وہاں سے بھاگ کر جان بچائی۔[1]

علامہ شعرانی رحمہ اللہ نے ''الیواقیت والجواہر''[2] میں ذکر کیا ہے کہ ''شیخ ابن عربی کی فتوحات میں جو عبارتیں ظاہرِ شریعت سے معارض ہیں وہ سب مدسوس ہیں۔ مجھے اس حقیقت سے سیدی ابوطاہر المغربی نے آگاہ کیا جو اس وقت مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ انھوں نے مجھے فتوحات کا وہ نسخہ دکھایا جس کا مقابلہ انھوں نے قونیہ میں ابن عربی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے کیا۔ اس نسخے میں وہ فقرے نہیں تھے جو میرے نسخے میں تھے اور میں نے ان فقروں میں توقف کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملاحدہ اور زنادقہ نے امام احمد، علامہ مجدالدین فیروز آبادی اور امام غزالی رحمہم اللہ کی تصانیف خصوصاً ''احیاء العلوم'' میں تدسیس کی۔ باطنیہ کے ایک شخص نے ایک کتاب لکھ کر میری طرف منسوب کر دی اور تین سال تک یہ کتاب میری زندگی میں متداول رہی۔ زنادقہ نے امام احمد رحمہ اللہ کے مرض الموت کے ایام میں ایک کتاب لکھ کر پوشیدہ طور پر ان کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ اگر امام احمد رحمہ اللہ کے تلامذہ ان کے عقائد سے بخوبی واقف نہ ہوتے تو جو کچھ انھوں نے تکیے کے نیچے پایا تھا اس کی بنا پر لوگ بڑے فتنہ میں مبتلا ہو جاتے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے روافض کے مکر وفریب شمار کرتے ہوئے بتیسویں مکر میں ذکر کیا ہے کہ ان کے علماء کی جماعت نے اہلِ سنت کی کتابوں خصوصاً تفسیروں اور تاریخ میں جو اکثر علماء اور طلباء کے ہاتھوں میں نہ تھیں، نیز بعض کتب احادیث میں جو مشہور نہ تھیں اور ان کے نسخے بھی متعدد نہیں ملتے، نہایت جھوٹی باتیں بنا بنا کر جن سے شیعہ مذہب

[1] کشف الظنون: 1795/2 [2] الیواقیت والجواهر: 7

کو تقویت ملے اور سنیوں کا مذہب باطل قرار پائے، شامل کی ہیں۔[1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک کتاب «کتاب الصلاۃ» کے نام سے مصر سے مطبوع ہے۔ حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے امام صاحب کی تصنیف قرار دیا ہے مگر حافظ ذہبی رحمہ اللہ صاف صاف فرماتے ہیں۔ «هو موضوع على الإمام» یہ امام صاحب پر افترا ہے۔[2] اسی طرح السیر[3] میں بھی انھوں نے اس کی نسبت امام احمد کی طرف ''باطل'' قرار دی ہے۔ نیز فرمایا ہے کہ الرد على الجهمية اور احمد بن جعفر الاصطخری کے اس حوالے سے رسالے کا انتساب بھی امام صاحب کی طرف درست نہیں۔ یہاں اس قسم کے واقعات کا استیعاب مقصود نہیں۔ تاہم مزید دیکھیے کہ اباء بن جعفر نے تین سو سے زائد احادیث وضع کر کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔[4]

«الأربعون الودعانیہ» کی احادیث بھی وضاع راوی کی گھڑت ہیں جسے قاضی ابونصر محمد بن علی ابن ودعان نے اپنے نام سے متعارف کروایا۔[5]

قاضی عبداللہ بن محمد بن جعفر القزوینی فقیہ شافعی نے ''سنن الشافعی'' کے نام سے کتاب لکھی۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس میں اس نے دو سو احادیث ایسی درج کیں، جنھیں امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان نہیں کیا۔[6] «الفقہ الأکبر» کے نام سے امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک کتاب مطبوع ہے اور «الكوكب الأزهر شرح الفقه الأكبر» کے نام سے المکتبة التجارية مكة مكرمة سے وہ شائع ہوئی ہے۔ شیخ علامہ مشہور ابن حسن آل سلمان فرماتے ہیں:

«الفقه الأكبر» المكذوب على الإمام محمد بن إدريس الشافعي»

کہ الفقہ الاکبر، امام شافعی پر افترا اور جھوٹ ہے۔[7] حاجی خلیفہ نے بھی فرمایا ہے: «لكن

---

① تحفہ اثنا عشریہ: 69 باب ثانی ② السیر: 330/11 ③ السیر: 287/11 ④ میزان: 17/1 وغیرہ ⑤ ذیل اللآلی: 200، اللسان: 506/2، السیر: 166/19 ⑥ میزان: 495/2
⑦ کتب حذر منها العلماء: 293/2

فيه شك والظن الغالب أنه من تأليف بعض أكابر العلماء» کہ الفقہ الاکبر کا انتساب امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف ہے لیکن اس انتساب میں شک ہے، ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ بعض اکابر علماء کی تصنیف ہے۔ ①

ہماری ان گزارشات سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین کی بنیاد اور اس کی صیانت وحفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ سند ہے جو اس ملت اور امت کا خاصہ ہے۔ مگر زنادقہ نے مختلف حربوں سے اس کو گدلا کرنے کی کوشش کی لیکن محدثین کرام اور دیگر اہلِ علم حضرات نے ان کی ان سازشوں سے خبردار کیا اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا۔

جزا هم الله أحسن الجزاء عناوعن جميع المسلمين

مصنف عبدالرزاق کا جزوِ مفقود

ذخیرۂ کتبِ احادیث میں ایک مشہور کتاب امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی ''المصنف'' ہے، جو سب سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کی تحقیق سے ۱۳۹۰ھ بمطابق ۱۹۷۰ء میں حیدر آباد دکن سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ مگر یہ طبع اپنی ابتدا کے اعتبار سے ناقص ہے بلکہ اس کی پانچویں جلد کی ابتدا میں بھی نقص پایا جاتا ہے جیسا کہ خود انھوں نے پہلی جلد کی ابتدا میں اس کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

إن النسخ التي عثرنا عليها أو التي أحرزناها مصورة أومخطوطة...كلهاناقصة إلا نسخة مراد ملا...فإنها كاملة إلا نقصا بسيطاً في أولها وفي فاتحة المجلد الخامس من مجلدات الأصل فيمانرى.

اب حال ہی میں ''المصنف'' کا ابتدائی حصہ دکتور عیسیٰ بن عبداللہ الحمیری کی تحقیق

① كشف الظنون: 1288/2

سے ۲۰۰۵ء میں طبع ہوا، جس پر ناشر کا کوئی نام نہیں۔ البتہ اس نسخے کا عکس بعد میں دسمبر ۲۰۰۵ء ہی میں مؤسسۃ الشرف لاہور کے تحت جناب محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب کے مقدمۃ الطبعۃ الثانیۃ کے ساتھ طبع ہوا۔ اسی نسخہ کے بارے میں پہلے ماہنامہ ''اہلِ سنت'' گجرات میں اگست ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں، اور اس کے بعد ماہنامہ ''نور الحبیب'' بصیر پور جولائی ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں، پھر ماہنامہ ''سوئے حجاز'' لاہور اکتوبر ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں ''عالمِ اسلام کے لیے عظیم الشان خوشخبری'' دی گئی کہ حدیثِ نور اور حدیثِ عدمِ سایہ کی بازیافت ہو چکی جو مصنف عبدالرزاق کا ابتدائی حصہ ہے، جو عنقریب منصۂ شہود پر آنے والا ہے۔ بلکہ ''سوئے حرم'' نے تو اس حوالے سے سات احادیث شائع بھی کر دیں جو اسی موضوع سے متعلق تھیں۔

حدیث پاک کی خدمت بلاشبہ بڑی عظیم الشان سعادت ہے اور احادیث مبارکہ کے نایاب جواہر پاروں کو تلاش کر کے زیورِ طبع سے آراستہ کرنا دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ تاہم یہ بات بہر نوع ضروری ہے کہ پوری ژرف نگاہی اور دیانت داری سے یہ کھوج لگایا جائے کہ اس کتاب یا جز کا پایۂ استناد و انتساب کس حد تک درست ہے؟ محدثینِ کرام نے اس کے لیے جو اصول وضوابط مقرر کیے ہیں کیا یہ رسالہ یا جز اس میزان پر صحیح طور پر ثابت آتا ہے یا نہیں؟ ہم جب اس حوالے سے المصنف کے اس حصے کا جائزہ لیتے ہیں تو کسی اعتبار سے اس کا انتساب امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی طرف درست ثابت نہیں ہوتا۔ جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

① پہلی بنیادی قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ دکتور عیسیٰ الحمیری نے اس نسخے کے بارے میں لکھا ہے کہ

ولیس علی النسخة التی بین یدینا أیة سماعات، وهی نسخة کاملة، أملك منها الآن المجلدین الأول والثانی فقط، وأترك

الحكم للقارئ الكريم وأهل الاختصاص وأضع بين أيديهم الجزء المفقود.

''ہمارے سامنے جو نسخہ ہے اس پر کوئی سماعات نہیں، یہ نسخہ کامل ہے مجھے اس کی صرف جلدِ اول اور ثانی دستیاب ہوئی ہے۔ اس بارے میں فیصلہ قارئینِ کرام اور متخصصین پر چھوڑتا ہوں اور اس میں سے گمشدہ حصہ کو ان کے سامنے پیش کرتا ہوں۔''①

سماعات، سماعۃ کی جمع ہے۔ جب ایک قلمی نسخہ اہلِ علم خود پڑھتے یا تلامذہ استاذ پر اس کی قراءت کرتے تو وہ اس پر لکھ دیتے تھے کہ یہ فلاں فلاں نے پڑھا یا سنا ہے۔ مگر اس نسخہ کے بارے میں دکتور الحمیری نے فرمایا ہے کہ اس پر کوئی سماعات نہیں ہیں۔ پھر خود ان کا یہ فرمانا کہ ''اس کے بارے میں فیصلہ قارئینِ کرام اور متخصصین پر چھوڑتا ہوں۔'' بجائے خود اس بات کا مشعر ہے کہ انھیں بھی اس کے بارے میں کامل اعتماد نہیں کہ اس کی نسبت المصنف للامام عبدالرزاق کی طرف درست ہے یا نہیں۔

② اس مخطوطے کے ناسخ اسحاق بن عبدالرحمٰن السلیمانی ہیں اس کا جز اول انھوں نے ۹ رمضان المبارک ۹۳۳ھ میں لکھا۔ جیسا کہ اس جزء کے عکس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ناسخ کون ہیں؟ ثقہ ہیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں دکتور الحمیری صاحب بھی خاموش ہیں۔ اس کا ترجمہ و توثیق بھی متداول کتب میں کہیں نظر نہیں آتی ہے۔ جب کہ ناسخ کے بارے میں یہ شرط بھی ہے کہ وہ ثقہ اور معروف الخط ہو، چنانچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے جس طرح یہ شرط ہے کہ کتاب کے بارے میں یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگر اس کے بارے میں شک ہو تو اس سے روایت درست نہیں۔ اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ اس کا ناسخ ثقہ ہو۔ لیکن

---

① 14,15

إن لم يكن الكتاب بخط ثقة بلا خلاف.①

اگر کتاب ثقہ ناسخ سے نہ ہو تو بھی بلا اختلاف اس پر اعتماد درست نہیں۔ یہی بات اس سے قبل ۲۵ ویں نوع میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے ایک دوسرے اسلوب میں فرمائی ہے۔ لہٰذا جب اس نسخہ کے ناسخ کا ثقہ ہونا ثابت نہیں، نہ اس نے اس میں اپنے سماع کا ذکر کیا اور نہ کسی محدث سے اس نسخہ کے بارے میں اعتماد ہی نقل کیا تو اس نسخہ کا اعتبار کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

③ جناب دکتور الحمیری صاحب نے یقیناً خدمتِ حدیث کے جذبہ سے ''الجزء المفقود من الجزء الاول من المصنف'' طبع کروایا۔ مگر کیا ان کے علم میں یہ نہیں کہ المصنف کے مطبوعہ نسخہ کی جلد خامس بھی ابتدا سے ناقص ہے۔ جس کا اظہار مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ نے پہلی جلد کی ابتدا ہی میں کیا ہے۔ اب جب کامل نسخہ دستیاب ہوا ہے تو خدمت سنت کا کیا یہ تقاضا نہ تھا کہ اس حصہ کو بھی طبع کیا جاتا یا کم از کم اس کا اظہار ہی کر دیا جاتا کہ دوسرے نقص کی طرف جو اشارہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ نے کیا ہے وہ غلط ہے وہاں کوئی نقص نہیں۔ خدمت سنت کا یہ جذبہ آخر اس بارے میں خاموش کیوں ہے؟

④ المصنف کے مطبوعہ نسخہ سے عیاں ہوتا ہے کہ امام عبدالرزاق نے المصنف میں باقاعدہ کتب اور ان کے تحت ابواب مرتب کیے ہیں۔ مثلاً پہلی جلد کی ابتدا میں «کتاب الطهارة» نہیں۔ اس کے بعد ابواب کا بظاہر تسلسل نہیں جو اس کے نقص کی دلیل ہے۔ اس کے بعد پہلی جلد ہی میں کتاب الحیض، کتاب الصلاۃ ہے۔ یہ کتاب تیسری جلد تک مسلسل ہے اور اس کے تحت تمام متعلقہ ابواب ہیں۔ اس کے بعد تیسری جلد ہی میں کتاب الجمعہ، کتاب صلاۃ العیدین، کتاب فضائل القرآن، کتاب الجنائز اسی طرح چوتھی میں کتاب الزکاۃ، کتاب الصیام وغیرہ آخر کتاب تک۔

① التدریب: 98/2، النوع: 26

علامہ الکتانی نے بھی لکھا ہے۔«رتبہ علی الکتب والأبواب» کہ امام عبدالرزاق نے اسے کتب اور ابواب پر مرتب کیا ہے۔[1] لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ''الجزء المفقوذ'' کے نام سے اس نسخے کا آغاز ''کتاب الایمان'' سے نہیں۔ دکتور الحمیری نے وضاحت کردی ہے کہ موقع کی مناسبت سے ہم نے یہ اضافہ کیا ہے۔[2] «کتاب الطهارة» بھی نہیں، یہ عنوان بھی دکتور حمیری نے دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مولانا اعظمی صاحب نے «کتاب الطهارة» کو قوسین میں ذکر کیا۔ یہ کیسا کامل نسخہ ہے کہ کتاب کے پورے اسلوب کے برعکس اس میں ''کتاب'' کا نام ہی نہیں۔ کیا دکتور الحمیری اور ان کے ہم نوا بتا سکتے ہیں کہ ان کے کامل نسخہ میں ''کتاب'' نام کا کوئی عنوان ہی نہیں۔ دیدہ باید

⑤ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اپنی ''المصنف'' کی سند متعدد طرق سے ذکر کی ہے۔[3] امام ابوبکر رحمہ اللہ محمد بن خیر الاشبیلی المتوفی ۵۷۵ھ نے ''فہرستہ ابن خیر''[4] میں المصنف کی اسانید ذکر کی ہیں، اسی طرح دیگر حضرات جنھوں نے المصنف کی روایت کی ہے، وہ اپنی روایت میں کسی نوعیت کے نقص کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ نقص کا یہ گھپلا کب اور کیسے واقع ہوا؟

⑥ جناب دکتور الحمیری نے مطبوع اور مخطوط کے مابین ایک تقابلی جائزہ پیش کیا مگر افسوس کہ مخطوط میں جا بجا جو تساہل بلکہ تغافل پایا جاتا ہے اس کی طرف انھوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اسی تغافل سے اس مخطوط کی حیثیت متعین کی جاسکتی ہے۔

یحییٰ بن ابی زائدہ کون ہیں؟

چنانچہ اسی الجزء المفقود میں جو چالیس روایات پائی جاتی ہیں ان میں سے پانچ روایات

---

① الرسالة المستطرفه: 36 ② الجزء المفقود: 51 ③ تغليق التعليق: 455/5 ④ فهرسة ابن خير: 107، رقم: 174

یحییٰ بن ابی زائدہ سے منقول ہیں اوران تمام روایات میں اسناد کے اعتبار سے عجیب گھپلا پایا جاتا ہے، یحییٰ کی ایک روایت جوالجزءالمفقود [1] میں ہے اس کی سند یوں ہے۔

عبدالرزاق عن معمر عن ابن أبی زائدة عن ابن عون.

معمر سے مراد امام معمر بن راشد رحمہ اللہ ہیں اور دکتور الحمیری نے ان کے بارے میں یہ وضاحت کردی ہے کہ «معمر لا یروی عن ابن أبی زائدہ» کہ معمر، ابن ابی زائدہ سے روایت نہیں کرتے۔ گویا یہ روایت منقطع ہے لیکن معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا کیونکہ یحییٰ بن ابی زائدہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳، ۱۸۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، جیسا کہ التھذیب للمزی [2] وغیرہ میں ہے اور دکتور الحمیری نے بھی الجزء المفقود [3] میں لکھا ہے کہ یحییٰ بن ابی زائدۃ، دراصل یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ جو ۱۸۳ یا ۱۸۴ھ میں فوت ہوئے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں طبقہ تاسعہ میں شمار کیا ہے۔ [4] جب کہ امام معمر رحمہ اللہ طبقہ سابعہ کے ہیں۔ [5] جو ۱۵۳ یا ۱۵۴ھ میں فوت ہوئے۔ ۵۸ سال انھوں نے عمر پائی اس حساب سے ان کی پیدائش ۹۵، ۹۶ھ میں بنتی ہے۔ گویا امام معمر رحمہ اللہ کی وفات پر یحییٰ کی عمر ۳۳، ۳۴ سال تھی۔ چاہیے تو یہ کہ یحییٰ بن ابی زائدہ، امام معمر رحمہ اللہ سے روایت کرتے کہ وہ امام معمر رحمہ اللہ سے بہر نوع بعد ہوئے ہیں لیکن یہاں گنگا الٹی بہتی ہے کہ امام معمر رحمہ اللہ یحییٰ سے روایت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی صاحب دل کی تسلی کے لیے اسے روایۃ الاکابر عن الاصاغر قرار دیں لیکن اس کے لیے دونوں کے مابین ثبوتِ سماع کی ضرورت ہے، اس لیے یہ بہانہ سازی بھی یہاں نہیں چل سکتی غالباً اسی لیے دکتور الحمیری نے اعتراف کیا ہے کہ امام معمر رحمہ اللہ کا یحییٰ سے روایت کرنا صحیح نہیں۔

---

(1) الجزء المفقود: 61، رقم: 15 (2) التھذیب للمزی: 81/2 (3) الجزء المفقود: 60
(4) تقریب: 375 (5) تقریب: 344

یحییٰ بن ابی زائدہ کی دوسری روایت

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کی ایک روایت کی سند یوں ہے۔

قال عبد الرزاق: أخبرني يحيى بن أبي زائدة عن سليمان بن يسار قال: علمني أبو قلابة. [1]

ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳ یا ۱۸۴ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اس سند میں وہ سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں، جن کی وفات علی حسب الاختلاف ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۰۹ھ میں بتلائی گئی ہے اور اکثر محدثین نے فرمایا ہے کہ وہ ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے جب کہ ان کی عمر ۷۳ سال تھی۔ [2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں کبار الثالثہ یعنی طبقہ ثالثہ کے کبار محدثین میں شمار کیا ہے۔ [3] اس اعتبار سے سوال یہ ہے کہ یحییٰ جو ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا، وہ ۱۰۷ھ میں تیرہ سال پہلے فوت ہو جانے والے سلیمان بن یسار سے کیونکر روایت کر سکتا ہے؟ کہاں نویں طبقہ کا یحییٰ بن زکریا اور کہاں تیسرے طبقہ کے کبار محدثین میں شمار ہونے والے سلیمان سے اس کی روایت، افسوس ہے کہ دکتور الحمیری یہاں خاموش ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہاں انقطاع ہے۔ یہ بات بجا سہی لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جو یحییٰ بن زکریا کی روایات سے سامنے آ رہا ہے کہ اسے کس کس کا استاد اور کس کس کا شاگرد بنایا جا رہا ہے۔

یحییٰ بن ابی زائدہ کی تیسری روایت

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کی تیسری روایت الجزء المفقود [4] میں ہے، جس کی سند حسبِ ذیل ہے۔

---

[1] الجزء المفقود: 60، رقم: 13 [2] التهذيب للمزي: 8/122 وغيره [3] تقريب: 136

[4] الجزء المفقود: 83، رقم: 22

عبد الرزاق عن مالك عن يحيى بن أبي زائدة عن أبي سعيد الخدري.

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ دکتور الحمیری اپنے علم وفضل کے باوصف اس سند کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ جب کہ امام مالک رحمہ اللہ بھی طبقہ سابعہ میں ہیں جو ۱۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ حالانکہ ان کی پیدائش ۹۳ھ میں ہوئی۔ دکتور الحمیری جب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معمر اور ابن ابی زائدہ کے مابین انقطاع ہے تو یہاں امام مالک رحمہ اللہ اور یحییٰ کے مابین انقطاع کیوں نہیں؟ بالخصوص جب کہ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ تو امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔[1] اور یہ قطعاً ثابت نہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے یحییٰ سے بھی روایت لی ہے۔ چلئے ہم اس پہلو سے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ مگر

ثانیاً: یہ بھی لطیفہ ہی ہے کہ یحییٰ بن ابی زائدہ جو طبقہ تاسعہ سے ہیں اور ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے ہیں وہ حضرت ابوسعید الخدری صحابی رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اس صریح دھاندلی کے باوجود افسوس کہ فاضل دکتور الحمیری اس پر خاموش ہیں اور دوسری اسانید سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کا حوالہ ذکر کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا یہاں یہ روایت اسی سند سے موجود ہے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون

یحییٰ کی چوتھی حدیث

اسی طرح یحییٰ کی چوتھی حدیث الجزء المفقود[2] میں حدیث نمبر ۳۴ ہے، جس کی سند یوں ہے۔

عبد الرزاق عن مالك عن يحيى بن أبي زائدة عن علي رضي الله عنه.

---

[1] التهذيب للمزي: 384/17، 78/20 [2] الجزء المفقود: 91

حالانکہ یہاں بھی وہی معاملہ ہے جو تیسری حدیث میں ہے، اور یحییٰ طبقہ تاسعہ سے ہوتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! اور جناب ڈاکٹر الحمیری حسبِ سابق یہاں بھی خاموش ہیں اور اس کی تخریج میں ترمذی، احمد اور البزار وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کتابوں میں یہ ابو اسحاق عن ابی حیۃ عن علی کی سند سے موجود ہے مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اس سند سے تو یہ مصنف عبدالرزاق [1] میں بھی موجود ہے۔ کیا کتاب کے صحیح انتساب کے لیے تنہا متن کا مل جانا کافی ہے؟

یحییٰ کی پانچویں حدیث

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کی پانچویں حدیث اسی صفحہ پر۔ حدیث نمبر ۳۵ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ [2] وبهذا الإسناد عن ابن عمر کہ اسی سند سے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ لیجیے جناب! یہاں یحییٰ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں جبکہ وہ طبقہ تاسعہ میں شمار ہوتے ہیں مگر اس کے بارے میں بھی ڈاکٹر الحمیری خاموش ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ الجزء المفقود کی چالیس روایات میں سے پانچ روایات یحییٰ بن ابی زائدہ سے مروی ہیں۔ جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یحییٰ کثیر الروایہ ہیں۔ اور الجزء المفقود میں امام مالک رحمہ اللہ ان سے تین روایات بیان کرتے ہیں، مگر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اس کے باوجود یحییٰ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ کسی نے انھیں امام مالک رحمہ اللہ کا استاد قرار نہیں دیا اور نہ ہی مصنف عبدالرزاق میں اس جز کے علاوہ کہیں مالک عن یحییٰ بن ابی زائدۃ سے کوئی روایت پائی جاتی ہے۔ بلکہ مختلف ذرائع سے ہم نے اس کا تتبع کیا کہ المصنف کے مطبوعہ نسخہ میں کوئی ایک روایت بھی یحییٰ بن ابی زائدہ سے مروی ہے؟ مگر اس میں ہمیں ان کی کوئی روایت نہیں ملی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ الجزء المفقود کی چالیس روایات میں سے پانچ یحییٰ سے مروی ہوں مگر اس کے علاوہ پوری المصنف میں ان کی کوئی روایت نہ ہو؟ کیا اس

---

[1] المصنف لعبد الرزاق، رقم: 140,141 [2] الجزء المفقود: 91

الجزء کو معتبر قرار دینے والے اس کی کوئی معقول توجیہ پیش کریں گے؟ دیدہ باید

ایک اور سند اور لطیفہ

الجزء المفقود[1] میں حدیث نمبر ۲ کی سند ملاحظہ فرمائیں۔

عبد الرزاق عن ابن جريج قال أخبرني البراء قال: ما رأيت شيئا قط أحسن من رسول الله ﷺ.

دکتور حمیری کی دھاندلی

قارئینِ کرام یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اس الجزء کے فاضل محقق جناب دکتور الحمیری فرماتے ہیں:

ابن جريج حافظ ثقة وكان يدلس فقد صرح هنا بالإخبار.

کہ ابن جریج ثقہ حافظ اور مدلس تھے مگر یہاں انھوں نے ''اخبرنی'' کہہ کر سماع کی تصریح کی ہے۔''

بے خبری اور اندھی عقیدت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اس سند کو وہ ''اخبرنی'' کی بنیاد پر سماع پر محمول کرتے ہیں اور اتنی سی بات بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے کہ امام ابن جریج رحمہ اللہ تو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ التھذیب[2] اور السیر[3] میں ہے بلکہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان کی عمر ستر سال تھی۔ ان کا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا سن مولد ۸۰ھ، عمر ۷۰ اور وفات ۱۵۰ھ ایک ہی ہے۔[4] بتلایئے! ۸۰ھ میں پیدا ہونے والے امام ابن جریج رحمہ اللہ حضرت براء رضی اللہ عنہ جو ۷۲ھ میں فوت ہوئے، سے سماع کا اظہار کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر براء رضی اللہ عنہ بن عازب معروف صحابی نہیں کوئی اور ہیں تو بتلایا جائے براء نام کا اور کون سا صحابی ہے جس سے براہِ راست امام ابن جریج رحمہ اللہ نے روایت لی ہے؟ بصورت دیگر

---

[1] الجزء المفقود: 55 [2] التهذيب: 405/6 [3] السير: 333,334/6 [4] تقريب: 43

تسلیم کیا جائے کہ یہ جسارت کرنے والا کوئی کذاب ہے جس نے یہ سلسلۂ سند جوڑا ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ اس جز کے صفحہ ۵۹ پر حدیث ۱۰ بھی ابن جريج عن البراء سے منقول ہے۔ اس کے متعلق دکتور موصوف لکھتے ہیں: «الحديث بإسناده انقطاع لأن ابن جريج لم يدرك البراء» کہ حدیث کی سند میں انقطاع ہے کیونکہ ابن جریج نے البراء کا زمانہ نہیں پایا۔ لہٰذا جب خود انہیں بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے تو حدیث نمبر ۲ میں «ابن جريج قال أخبرني البراء» کس وضاع کی کارستانی ہے؟ اور دکتور موصوف کا کہنا کہ ابن جریج نے یہاں سماع کی تصریح کی ہے۔ ظلمات بعضها فوق بعض کا مصداق ہے۔

تیسری سند ایک اور لطیفہ

الجزء المفقود کے صفحہ ۸۴ پر حدیث نمبر ۲۴ کی سند ملاحظہ فرمائیں:

عبد الرزاق عن ابن جريج عن الزهري أنه سمع عقبة بن عامر.

دکتور الحمیری نے فرمایا ہے کہ کتب جرح وتعدیل میں زہری رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ زہری رحمۃ اللہ علیہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے جب کہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخر میں ۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ یوں ان کی وفات کے وقت زہری رحمۃ اللہ علیہ کی عمر دس سال تھی لیکن احتمال ہے کہ انھوں نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہو کیونکہ حدیث کے لیے سن تحمل پانچ سال ہے جیسا کہ امام ابن الصلاح نے اپنے المقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ یوں یہ روایت متصل ہے ورنہ منقطع۔ فاضل دکتور اس روایت کو متصل بنانے کے لیے بڑی دور کی کوڑی لائے۔

اولاً: تو عرض ہے کہ فاضل دکتور نے ۶۰ھ کو حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کا سنِ وفات کس دلیل سے متعین کیا ہے؟ جب کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے الاصابہ [1] اور التہذیب [2] میں اور علامہ

[1] الاصابہ: 466/3 [2] التہذیب: 243/7

ذہبی رحمہ اللہ نے السیر [1] میں بالصراحت ان کی وفات ۵۸ھ میں ذکر کی ہے۔ آخری عمر میں ان کا مدینہ طیبہ میں ہونا بھی ثابت نہیں، مصر میں فوت ہوئے۔ مقبرۃ المقطم میں دفن ہوئے۔ امام زہری رحمہ اللہ کا سن تحمل اگر ۵ سال تسلیم کر لیا جائے تب بھی ۵۵ھ میں وہ ۵۸ یا ۶۰ھ میں مصر میں فوت ہو جانے والے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے کیونکر سماع کر سکتے ہیں؟ اس لیے سن تحمل کی بنا پر امکان سماع کا دعویٰ محض مفروضہ ہے بلکہ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد [2] باب کیف الاذان؟ میں صراحت کی ہے۔ «والزهري لم يسمع من عقبة بن عامر» کہ زہری نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔ ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ روایت جس کے تحت علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے زہری کے حضرت عقبہ بن عامر سے عدم سماع کا حکم لگایا ہے، یہ طبرانی کبیر [3] میں ہے اور یہ معنعن ہے یعنی «زهري عن عقبه» مگر یہ شرف صرف الجزء المفقود کے ناسخ یا راوی کو حاصل ہوا کہ اس نے امام زہری رحمہ اللہ کا حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت کر دیا۔ ماشاء اللہ

متن میں نکارت

ثانیاً: حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی اسی روایت کے الفاظ ہیں «من توضأ فأتم وضوءه ثم رفع رأسه إلى السماء» الخ فاضل دکتور الحمیری نے اس کی تخریج میں صحیح مسلم اور ابن ابی شیبۃ وغیرہ کا حوالہ دیا اور فرمایا: «من طريق أبي عثمان بن نفير عن جبير أبي عثمان بن مالك الحضرمي» لیکن یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ صحیح «من طريق أبي عثمان عن جبير بن نفير بن مالك» ہے۔ اس سے قطع نظر سوال یہ ہے کہ کیا اس سند سے محولہ کتابوں میں «ثم رفع رأسه إلى السماء» کے الفاظ موجود ہیں؟ دکتور الحمیری تک تو شاید ہماری یہ گزارشات نہ پہنچ پائیں مگر پاکستان میں ان کے ہم نوا اور اس نسخہ کی تحسین کرنے والے تو موجود ہیں۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ محولہ کتب میں حاشیہ کی بیان کی ہوئی سند سے یہ اضافہ موجود ہے؟ وادعوا شهداء كم من دون الله

[1] السير: 468,469/2 وغیرہ [2] مجمع الزوائد: 331/1 [3] طبرانی کبیر: 344/17

ان كنتم صادقين امر واقع یہ ہے کہ یہ اضافہ «أبو عقيل عن ابن عمه عن عقبة» کی سند سے ابوداود ①، ابن ابی شیبہ ②، مسند احمد ③ اور سنن دارمی ④ میں ہے اور اس میں ابن عم ابی عقیل مجہول ہے جیسا کہ علامہ المنذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابی داود میں کہا ہے۔ غور فرمایے دکتور الحمیری نے کس ہوشیاری سے اس متن کو صحیح بنانے کی کوشش کی ہے۔ رہی الجزء المفقود کی سند تو اس کا قصہ آپ کے سامنے ہے۔

چوتھی سند اور دکتور الحمیری کی دھاندلی

الجزء المفقود ⑤ کی ایک سند دیکھیے۔

عبد الرزاق قال أخبرني الزهري عن سفيان بن شبرمة عن سعيد بن جبير.

اولاً: سوال یہ ہے کہ "سفیان بن شبرمۃ" کون ہے؟ دکتور الحمیری کی دھاندلی دیکھیے کہ وہ یہاں تو اس کے تعارف سے خاموش ہیں مگر رجال کی فہرست ⑥ میں اس کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

چلیے ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ طباعتی غلطی ہو گی صحیح "سفیان عن ابن شبرمۃ" ہے کیوں کہ المصنف ⑦ میں یہی اثر «يحيىٰ بن اليمان عن سفيان عن ابن شبرمة» کی سند سے موجود ہے اور ابن شبرمۃ، عبداللہ بن شبرمۃ ہیں اور ان سے سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ، دونوں روایت کرتے ہیں مگر سوال پھر یہ ہے کہ کیا امام زہری رحمہ اللہ سفیان ثوری یا سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں؟ تہذیب الکمال وغیرہ اٹھا کر دیکھیے امام زہری رحمہ اللہ کے اساتذہ میں ان کا نام آتا ہے؟ بلکہ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ تو امام زہری رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد ہیں اور بہ کثرت ان سے روایات بیان کرتے ہیں مگر یہاں انھیں امام زہری رحمہ اللہ

---

① ابو داود: 66/1 مع العون ② ابن ابی شیبۃ: 4/1 ③ مسند احمد: 150,151/4 ④ سنن دارمی: 182/1 ⑤ الجزء المفقود: 88، رقم: 28 ⑥ رجال: 104 ⑦ المصنف: 15/1

کا ماشاءاللہ استاد بنا دیا گیا ہے۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ کہا گیا «عبد الرزاق قال أخبرني الزهري» حالانکہ امام عبدالرزاق ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ خود محترم الحمیری صاحب نے ص ۲۳ پر نقل کیا ہے جب کہ امام زہری ۱۲۳ یا ۱۲۴ یا ۱۲۵ھ میں فوت ہوئے۔[1] لہٰذا جب امام عبدالرزاق امام زہری کی وفات سے علیٰ حسب الاختلاف ایک یا دو یا تین سال بعد پیدا ہوتے ہیں تو اب ان سے «أخبرني الزهري» بیان کرنے والا کون کذاب ہے؟ بینوا تؤجروا.

مزید برآں دکتور صاحب نے متن میں «فإذا نبتت له يغسلها» نقل کیا ہے جس کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ صحیح «لم يغسلها» ہے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، ممکن ہے کہ «لم» کی بجائے «له» کمپوزنگ کی غلطی ہو۔ والله سبحانه وتعالىٰ أعلم.

پانچویں سند کا لطیفہ

الجزء المفقود[2] حدیث نمبر ۳۰ کی سند یوں ہے:

عبد الرزاق عن معمر عن الزهري عن ابن عيينة عن يزيد الرقاشي.

ابھی ہم عرض کر آئے ہیں کہ امام زہری رحمہ اللہ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ کے استاد ہیں شاگرد نہیں۔ علاوہ ازیں ابن عیینہ رحمہ اللہ کا سماع یزید بن ابان الرقاشی سے نہیں۔ ابن عیینہ ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے جب کہ یزید الرقاشی کے بارے میں ہے کہ وہ ۱۱۰ھ سے ۱۲۰ھ کے مابین فوت ہوئے۔[3] کوئی حتمی تاریخ وفات نہیں ملی۔ اب محض اس الجزء المفقود کی بنیاد پر ابن عیینہ کو یزید الرقاشی کا شاگرد کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے بالخصوص جب کہ خود ابن عیینہ فرماتے ہیں:

---

① تهذيب الكمال: 232/17 وغیرہ ② الجزء المفقود: 89 ③ التاريخ الصغير للبخاري: 343/2

أول من جالست عبد الكريم أبو أمية وأنا ابن خمس عشرة سنة قال وقرأت القرآن وأنا ابن أربع عشرة سنة.[1]

''سب سے پہلے جس کے سامنے میں نے زانوئے تلمذ تہ کیے ہیں وہ عبدالکریم بن ابی المخارق ابوامیہ ہیں، تب میری عمر ۱۵ سال تھی اور قرآن مجید میں نے ۱۴ سال کی عمر میں پڑھا۔''

جب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ کا سنِ تحمل ۱۵ سال ہے اور سن ولادت ۱۰۷ھ ہے تو اس حساب سے ۱۱۰ھ سے ۱۲۰ھ کے مابین فوت ہو جانے والے یزید الرقاشی البصری سے ان کا سماع کیوں کر متحقق ہو سکتا ہے؟ اس لیے یہ سند بھی خانہ ساز ہے اور علم الروایہ کے بالکل منافی ہے۔

چھٹی سند

الجزء المفقود[2] کی حدیث نمبر ۴۰ ملاحظہ فرمائیں:

عبد الرزاق عن الزهري عن جندب عن الأسود بن يزيد أن ابن عمر توضأ. الخ

ابھی ہم ''چوتھی سند'' کے تحت ذکر کر آئے ہیں کہ امام زہری رحمہ اللہ سے امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی ملاقات ہی ثابت نہیں۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ، امام زہری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ لہٰذا حسبِ سابق یہ سند بھی بناوٹی ہے۔ انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ دکتور الحمیری اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: «هذا الإسناد فيه انقطاع بين عبد الرزاق والزهري» کہ اس سند میں زہری اور عبدالرزاق کے مابین انقطاع ہے مگر اس سے قبل[3] حدیث نمبر ۲۸ میں جہاں «عبد الرزاق أخبرني الزهري» کہہ کر دونوں کے مابین سماع کی صراحت کی گئی ہے وہاں دکتور صاحب نے

---

[1] السير: 464/8 [2] الجزء المفقود: 94 [3] الجزء المفقود: 88

کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلی ہیں۔ ہمارا سوال یہی ہے کہ جس سے سماع نہ ہو راوی اس سے سماع کا اظہار کرے تو اسے کیا کہا جائے گا؟ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کے بارے میں غلط بیانی اور کذب کا الزام بہر نوع غلط ہے، اب اس کی جسارت کسی غلط کار اور کذاب نے نہیں کی تو اور کس نے کی ہے؟

اس کے علاوہ یہ بھی بتایا جائے کہ جندب جو امام زہری کے استاذ اور الاسود بن یزید کے شاگرد ہیں وہ کون ہیں؟ نیز یہ بھی کہ سند میں «إن ابن عمر» بھی بہرحال غلط ہے۔ صحیح «ان عمر» ہے جیسا کہ الاسود بن یزید ہی سے یہ اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ابن ابی شیبہ[1] میں ہے۔

ساتویں حدیث

الجزء المفقود[2] میں ایک روایت حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ الخدری سے بایں سند نقل کی گئی ہے۔

عبد الرزاق عن معمر عن الزهري عن أبي سعيد الخدري عن أبيه عن جده أبي سعيد: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه.[3]

یہ روایت بظاہر سند کے اعتبار سے حسن ہے مگر درحقیقت امام زہری رحمہ اللہ کے استاد ابوسعید ربیح بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید سے یہ روایت کثیر بن زید بیان کرنے میں متفرد ہیں۔ چنانچہ کثیر بن زید کی سند سے یہی روایت ابن ابی شیبہ[4]، العلل الکبیر للترمذی[5]، مسند احمد[6]، الدارمی[7]، ابن ماجہ[8]، ابویعلی[9]، الدارقطنی[10]، بیہقی[11]، حاکم[12] اور مسند عبد بن حمید[13] وغیرہ کتب میں اسی سند سے مروی ہے اور امام حاکم اور امام بیہقی رحمہما اللہ نے

---

[1] ابن أبي شيبة: 18/1 [2] الجزء المفقود: 80,81 [3] حديث نمبر 20 [4] ابن أبي شيبة: 2/1 [5] العلل الكبير للترمذي: 112,113/1 [6] مسند احمد: 41/3 [7] الدارمي: 171/1 [8] ابن ماجه، رقم: 397 [9] ابويعلى، رقم: 1060 [10] الدارقطني: 207/1 [11] بيهقي: 43/1 [12] حاكم 147/1 [13] مسند عبد بن حميد، رقم: 910

امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ

أحسن مايروى في هذا الحديث كثير بن زيد.

اس باب میں سب سے بہتر وہ ہے جو کثیر بن زید بیان کرتے ہیں۔ یہی بات امام ابن عدی نے الکامل① میں ربیح کے ترجمہ میں نقل کی ہے بلکہ مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ «لا أعلم يروى هذا الحديث عن ربيح غير كثير» کہ میں نہیں جانتا کہ یہ حدیث ربیح سے کثیر کے علاوہ کوئی اور بھی روایت کرتا ہے۔ امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں: «هو أصح مافي الباب» کہ یہ حدیث اس باب میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔②

امام بزار فرماتے ہیں: «لا نعلمه يروى عن أبي سعيد إلا بالإسناد المذكور» ہم نہیں جانتے کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے اس سند کے علاوہ بھی کسی نے روایت کیا ہے۔③ ہم اس حدیث کی صحت وضعف کے بارے میں بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امام احمد، امام اسحاق کا فرمانا کہ اس باب میں سب سے بہتر روایت کثیر بن زید کی ہے۔ امام بزار رحمہ اللہ، امام ابن عدی رحمہ اللہ کا فرمانا کہ کثیر کے علاوہ کسی اور نے یہ روایت بیان نہیں کی۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام اسحاق رحمہ اللہ براہ راست امام عبدالرزاق کے شاگرد ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ، امام بیہقی رحمہ اللہ... نیز علامہ ابن ملقن اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ، اسحاق بن ابراہیم الدبری جو المصنف لعبدالرزاق کے راوی ہیں کے واسطہ سے المصنف کی جابجا روایت ذکر کرتے ہیں۔ اگر یہ روایت ان کی المصنف میں زہری عن ربیح کی سند سے ہوتی تو کیا یہ حضرات کثیر بن زید کا تفرد اور اس کی سند سے اسے سب سے بہتر قرار دیتے؟ ہرگز نہیں۔ ان محدثین کے تبصرہ کے بعد اس روایت کی یہ سند بھی خانہ ساز اور وضعی معلوم ہوتی ہے۔

① الکامل: 1034/3 ② التلخیص: 74/1 ③ البدر المنیر: 78/2

آٹھویں حدیث اور دکتور الحمیری

الجزء المفقود [1] میں حدیث نمبر ۲۱ کی سند یوں ہے:

عبد الرزاق عن ابن جريج أخبره رجل عن أبي هريرة.

یہ روایت بھی تسمیہ فی الوضوء کے بارے میں ہے، جو مسند امام احمد، سنن ابی داود اور ابن ماجہ وغیرہ کتب میں یعقوب بن سلمہ عن ابیہ عن ابی ہریرۃ کی سند سے معروف ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے یعقوب بن سلمہ کو یعقوب بن ابی سلمۃ الماجشون قرار دیا ہے مگر علامہ ابن الصلاح، علامہ نووی، علامہ ابن دقیق العید، علامہ ذہبی، علامہ ابن الملقن، علامہ زیلعی وغیرہ نے خبردار کیا ہے کہ یہ امام الحاکم رحمہ اللہ کا وہم ہے صحیح یعقوب بن سلمۃ ہے۔ یہاں دکتور الحمیری کی لیاقت دیکھئے، فرماتے ہیں: اس سند میں ابن جریج کا استاد رجل مبہم ہے اور وہ ہے یعقوب بن سلمۃ اللیثی۔ ان کے الفاظ ہیں: «إن الرجل هو يعقوب ابن سلمة الليثي» مگر یہ بات ان کے حاشیہ خیال میں نہ آئی کہ جن مراجع کی بنیاد پر المصنف میں ''رجل'' کو یعقوب بن سلمہ قرار دیا گیا ہے وہ تو انھی مراجع میں اپنے باپ سلمۃ سے روایت کرتے ہیں جب کہ ''رجل'' براہ راست حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے۔ اس لیے یہ یعقوب کیوں کر ہو سکتا ہے؟

حدیث نور

اب آیئے! اس روایت کو بھی ایک نظر دیکھ لیجئے، جس کے لیے یہ «الجزء المفقود» طبع کیا گیا۔ جس کی تخریج میں کہا گیا کہ شیخ ابن عربی نے تلقیح الفهوم میں انھی الفاظ سے ذکر کیا ہے، الخرکوشی نے «شرف المصطفى» میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی معنی میں روایت بیان کی ہے، العجلونی نے کشف الخفاء میں عبد

[1] الجزء المفقود: 82

الرزاق سے یہ روایت نقل کی ہے اور قسطلانی نے اسے المواهب اللدنیه میں ذکر کیا ہے اور عبد الملك الطبنی نے اپنے ''فوائد'' میں اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

قارئینِ کرام غور فرمائیں کہ کیا شیخ ابن عربی نے اسے المصنف لعبد الرزاق کی سند سے نقل کیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کی سند کیا ہے اور وہ بھی المصنف کی روایت کے ہم معنی ہے؟ عبد الرزاق کے حوالے سے کشف الخفاء کا حوالہ بھی ثانوی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ علامہ العجلونی نے جو کچھ نقل کیا المواہب اللدنیہ سے نقل کیا ہے گویا المصنف کے حوالہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت سب سے پہلے علامہ القسطلانی رحمہ اللہ نے ذکر کی اور وہ بھی بلاسند اور اب ''المصنف'' لعبد الرزاق میں مل گئی، جس کی بظاہر سند بھی درست ہے۔ مگر مقام غور ہے کہ علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے جو الفاظ المصنف سے نقل کیے ہیں کیا انھی الفاظ سے یہ «الجزء المفقود» میں ہے؟ قطعاً نہیں۔ نسخوں کے اختلاف میں الفاظ کے مختلف ہونے کی بات اپنی جگہ مگر یہاں تو سرے سے اصل موضوع ہی بدلا ہوا ہے اور وہ یوں کہ المواہب میں ہے کہ «نور نبيك من نوره» جب کہ الجزء المفقود میں ہے۔ «نور نبيك يا جابر خلقه الله» اس کے بعد الجزء میں ہے «ثم خلق فيه كل خير وخلق بعده كل شيء وحين خلقه أقامه قدامه من مقام القرب اثني عشر ألف سنة»

''کہ پھر اس نور میں ہر قسم کی خیر پیدا کی اور اس کے بعد ہر چیز کو پیدا کیا اور جب اسے پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سامنے مقامِ قرب میں بارہ ہزار سال رکھا۔''

جب کہ المواہب میں ہے:

فجعل ذلك النور يدور بالقدرة حيث شاء ولم يكن في ذلك الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملك ولا سماء ولا أرض ولا شمس ولا قمر ولا جني ولا إنسي.

غور فرمایئے! دونوں عبارتوں میں کتنا فرق ہے المواہب میں فرمایا گیا کہ یہ نور قدرت سے جہاں چاہا چکر لگاتا رہا۔ جبکہ الجزء میں رب ذوالجلال کے سامنے مقامِ قرب میں ٹھہرنے کا ذکر ہے اور یہ حضوری بارہ ہزار سال بتلائی گئی ہے جب کہ المواہب میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں۔

پھر الجزء میں ہے کہ اس نور کے چار حصے کیے گئے، ایک حصہ سے عرش اور کرسی، دوسرے حصہ سے حاملینِ عرش اور خزنۂ کرسی، اور چوتھی قسم مقام محبت میں بارہ ہزار سال کھڑی رہی، چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:

ثم جعله أربعة أقسام فخلق العرش والكرسی من قسم، وحملة العرش وخزنة الكرسی من قسم، وأقام القسم الرابع فی مقام الحب اثنی عشر ألف ثم جعله أربعة أقسام.

اولاً: یہاں اس نور کے تیسرے حصے سے جو کچھ بنا اس کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔ شاید یہ حصہ جناب دکتور الحمیری کے نور نظر سے اوجھل ہوگیا ہے۔

ثانیا: المواہب میں اس کے برعکس اس نور سے جن تین چیزوں کے وجود میں آنے کا ذکر ہے۔ وہ یہ ہیں، پہلے حصہ سے "القلم" دوسرے حصہ سے اللوح، تیسرے حصے سے العرش، چنانچہ المواہب کے الفاظ ہیں:

فخلق من الجزء الأول القلم، ومن الثانی اللوح، ومن الثالث العرش، ثم قسم الجزء الرابع أربعة أجزاء»...

الفاظ کے تغیر سے قطع نظر یہاں نور کے چوتھے حصہ کا بارہ ہزار سال تک مقام محبت میں کھڑے رہنے کا بھی ذکر نہیں اور نور کے اجزا سے تخلیقِ کائنات میں فرق بھی نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔

اس کے بعد الجزء المفقود میں ہے کہ اس چوتھے حصہ نور کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تو

ایک حصہ سے القلم، ایک حصہ سے اللوح، ایک حصہ سے جنت اور چوتھا بارہ ہزار سال تک مقام خوف میں رہا۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:

فخلق القلم من قسم واللوح من قسم، والجنة من قسم ثم أقام القسم الرابع في مقام الخوف اثنى عشر ألف سنة.

جب کہ اس کے بالکل برعکس المواہب میں المصنف کے حوالے سے ہے کہ

فخلق من الجزء الأول: حملة العرش ومن الثاني: الكرسي ومن الثالث: باقي الملائكة ثم قسم الجزء الرابع أربعة أجزاء.

اس دوسری تقسیم میں نور کے ایک حصہ سے حاملینِ عرش، دوسرے سے کرسی، تیسرے سے باقی تمام ملائکہ۔ انصاف فرمائیے، دونوں میں کوئی توافق ہے؟ جن چیزوں کی تخلیق کا ذکر الجزء المفقود میں ہے ان کا تذکرہ المواہب کی نقل کردہ روایت میں سرے سے موجود ہی نہیں اور نہ اس میں چوتھے حصہ نور کا بارہ ہزار سال تک مقامِ خوف میں رہنے کا ہی ذکر ہے۔

آگے دیکھیے الجزء المفقود میں اس کے بعد ذکر ہے کہ اس چوتھے حصہ کو پھر چار حصوں میں تقسیم کیا گیا جس کے ایک حصہ سے فرشتے، ایک حصہ سے سورج، ایک حصہ سے چاند اور تارے اور چوتھا حصہ مقامِ رجاء میں بارہ ہزار سال تک ٹھہرا رہا۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:

جعله أربعة أجزاء فخلق الملائكة من جزء، والشمس من جزء، والقمر والكواكب من جزء، و أقام الجزء الرابع في مقام الرجاء اثنى عشر ألف سنة.

جب کہ المواہب میں اس کے برعکس ہے۔

فخلق من الأول السمٰوت، ومن الثاني الأرضين، ومن الثالث

الجنة والنار ثم قسم الرابع أربعة أجزاء.

''کہ پھر اس نور کے ایک حصے سے آسمان دوسرے حصے سے زمینیں، تیسرے سے جنت اور جہنم پیدا کیے گئے، پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔''

ایمان داری سے بتلایا جائے دونوں میں کوئی موافقت ہے؟ جن اشیاء کا تیسری تقسیم میں الجزء المفقود میں ذکر ہے کیا ان میں سے کوئی چیز بھی المواہب کی بیان کردہ روایت میں پائی جاتی ہے؟ نیز الجزء المفقود میں جز رابع کا بارہ سال تک مقامِ رجاء میں ٹھہرے رہنے کا ذکر اس پہ مستزاد ہے اس کے بعد الجزء المفقود میں ہے، وہ چوتھا حصہ پھر چار اجزا میں تقسیم کیا گیا، ایک جزء سے عقل کو، ایک جزء سے علم وحکمت اور عصمت وتوفیق کو اور چوتھا حصہ بارہ ہزار سال تک مقام حیا میں کھڑا رہا۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں۔

ثم جعله أربعة أجزاء فخلق العقل من جزء، والعلم والحكمة والعصمة والتوفيق من جزء، وأقام الجزء الرابع في مقام الحياء اثنى عشر ألف سنة.

اولاً: یہاں تیسرے حصے نور سے تخلیق کا ذکر ہی نہیں۔ شاید یہاں بھی دکتور الحمیری کی نظر سے چوک ہوئی ہو، مگر کیا کیا جائے المواہب میں المصنف کے حوالے سے اس کے بالکل برعکس ہے کہ

فخلق من الأول نور أبصار المؤمنين، ومن الثاني نور قلوبهم وهي المعرفة بالله، ومن الثالث نور أنسهم وهو التوحيد لا إله إلا الله محمد رسول الله.(الحديث)

''اس کے ایک حصہ سے مؤمنوں کی آنکھوں کا نور، دوسرے سے ان کے دلوں کا نور یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور تیسرے سے ان کے انس کا نور پیدا کیا۔ یعنی توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔''

دونوں روایتوں میں فرق ہر اس شخص کو نظر آتا ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نور ایمان سے نوازا ہے۔ اس کے باوجود ''الجزء المفقود'' کو ''المصنف'' لعبد الرزاق باور کرانا اور اس کی سند دیکھ کر خوشی کے ڈونگرے برسانا کہ المواہب میں عبدالرزاق کی بیان کردہ سند مل گئی۔ ہمارے نزدیک نہایت طفلانہ شوخی ہے۔ علم الروایہ سے معمولی شد بد رکھنے والا بھی اس فرق کو سمجھ سکتا ہے مگر افسوس دکتور الحمیری اور ان کے ہم نوا ڈھنڈورچی اسے محض نسخوں کا فرق قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد کا حصہ نقل نہیں کیا جس سے پتہ چلتا کہ دونوں کے الفاظ کیا ہیں۔ المواہب کے شارح علامہ الزرقانی کو المصنف کا نسخہ نہیں ملا اس لیے انھوں نے «فليراجع من مصنف عبدالرزاق مع تمام الحديث» کہہ کر خاموشی اختیار کی۔

الجزء المفقود کی پہلی حدیث اور حدیثِ نور

اول تخلیق کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت تو معروف ہے۔ اس کے بارے میں معنوی اعتراضات اور ان کے جوابات معلوم شد، ہم یہاں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، نہ ہی یہ ہمارا موضوع ہے لیکن اس حوالے سے الجزء المفقود کی پہلی روایت کی سند اور ابتدائی الفاظ ملاحظہ ہوں:

عبدالرزاق عن معمر عن الزهري عن السائب بن يزيد قال: إن الله تعالىٰ خلق شجرة، ولها أربعة أغصان فسماها شجرة اليقين ثم خلق نور محمد صلى الله عليه وسلم في حجاب من درة بيضاء مثله كمثل الطاؤس و وضعه على تلك الشجرة فسبح عليها مقدار سبعين ألف سنة.

اس سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔ السائب بن یزید رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ یہ روایت گو مرفوع

نہیں لیکن حکماً مرفوع ہے کیوں کہ حضرت السائب رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے، وہ عقل وفکر کا مسئلہ نہیں۔ نہ ہی وہ اہلِ کتاب سے لینے والے ہیں، اس کا تعلق بدء الخلق سے ہے۔ اس لیے یہ حکماً مرفوع ہے۔ حضرت سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے ایک درخت پیدا کیا، جس کی چار شاخیں تھیں، اس کا نام ''شجرۃ الیقین'' رکھا پھر نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا ایک سفید موتی کے پردہ میں، اس کی شکل وصورت طاؤس کی سی تھی اور اسے اس درخت پر رکھا تو اس نے ستر ہزار سال تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی۔ اس کے بعد کی کہانی ہمارا موضوع نہیں۔ ہم صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس روایت میں نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق شجرۃ الیقین کے بعد بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں تخلیق حقیقی اور اضافی کی تاویل کی بھی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا بیان یہاں ''ثم'' سے ہوا۔ جو تراخی چاہتا ہے اور بیان ہے کہ طاؤس کی صورت میں یہ نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس درخت پر بٹھایا گیا جس سے تخلیقاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ثانوی حیثیت میں رہ جاتا ہے۔ دکتور الحمیری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت پیدا ہونے والے اشکالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو اشکال وارد ہوتا ہے اور تخلیق کی جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے، وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے بالکل برعکس ہے۔ افسوس ہے کہ چارہ گروں نے اس طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ یہ پہلی روایت جو تقریباً تین صفحات پر مشتمل ہے، اس کا پورا مضمون اس کے وضعی اور من گھڑت ہونے کی دلیل ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس روایت میں فرمایا گیا کہ آپ کے نور کو جو طاؤس کی شکل دی گئی اس کے سر کے پسینے سے فرشتے پیدا ہوئے۔ چہرے کے پسینے سے عرش، کرسی، لوح، قلم، شمس، قمر، ستارے اور دیگر آسمانی اشیاء بنیں، اس کے سینے کے پسینے سے انبیاء ورسل علماء وصلحاء وشہداء پیدا ہوئے۔ پھر باقی اعضاء کے پسینے سے دیگر مخلوقات بننے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پھر کہا گیا۔ «ثم سبح سبعين ألف سنة ثم خلق نور الأنبياء من نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم» پھر طاؤس نے ستر ہزار سال تک اللہ کی تسبیح بیان کی۔ پھر انبیاء علیہم السلام کا نور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے پیدا کیا، قابلِ

غور بات یہ ہے کہ آپ کے عرق صدر سے انبیاء علیہم السلام کی تخلیق پہلے ہو چکی۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے نور سے انبیاء کے نور کا پیدا ہونا چہ معنی دارد؟ پھر اس میں تمام آسمانی اشیاء کو چہرے کے پسینہ سے پیدا ہونا بتلایا گیا ہے جب کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں معاملہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے اس لیے یہ پہلی روایت ہی اپنی سند کے صحیح ہونے کے باوجود حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مخالف ہے اور اس کا متن اس کے وضعی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایات کسی کذاب یا وضاع کی گھڑی ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں اس جزء کی روایات میں لفظی ومعنوی رکاکت اور عجمی ترکیبات بھی بجائے خود اس کے وضعی ہونے کی بین دلیل ہیں۔ جسے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی تو بفضل اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی وضاحت بھی کر دی جائے گی۔

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی ہمشیرہ کا بیٹا احمد بن عبداللہ تھا، جسے احمد بن داود بھی کہا گیا ہے۔ وہ کذاب تھا اور حدیثیں بنا بنا کر امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی احادیث میں داخل کر دیتا تھا۔[1] کیا بعید ہے کہ یہ کارستانی کہیں اسی کی نہ ہو۔ ورنہ المصنف کا راوی تو اسحاق بن ابراہیم الدبری ہے اور جن حضرات نے اس کی سند سے المصنف کا سماع کیا ہے وہ نہ تو المصنف کے ناقص ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور نہ کہیں ان روایات کا اشارہ ہی کرتے ہیں جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ہماری ان گزارشات سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ''الجزء المفقود'' المصنف کا قطعاً حصہ نہیں اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ

① دکتور عیسیٰ الحمیری خود اس کے انتساب میں پوری طرح مطمئن معلوم نہیں ہوتے۔

② اس کا ناسخ مجہول ہے، اس پر محدثین کی نہ سماعات ہیں اور نہ کسی سے اس کی توثیق ہی منقول ہے۔

③ ''المصنف'' کتب اور ابواب کے تحت مرتب کی گئی ہے جب کہ الجزء المفقود میں ''کتاب'' کا عنوان نہیں آخر کیوں؟

---

[1] میزان، اللسان: 170,197/1

④ نویں صدی تک کے ائمہ محدثین المصنف کی سماعات کا ذکر کرتے ہیں نہ وہ نقص کا اشارہ کرتے ہیں اور نہ انھوں نے ان اسانید سے روایات کا اشارہ ہی کیا ہے۔

⑤ ... یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کی اسانید سے پانچ روایات الجزء المفقود میں ہیں اور ان کی اسانید سے عیاں ہوتا ہے کہ یہاں سند سازی کی گئی ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یحییٰ کثیر الروایہ ہیں۔ الجزء المفقود کی چالیس روایات میں سے پانچ روایات ان سے مروی ہیں۔ مگر ''المصنف'' میں ان کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں پائی جاتی۔ آخر کیوں؟

⑥ ... ابن جريج أخبرني البراء» کی سند اس کے وضعی ہونے کی دلیل ہے۔

⑦ ... الزهري سمع عقبة بن عامر» کی سند بھی اس کے بناوٹی ہونے کا ثبوت ہے۔

⑧ ... «عبد الرزاق أخبرني الزهري» کی سند بھی کسی کذاب کی کارستانی ہے۔

⑨ ... امام ابن عیینہ کو امام زہری رحمہ اللہ کا استاد ظاہر کرنا اس کی ثقاہت کے منافی ہے۔

⑩ ... تسمیہ وضوء کی روایت کی سند تمام محدثین کی تصریحات کے خلاف اس کے بناوٹی ہونے کی دلیل ہے۔

⑪ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث نور کا متن المواہب میں المصنف کے حوالے سے نقل کیے گئے متن کے بالکل برعکس ہے۔ اگر یہی اس کی سند ہے تو اتنا گھپلا کیوں؟ دونوں میں سے صحیح متن کون سا ہے اور کس ترتیب سے ہے؟ الجزء المفقود کے بعد المواہب کے بیان و تفصیل کی پوزیشن کیا ہے؟

⑫ الجزء المفقود کی پہلی روایت بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے منافی ہے۔ بلکہ وہاں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی پیدائش ثانوی درجہ میں رہ جاتی ہے اور اس کا پورا متن بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے خلاف ہے اور کسی قصہ گو کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔

امید ہے ہماری ان گزارشات کو ٹھنڈے دل ودماغ سے پڑھ کر سنجیدگی سے فیصلہ کیا جائے گا کہ ''الجزء المفقود'' المصنف کا حصہ ہے یا نہیں؟ کسی کتاب کے جزء کا کسی امام کی طرف انتساب کوئی اچنبھے کی بات نہیں ایسی کارستانی ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے جیسا کہ ہم باحوالہ ذکر کر آئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سانحۂ کربلا میں افراط وتفریط کا جائزہ

(بعض تسامحات کا تذکرہ)

محترم ومکرم مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب...زادکم اللہ عزاً وشرفاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

''محدث'' الحمدللہ ہر ماہ باقاعدہ مل رہا ہے اور اس کے وقیع مضامین کی بنا پر اس کے آنے کا انتظار رہتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اس ماہنامہ کے ذریعہ جو علمی جہاد آپ کر رہے ہیں اسے شرفِ قبولیت سے نوازے...آمین

گزشتہ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ محدث کے شمارہ ۵ میں ایک مضمون کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں جسے مولانا عبدالرحمٰن عزیز نے ''سانحہ کربلا میں افراط وتفریط کا جائزہ'' کے عنوان سے رقم فرمایا ہے۔ میرا خیال تھا کوئی رجل رشید اس پر توجہ فرمائے گا مگر اس کے بعد شمارہ موصول ہوا تو یہ خیال خواب ثابت ہوا، کسی مہربان نے شاید اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس لیے مجبوراً اپنے احساسات کا اظہار آپ کی خدمت میں

ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آئندہ شمارے میں اسے شائع کر دیں گے تا کہ اس موضوع کے متعلق ایک دوسرا پہلو بھی قارئین کرام معلوم کر سکیں۔ (اثری)

جناب محترم! آپ اور تاریخ ورجال سے دلچسپی رکھنے والے سبھی حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین پیدا ہونے والے نزاعات، مشاجرات کے نتیجہ میں جو فکری اختلاف پیدا ہوا، ان میں رافضی، خارجی اور ناصبی نظریات اور ان کے اہداف کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ان کے مقابلہ میں اہل سنت اہلحدیث بحمد اللہ صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ انہوں نے جادۂ اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور افراط وتفریط کی پگڈنڈیوں سے محفوظ رہے۔ رافضیوں کے برعکس اہل بیت کے ساتھ ساتھ سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام ان کا جزوِ ایمان ہے۔ ناصبی جس طرح خاندان نبوت اور ان کے ہمنواؤں کے ساتھ عناد رکھتے تھے یا خارجیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے بارے میں جو طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا تھا، اہلِ سنت ان نظریات سے ہمیشہ بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ایک کے دفاع میں دوسرے کی تنقیص ان کا قطعاً شیوا نہیں رہا۔ مگر سخت حیرت کی بات ہے کہ ''سانحہ کربلا میں افراط وتفریط کا جائزہ'' پیش کرتے ہوئے خود مولانا عبدالرحمٰن عزیز صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر افراط وتفریط کا شکار ہو گئے۔ اور جب یہ تحریر ''محدث'' جیسے علمی ماہنامہ میں شائع ہوئی تو گویا یہ سب محدثین رحمہم اللہ کے افکار کی امین جماعت کے موقف کی ترجمان بن گئی حالانکہ ایسا قطعاً نہیں مثلاً حضرت حجر بن عدی (صحابی) کو سبائی لیڈر کہا گیا۔

① کہا گیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت ہوئی تو کوفیوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ورغلانے کی کوشش کی، بلکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اس مصالحت کو بھی انھوں نے ناگوار سمجھا... چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن عزیز کے الفاظ ہیں:

''حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب اپنے حواریوں سے تنگ آ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کر کے بیعتِ خلافت کی تو سبائیوں کو انتہائی ناگوار گزرا۔ ان کی

برابر کوشش یہی تھی کہ صلح نہ ہونے پائے چنانچہ سبائی لیڈر حجر بن عدی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اسی سلسلہ میں گفتگو کی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسے بڑی سختی سے ڈانٹا۔''①

قطع نظر اس کے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے یہ مصالحت ''حواریوں سے تنگ آ کر'' کی تھی یا اس کے اور بھی اسباب تھے۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جن ''سبائیوں'' کو یہ مصالحت ناگوار گزری ان کے جس ''سبائی لیڈر'' کا نام حجر بن عدی لیا گیا ہے یہ کون ہے؟

جناب من! یہ ''سبائی لیڈر'' حجر بن عدی صحابی رسول ہیں... ابن اثیر لکھتے ہیں:

وفد علی النبی ﷺ هو وأخوه هانیء وشهد القادسية وكان من فضلاء الصحابة.②

''حضرت حجر رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی ہانی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے اور فضلائے صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔''

امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک③ میں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاصابہ④ میں، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سیر اعلام النبلاء⑤، تجرید اسماء الصحابہ⑥، العبر⑦، تاریخ الاسلام⑧ میں، ابن حماد نے شذرات الذہب⑨ میں، ابن حزم رحمہ اللہ نے جمہرۃ انساب العرب⑩ میں اور ابن عساکر وغیرہ نے انھیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ابن سعد نے صحابہ میں ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں تابعین میں بھی شمار کیا ہے۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: «فإما أن يكون ظنه آخر وإما أن يكون ذهل» ''انھوں نے یہ کوئی اور راوی سمجھا ہے یا ان سے بھول ہوئی کہ حجر بن عدی کو تابعین میں بھی ذکر کر دیا۔''

① محدث: 14 ② أسد الغابة: 385/1 ③ مستدرك: 468/3 ④ الإصابة: 349/1
⑤ سير أعلام النبلاء: 463/3 ⑥ تجريد أسماء الصحابة: 123 ⑦ العبر: 57/ ⑧ تاريخ الإسلام: 3/2 ⑨ شذرات الذهب: 57/1 ⑩ جمهرة أنساب العرب: 426

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بلاشبہ انھیں تابعین میں شمار کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں جبکہ ابوبکر بن حفص رحمۃ اللہ علیہ جیسے تابعین ان کے بارے میں ۔حجر بن عدي رجل من أصحاب النبي ﷺ فرماتے ہیں۔[1] اور مصعب بن عبداللہ الزبیری رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام بھی انھیں صحابی قرار دیتے ہیں اور اکثر متاخرین کی بھی یہی رائے ہے۔یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: «قال غير واحد وفد مع أخيه هانئ»[2] لہٰذا اس پر ''سبائی لیڈر'' کا الزام اہلِ سنت کی فکر کا آئینہ دار نہیں۔اسی ''جرم'' کی بنا پر مولانا عبدالرحمٰن عزیز نے ان پر ''رضی اللہ عنہ'' کی علامت بھی مناسب نہیں سمجھی... یہ رویہ بھی بہرنوع غلط ہے۔

حضرت سلیمان بن صرد خزاعی رضی اللہ عنہ کو بھی بطور صحابی متعارف نہیں کرایا گیا۔

(۲) اسی طرح چند سطور بعد مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفی لیڈر سلیمان بن صرد کو یہ جواب دیا۔''[3]

آگے چل کر موصوف اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''آخری خطوط کوفہ کے بڑے بڑے سرداروں کی جانب سے تھے جن میں سے سلیمان بن صرد، شیث بن ابی یزید، عزرہ بن قرن، عمر بن حجاج زیدی، عمر بن تمیمی، حبیب بن نجد، رفاعہ بن شداد اور حبیب بن مظاہر قابلِ ذکر ہیں۔''[4]

جب کہ امرِ واقع یہ ہے کہ ان ''کوفی لیڈروں'' میں جو سرفہرست ہے ''سلیمان بن صرد خزاعی'' ہیں اور وہ بالاتفاق مشہور صحابی ہیں۔صحاح ستہ میں ان سے روایات مروی ہیں۔اس سلسلے میں زیادہ حوالہ جات کی ضرورت ہی نہیں۔بلا ریب انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھے۔جب ان کی مدد نہ کر سکے تو ندامت کا اظہار بھی کیا۔ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کوفی لیڈروں میں حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ بن صرد خزاعی معروف صحابی ہیں۔ان کے اسی ''جرم'' کی بنا پر مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کے نام پر بھی ''رضی اللہ عنہ'' کی علامت مناسب

(1) الاصابہ (2) السیر (3) محدث: 14 (4) محدث: 16

نہیں سمجھی۔ یہ روش بہر نوع درست نہیں جس سے ناصبیت کی بو آتی ہے۔

③ انھی خط لکھنے والوں میں ایک جعدۃ بن ہبیرۃ بن ابی وہب ہے جیسا کہ "محدث"[1] میں ہے جبکہ یہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ زیارت حاصل ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاصابہ[2] میں بیان کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمن صاحب نے یہاں بھی "رضی اللہ عنہ" کی علامت مناسب نہیں سمجھی۔

مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں سلف کے موقف سے اہلِ علم واقف ہیں۔ سلف نے اس بارے میں گفتگو کی جو ممانعت کی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ اس سے احترام وتقدس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حرف آتا ہے اور ان کے بارے میں ناروا زبانیں کھل جاتی ہیں۔ افسوس کہ مضمون کے مذکورہ مقامات سے اسی کی بو آرہی ہے۔ اسی امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

مقام یزید بن معاویہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نظر میں

④ اسی عنوان کے تحت بحوالہ خطبات بخاری[3] لکھا گیا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ "یزید بن معاویہ سے روایت نہ لی جائے۔" امام احمد کا دین اور پرہیز گاری میں بڑا بلند مقام ہے اور روایات قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ بنابریں امام احمد رحمہ اللہ کی مسند کتاب سے یزید بن معاویہ کی روایت نقل کر دینا ہی یزید کی ثقاہت کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب الزہد میں یزید بن معاویہ کا قول نقل کیا ہے کہ یزید اپنے خطبہ میں کہا کرتا تھا (اس روایت کو قاضی ابوبکر ابن العربی نے اپنی مایہ ناز کتاب العواصم والقواصم میں بھی ذکر کیا ہے۔) "جب تم میں سے کوئی بیمار ہو کر قریب المرگ ہو جائے اور تندرست ہو جائے تو وہ غور کرے۔ جو افضل ترین عمل ہوں ان کو لازم پکڑے پھر اپنے کسی بدترین عمل کو دیکھے تو اسے چھوڑ دے..."

① محدث: 14 ② الاصابہ: 247,269/1 ③ خطبات بخاری: 385

یزید کا یہ قول نقل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یزید کا مقام امام احمد رحمہ اللہ کی نگاہ میں بلند تھا یہاں تک کہ اس کو آپ نے ان زاہد صحابہ اور تابعین میں شمار کیا ہے جن کے اقوال کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کے وعظ سے لوگ گناہ چھوڑتے ہیں۔''①

مجھے سمجھ نہیں آئی کہ امام احمد رحمہ اللہ کے قول کے لیے ''خطبات بخاری'' پر انحصار کیسے کر لیا گیا؟ جس بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ ''امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے...'' یہ بہر حال ''خطبات'' ہیں۔

واضح رہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کی طرف سے یہ ''منسوب'' ہی نہیں بلکہ امام ابو بکر الخلال رحمہ اللہ نے بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ «لا یذکر عنه حدیث» ② اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی میزان الاعتدال ③ میں ان کا یہی قول ذکر کیا ہے۔ اس لیے ان کا یہ قول محض ''منسوب'' نہیں ایک حقیقت ہے کہ واقعتاً امام احمد رحمہ اللہ کا یہ فرمان ہے۔

رہی یہ بات کہ ''امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں ان کا قول نقل کیا ہے...'' یہ عبارت العواصم من القواصم ④ میں حرف بحرف نقل کی گئی ہے اور العواصم کے عربی ایڈیشن ⑤ میں بھی یہ عبارت موجود ہے۔ مگر اس کے بعد امام ابن العربی رحمہ اللہ نے جو فرمایا، اسے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے نقل نہیں کیا بلکہ وہ شاید اس سے بے خبر ہیں۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

نعم وما أدخله إلافی جملة الصحابة قبل أن يخرج إلى ذكر التابعين.

جس کا ترجمہ مترجم ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجیے... ''ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے یزید کو صحابہ میں درج کیا ہے اور پھر اسی کے بعد تابعین کا تذکرہ کیا ہے۔''

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو ''العواصم'' کے حوالے سے یزید کی پاکدامنی اور اس کے زہد و تقویٰ کی دلیل بیان فرما رہے ہیں وہ ذرا امام ابن العربی رحمہ اللہ کے اس موقف کی طرف بھی

---

① محدث: 32 ② المنتخب من العلل للخلال: 237 (لابن قدامه) ③ میزان الاعتدال: 4/440 ④ العواصم و القواصم: 370 مترجم ⑤ العواصم: 233

توجہ دیں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے تو یزید کو صحابہ میں درج کیا ہے ہم تو اس پر إنا للہ وإنا إلیہ راجعون کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ عہدِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں پیدا ہونے والا یزید صحابہ میں! ایں چہ بوالعجبی است اور پھر اس قول کا انتساب امام احمد رحمہ اللہ کی طرف «ظلمات بعضھا فوق بعض» کا مصداق ہے۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ بلاشبہ بہت بڑے امام، فقیہ اور مفسر گزرے ہیں مگر تھے تو انسان ہی۔ یہ کہنے میں یقیناً ان سے سہو ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں یزید بن معاویہ بن ابی سفیان سمجھنے میں ان سے سہو ہوا۔

اولاً: ہمیں تو تتبع بسیار کے باوجود کتاب الزہد سے یزید بن معاویہ کا یہ قول نہیں ملا۔ البتہ امام عبداللہ بن مبارک نے کتاب الزہد[1] میں بروایت نعیم بن حماد یہی قول «أنا حنظلة بن أبي سفيان قال نا ابن أبي ملكية قال سمعت يزيد بن معاوية يقول في خطبته...الخ» نقل کیا ہے۔

ثانیا: یہاں یزید بن معاویہ سے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان نہیں بلکہ یزید بن معاویہ الکوفی النخعی مراد ہیں جو کہ تابعی تھے اور کوفہ کے عابدین وزاہدین میں ان کا شمار ہوتا تھا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے التہذیب[2] میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی کتاب الزہد[3] میں ان کے صاحبزادے عبداللہ کے زوائد میں اسی یزید بن معاویہ النخعی کا ایک اور قول بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں یزید بن معاویہ بن ابی سفیان مراد لینا بالکل اسی طرح امام ابن العربی رحمہ اللہ کا وہم ہے جیسا کہ یزید بن معاویہ کو صحابی کہنے اور یہ قول امام احمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرنے میں وہم ہوا۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ العواصم کے حاشیہ میں علامہ محب الدین الخطیب نے جابجا اپنی آرا کا اظہار کیا ہے، مگر وہ اس مقام پر امام ابن العربی رحمہ اللہ کی اس فروگزاشت پر خاموشی سے گزر گئے پھر اس کے تراجم وحواشی لکھنے والے حضرات نے بھی یہاں خاموشی ہی

---

[1] كتاب الزهد: 39 رقم: 156 [2] التهذيب: 11/360 [3] كتاب الزهد: 367

میں عافیت سمجھی۔ معلوم نہیں کیوں؟ یزید کی صفائی میں حقائق سے آنکھیں بند کر کے مکھی پہ مکھی مارنا کوئی تحقیقی اور علمی خدمت نہیں۔

ہمارا مقصد یہاں نہ یزید کا دفاع ہے نہ اس کے مثالب ومحامد پر بحث مطلوب ہے بلکہ زیرِ نظر مضمون میں امام احمد رحمہ اللہ کے حوالے سے یزید کے بارہ میں ایک بات ذکر ہوئی بس اس کی حقیقت بیان کرنا ہے...

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله العلي العظيم.

مقالات

ادارہ کی دیگر مطبوعات